بہ فیض حضور مفتی اعظم علامہ شاہ محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی نوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

دعوتی وفکری وعلمی مضامین ومقالات کا مجموعہ

مقالاتِ خطیب اعظم

از : خطیب اعظم علامہ قمرالزماں خان اعظمی
ترتیب : غلام مصطفیٰ رضوی

ناشر: رضا اکیڈمی
۵۲ ڈونٹاڈ اسٹریٹ، کھڑک، ممبئی ۴۰۰۰۰۹
Ph.: (022) 66342156 www.razaacademy.com

سلسلۂ اشاعت نمبر ۸۱۶

نام کتاب	:	مقالاتِ خطیب اعظم
تحریر	:	خطیب اعظم علامہ قمرالزماں خان اعظمی
ترتیب	:	غلام مصطفیٰ رضوی
حسب فرمائش	:	الحاج محمد سعید نوری
محرک	:	مولانا ابوزہرہ رضوی
کمپوزنگ وسیٹنگ	:	محمد زبیر قادری/غلام مصطفیٰ رضوی
صفحات	:	۲۷۲
اشاعت	:	۱۴۳۶ھ/۲۰۱۵ء
تعداد	:	۱۱۰۰
طابع	:	رضا آفسیٹ
ناشر	:	رضا اکیڈمی، ممبئی

ملنے کے پتے

[۱] رضا اکیڈمی، ۵۲ ڈونٹاڈ اسٹریٹ، کھڑک، ممبئی ۹
[۲] ورلڈ اسلامک مشن، مانچسٹر، انگلینڈ
[۳] نوری مشن، رضا لائبریری، نیا بس اسٹینڈ مالیگاؤں

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

عالمی سطح پر اشاعتِ دین کے حوالے سے خلیفۂ حضور مفتی اعظم خطیب اعظم علامہ قمرالزماں خان اعظمی رضوی کی ذات بڑی مشہور ومقبول ہے۔آپ کی خدمات کا دائرہ قریب نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے۔آپ نے بہت سے فتنوں کا بروقت جواب دیا۔رشدی کی فتنہ سامانیوں کے عنوان پر بروقت آواز اٹھائی۔ باطل فرقوں کے مقابل اہلِ سنت کی حقانیت کا برملا اظہار فرمایا۔اپنی خطابت کے ذریعے دین وسنیت کی اشاعت کا فریضہ تادمِ تحریر کامیابی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

خدمتِ دین کے لیے دُنیا کے اکثر ملکوں کا سفر کر چکے ہیں۔مشاہدات وتجربات کی روشنی میں فروغِ اہلِ سنت کے لیے تدبر وتفکر سے کام لیتے ہیں۔آپ کی ذات پر حضور مفتی اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان کا خصوصی فیضان ہے۔آپ کی خطابت کے معترف اکابر علماے عالم اسلام ہیں، بڑے بڑے ادبا وسخن داں آپ کی خطابت وفکر کا لوہا مانتے ہیں۔

علامہ قمرالزماں اعظمی کی بے لوث خدمات کے پیشِ نظر رضا اکیڈمی ممبئی نے ۲۳؍ اپریل ۲۰۱۱ءکو’’حضور مفتیِ اعظم ہند گولڈ میڈل ایوارڈ‘‘ سے نوازا۔اوراس موقع پر آپ کی حیات وخدمات اور کارہاے نمایاں کا ذکرِ جمیل بعنوان’’تجلیاتِ قمر‘‘ شائع کیا۔جس میں علما،مفکرین اور دانش وران کے مضامین وتاثرات شامل ہیں۔

علامہ موصوف کے مضامین ومقالات پر مشتمل کتاب’’مقالاتِ خطیب اعظم‘‘ کی اشاعت رضا اکیڈمی سے عمل میں آرہی ہے۔امید کہ رضا اکیڈمی کی اس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔اللہ کریم علامہ موصوف کے علم وعمل وعمر میں برکتیں عطا فرمائے۔علامہ موصوف کے توسط سے مسلک اعلیٰ حضرت کی اشاعت وخدمت کا دائرہ وسیع ہوتا رہے اور ہمیں مسلکِ اعلیٰ حضرت کی نشرواشاعت کا مزید ذوق وشوق عطا فرمائے۔آمین۔

اسیر مفتی اعظم محمد سعید نوری

زماں شناس

از: غلام مصطفیٰ رضوی

اسلام اپنی صداقت اور آفاقیت کے باعث مقبول و دل پذیر ہے۔گزری کئی صدیوں میں تمام مذاہب وادیان کا حملہ صرف اسلام پر رہا ہے۔ناموسِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں توہین وجسارت کے جتنے طوفان اُٹھے ان کا مقصد اسلام کے سیلِ رواں کو روکنا تھا۔ پروپیگنڈہ مہم، شرعی قوانین پر نکتہ چینی اور مستشرقین کی تنقیدات اسلام مخالف سازش کا حصہ ہیں۔ان کے سدِ باب کے لیے ہر دور میں مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کا وجودِ مسعود رہا ہے۔

خلیفۂ حضور مفتی اعظم خطیبِ اعظم مفکر اسلام علامہ قمرالزماں خان اعظمی رضوی دین متین کے مخلص داعی،اسلامی علوم کے ماہر اور نباضِ قوم ہیں۔آپ نے بڑی حکمت ودانش اور فہم وفراست کے ساتھ مغربی فتنوں سے نبرد آزمائی کی اور ہر اُٹھنے والے طوفان کا بروقت دنداں شکن جواب دے کر اسلام کے قصرِ رفیع کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔

جہدِ مسلسل: خطیب اعظم مفکر اسلام علامہ قمرالزماں اعظمی کی ولادت ۲۳؍مارچ ۱۹۴۶ءکو خالص پور اعظم گڑھ میں ہوئی۔ والد ماجد عبدالحمید عرف ناتواں خان پابندِ صوم وصلوٰۃ اور اخلاقی خوبیوں سے آراستہ تھے۔

ابتدائی علوم کے حصول کے بعد حضور حافظ ملت کی بارگاہ میں خصوصی تربیت سے نوازے گئے۔۱۹۶۸ء میں الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے فراغت حاصل کی۔ روحانی اعتبار سے حضور مفتی اعظم علامہ محمد مصطفیٰ رضا نوری بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان نے تربیت فرمائی۔۱۹۶۳ء میں حضور مفتی اعظم سے بیعت کی سعادت حاصل کی۔۱۹۷۷ء میں اسی بارگاہ سے خلافت واجازت بھی پائی۔دامنِ مفتی اعظم سے وابستگی کو اپنے لیے عظیم اعزاز

جانتے ہیں۔اوراس کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔

۱۹۷۴ء میں ورلڈ اسلامک مشن اور اسلامک مشنری کالج کے قیام کے بعد علامہ ارشدالقادری کی دعوت پر انگلینڈ تشریف لے گئے۔ فی الوقت ورلڈ اسلامک مشن کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے یورپ وامریکہ وافریقہ میں خدمتِ دینِ متین کا فریضہ مختلف جہتوں سے انجام دے رہے ہیں۔ درجنوں مساجد کا قیام عمل میں لا چکے ہیں۔ مساجد کی تعمیر کا یہ سلسلہ افریقہ ویورپ سے امریکہ وآسٹریلیا تک پھیلا ہوا ہے۔اس سلسلے میں علامہ شاہ احمد نورانی اور علامہ ارشدالقادری کی تنظیمی وفکری صلاحیتوں کا خصوصی حصہ رہا ہے۔

آپ کی کاوشات کا ایک ثمر الجامعۃ الاسلامیہ روناہی ، یوپی ہے، جس کے آپ بانی ہیں۔ یہ دانش گاہ اہلِ سنت کے نمایاں اداروں میں شامل ہے۔جس کی نظامت قاری جلال الدین قادری انجام دے رہے ہیں۔

ورلڈ اسلامک مشن کے ذریعے درجنوں کانفرنسیں منعقد ہوچکی ہیں۔جن میں اہم معاملات ومسائل کے تصفیے کے لیے تجاویز اور فیصلے لیے گئے۔مشن نے فرانس، جرمنی، ناروے، امریکہ، ڈنمارک، ہالینڈ، آسٹریلیا میں تعمیری وتحریکی کاوشیں کی ہیں۔مشن کے ذریعے منعقدہ کانفرنسوں میں پیش کی جانے والی قراردادوں سے علامہ موصوف کی حکمت ودانش اور فکرِ رسا کا اندازا ہوتا ہے۔

آپ اسلام پر اُٹھنے والے حملوں کا بروقت جواب دیتے ہیں، یہودیت و عیسائیت، قادیانیت ووہابیت سمیت داخلی وخارجی فتنوں کے علمی ومسکت جواب کے لیے آپ کی کدوکاوش لائقِ تحسین ہے۔خود فرماتے ہیں:

”مانچسٹر اور لیسٹر کے اسلامی مراکز میں اکثر یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ چرچوں [کلیساؤں] کے رہ نما، عیسائیت کے مبلغین، مشرقیات کے محققین اور مذاہب پر ری سرچ کرنے والے حاضر ہوتے ہیں اور اکثر اپنے سوالات کے معقول جواب پا کر مطمئن واپس جاتے ہیں۔“[تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء، ص۲۳]

برطانیہ میں ابتداءً سعودی لابی نے ورلڈ اسلامک مشن کے قیام کی شدید مخالفت کی اور خالد محمود نے ”احمد رضا خاں کا تعارف“ کے عنوان سے برطانیہ کے مرکزی شہروں میں جلسے کیے اور اس بات کی کوشش کی کہ علماے اہلِ سنت کے قدم جمنے سے پہلے ہی برطانیہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ کردی جائے۔ اس کے جواب میں علامہ ارشدالقادری کی سرپرستی میں تمام شہروں میں جلسے کیے گئے۔ ان کے عقائد پر مشتمل پوسٹرس نکالے گئے، مناظروں کا چیلنج کیا گیا، نتیجۃً مخالف قوتیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔ اور ان تمام مساجد سے ان کا اخراج عمل میں لایا گیا جہاں وہ سُنی بن کر اہلِ سنت کو مبتلاے فریب کیے ہوئے تھے۔“[تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء، ص۲۴]

خطابت کی خوبیاں: علامہ اعظمی کی اصل شناخت میدانِ خطابت سے ہے۔ آپ کی خطابت ایسی نہیں کہ چند گھنٹے تقریر کی، سامعین نے حظ اُٹھایا اور بات ختم۔ بلکہ فکری گہرائی و گیرائی خطابت سے عیاں ہوتی ہے۔ فکر کی ترسیل اور عزائم کی تعمیر ان کی خطابت کا اہم وصف ہے۔ کم ہی تقریریں ایسی ہوتی ہیں جو انقلاب وتحریک پیدا کریں۔ آپ کی خطابت ایسی ہی ہے۔ لب ولہجہ بڑا پُرعزم ہوتا ہے، فکر متوازن ومستقیم، وسیع مطالعہ، گہرا مشاہدہ اور مستقبل پر نظر رکھ کر حال کی تعمیر کرنے والی خطابت آپ کے ذاتی اوصاف ہیں۔

اُترتی ہیں بہاریں جب ترے رُخ پر تبسم ہو　　لبوں سے پھول جھڑتے ہیں جو تو محوِ تکلّم ہو
تری شیرینیِ گفتار کا شیدا چمن سارا　　تجھے جو سُن سکے تیرا بنے وہ تجھ میں ہی گم ہو

خطابت کی خوبیوں سے متعلق علامہ بدرالقادری [ہالینڈ] لکھتے ہیں: ”زبان اردو جہاں جہاں تک ہے علامہ اعظمی کے خطبات کی گونج وہاں وہاں تک ہے۔ علامہ اعظمی خطبات وتقاریر کی دُنیا میں نئے اسلوب وآہنگ کی بنیاد ڈالنے والے ہیں۔“

[تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء، ص۳۲]

علامہ موصوف متعدد تحریکوں، تنظیموں، اداروں اور سوسائٹیوں کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ آزاد میدان ممبئی کے سنی اجتماع سے آپ نے جو دعوتی خطابات ارشاد فرمائے

ان کی افادیت مسلّم ہے۔

شعر وادب سے بھی خاصا ذوق ہے، شعر کہتے بھی ہیں اور موقع محل کی مناسبت سے برتتے بھی ہیں۔ دورانِ خطابت برجستہ و چست اشعار بڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ خیابانِ مدحت کے نام سے ایک مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔ اشعار میں سوزِ دروں ہے، سنجیدگی ومتانت اور فکر وشعور کی بلندی جلوہ گر ہے۔

چند تاثرات:

[۱] مولانا قمر الحسن بستوی [امریکہ] لکھتے ہیں: ''آپ نے امریکہ میں اہلِ سنت کے خدوخال کو نمایاں کیا اور اسلافِ کبار کے ان معمولات ونظریات کی آئینہ بندی کی جس کی ایک پژمردہ قوم کو ضرورت ہوتی ہے۔''

[تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء، ص ۵۵۔۵۶]

[۲] مولانا فروغ القادری [یوکے] علامہ ارشد القادری کا یہ قول لکھتے ہیں:

''علامہ قمر الزماں اعظمی نے جس جرأت وہمت، جذب وایثار اور کمالِ اخلاص کے ساتھ ورلڈ اسلامک مشن کے کام کو پورے مغربی ممالک میں پھیلایا اس کے لیے وہ ہم سب کی دُعاؤں کے مستحق ہیں۔'' [تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء، ص ۶۳]

[۳] احقاقِ حق وابطالِ باطل اور مسلک اعلیٰ حضرت پر استقامت کے سلسلے میں ابوزہرہ رضوی لکھتے ہیں: ''یہاں برطانیہ میں رمضان اور عیدین کے موقع پر رویتِ ہلال کا مسئلہ بڑا بے چیدہ بنا ہوا ہے۔ دیابنہ اور غیر مقلدین تو کتاب وسنت سے صریح انحراف کرتے ہوئے اپنے سعودی آقاؤں کی اقتدا و پیروی ہی پر مُصر رہتے ہیں۔ بعض اوقات خود اہلِ سنت کے بعض طبقے ان کے جھانسے میں آکر اپنی عید اور روزے خراب کرتے ہیں، مگر ۳۵ رسال کے اس پورے عرصے میں جس شخص نے پوری جرأت وہمت کے ساتھ احکامِ شرعیہ پر پورا پورا عمل کیا ہے، وہ علامہ اعظمی کی ذات ہے۔''

[تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۹]۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

[۴] مفتی ولی محمد رضوی فرماتے ہیں: ''حضرت علامہ قمر الزماں صاحب قبلہ اعظمی کی ذاتِ گرامی اپنی خطابت کی گوناگوں خوبیوں سے ممتاز ومنفرد ہے۔ موصوف کو خدائے قدیر نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اس فن میں مہارتِ خاص عطا فرمائی ہے۔'' [تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء، ص ۳۱۹]

[۵] مفتی معراج القادری مصباحی لکھتے ہیں: ''علامہ اپنے کردار وعمل، موثر اصلاحی اور معلوماتی خطاب، علمی تعمیری کارناموں کی بنیاد پر آج اہلِ سنت وجماعت کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ جماعتی سطح پر آپ کا ایک وزن محسوس کیا جاتا ہے۔ سنجیدہ فکر اور تعمیری اصلاحی مزاج رکھتے ہیں۔'' [تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء، ص ۳۲۲]

[۶] ڈاکٹر محبّ الحق قادری لکھتے ہیں: ''مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں طلبہ کی طرف سے سیرتِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسے ہوا کرتے ہیں۔ غالباً محسن الملک ہال میں جلسہ تھا۔ اسی میں علامہ کی شان دار تقریر ہوئی۔ طلبہ تو طلبہ پروفیسر، لیکچرار حضرات بھی محوِ حیرت اور داد دیے بغیر نہیں رہ سکے۔'' [تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء، ص ۳۲۹]

[۷] محمد میاں مالیگ [یوکے] لکھتے ہیں: ''راقم الحروف اس بات پر جتنا بھی شکر کرے کم ہے کہ ہمارے خاندان کے دو عالمِ دین - عزیزم ابوزہرہ رضوی اور مولانا محمد ارشد مصباحی - علامہ اعظمی کے شاگردوں میں شامل ہیں۔''

[تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء، ص ۳۳۶]

[۸] ڈاکٹر توفیق انصاری [شکاگو امریکہ] لکھتے ہیں: ''امریکہ میں علمائے کرام کی آمد کا ابتدائی دور کوئی ۱۵ رسال پر محیط ہے۔ جس میں علمائے نامی گرامی نے اپنے اپنے انداز پر دین کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا مگر اس سلسلے میں ایک نام جو واضح طور پر دل و

دماغ میں روزِ روشن کی طرح موجود ہے وہ نام حضرت علامہ قمرالزماں خاں اعظمی مدظلہ العالی کا ہے۔'' [تجلیاتِ قمر، رضا اکیڈمی ممبئی ۲۰۱۱ء،ص ۳۷۰]

مقالاتِ خطیبِ اعظم سے متعلق: پیشِ نظر کتاب ''مقالاتِ خطیبِ اعظم'' علامہ قمرالزماں اعظمی کے مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے۔ جس میں بعض تحریریں ماہ نامہ حجاز یوکے میں بطورِ اداریہ شائع ہوئیں۔اسی طرح برصغیر کے بعض رسائل میں بھی ان کی اشاعت ہوئی۔ان تحریروں کووقت وحالات کے تناظر میں شائع کیا گیا تھا،جن کی اشاعت آج بھی مفید ہے اور ماضی کے حالات کوسمجھنے میں معاون بھی۔

ان میں آپ علامہ اعظمی کے دل کی دھڑکن،مخلصانہ جذبات کی لطافت اورقوم کے لیے تعمیری فکر و خیال کی دستک محسوس کریں گے۔بعض تحریریں یورپی ممالک میں مسلمانوں کودرپیش حالات کے تناظر میں لکھی گئی ہیں،جن میں مسلمانوں کی مذہب سے گہری وابستگی اوراسلامی علوم کےحصول کے لیے درسِ عمل فراہم کیا ہے۔

ناموسِ رسالت پر مسلسل حملے ہورہے ہیں، داخلی وخارجی حملوں کے پسِ پردہ اسلام مخالف قوتوں کے کردار کوسمجھنے کے لیے رشدی و دی میسیج فلم سے متعلق جومعرکہ آرا تحریریں ہیں وہ اس طرح کی جرأت وجسارت کے سدِ باب کے لیے معاون ورہنما ہیں۔سخت حالات میں بروقت فیصلے کی صلاحیت اور دوراندیشی کے ساتھ حالات کی بخیہ گیری علامہ اعظمی کی فکر کا اہم پہلو ہے۔نیز یورپ میں مسلمانوں کی نسلِ نو کے مستقبل سے متعلق تحریرات حکمت وبصیرت کی آئینہ دار ہیں۔

مضامین چوں کہ مختلف وقتوں میں لکھے گئے ہیں، اس لیے انھیں حالات کے تناظر میں ان کا مطالعہ کریں۔ان میں اسلام کی حقانیت،آفاقی تعلیمات،عقائد،اعمال، اسلامی تعلیمات،عالمی حالات،مخالفین کےاہداف اوراس کی تردید کے لیےلائحۂ عمل،تحقیق، تنقید،تنظیم،تحریک،مشاہدہ،عزم،حوصلہ،غرض کہ ہمہ جہت پہلوؤں کااحاطہ کیا گیا ہے۔

علامہ موصوف بنیادی طور پر خطیب ہیں اس لیے تحریر میں خطابی انداز غالب

ہے۔دقیق مسائل کوآسان لفظوں میں سمجھا دینا آپ کا وصف ہے،نکتہ سنجی بھی ہے،اسلوب کا بانک پن بھی،اردوکونئی تراکیب بھی دیتے ہیں،اورلفظوں کےلعل وجواہر بھی،آپ کے یہاں مضامین کا انبار بھی ہے،موضوعات کا تنوع بھی اورالفاظ کا ذخیرہ بھی۔سلاستِ زبان وبیان کا یہ حال ہے کہ اہلِ زبان سر دُھنتے ہیں اوراد باداد دیےبغیر نہیں رہ سکتے۔منطقی وعلمی استدلال سطر سطر سے ظاہر ہے۔زماں شناسی کا پہلوخطابت وتحریروفکر ہرایک کالازمہ ہے۔

علامہ اعظمی کی دریافت تحریروں کواس کتاب کے اندرجمع کیا گیا ہے۔مزید مضامین ومقالات کےحصول کے بعدانھیں بھی منظرعام پرلایا جائے گا۔ازیں قبل علامہ اعظمی کےخطبات بنام''خطباتِ مفکراسلام'' دوجلدوں میں سنی دعوتِ اسلامی ممبئی وحیدرآباد سےشائع ہوچکے ہیں۔رضا اکیڈمی ممبئی نے''تجلیاتِ قمر'' کےعنوان سےآپ کی خدمات پر تاثرات ومضامین کا مجموعہ ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔

اللہ کریم علامہ موصوف کوعمرِ طویل عطافرمائے اورآپ کے ذریعے دین وسنیت و مسلکِ اعلیٰ حضرت کی اشاعت وترویج کا مرحلۂ شوق طے ہوتا رہے،مغرب کی وادیوں میں آپ کی اذانِ سحر گونجتی رہےاوردلوں کی دُنیامیں نور پھیلتا رہے۔محبتوں کی سوغات تقسیم ہوتی رہےاورعقیدتوں کے چراغ دلوں کےطاق پرروشن رہیں۔

آمین بجاہ سیدالمرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

غلام مصطفیٰ رضوی

۲۶؍رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ/۱۴؍جولائی ۲۰۱۵ء بروزمنگل

☆☆☆

Cell. 09325028586, gmrazvi92@gmail.com

باب اول

فطری سچائی

اسلام اور دیگر مذاہبِ عالَم

اسلام کا دوسرے مذاہب سے موازنہ کرنے کی صورت میں اُن عناصر کا ایک سرسری خاکہ ضرور پیش کرنا پڑے گا جن پر مذاہبِ عالم کی بنیاد رکھی گئی ہے، جو مذاہب کے تنظیمی نقشوں میں اساس کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کے بغیر کوئی مذہب- مذہب اور کوئی نظام- نظام کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

وہ عناصر مندرجہ ذیل ہیں:

[۱] نظامِ عقائد [۲] نظامِ عبادت [۳] نظامِ اخلاق

اسلام اور اس کے علاوہ دنیا کے تمام مذاہب خواہ وہ مُنَزَّل مِن اللّٰہ ہوں اور بعد میں تحریف وتبدیل کی نذر ہو گئے ہوں یا چند انسانوں کی مشترک اختراعِ فکر کا نتیجہ ہوں، ان کی بنیاد کچھ معقول دلائل کے اوپر ہو یا وہ اَوہام وخرافات نیز اساطیر الاوّلین کا مجموعہ ہوں۔ مندرجہ بالا تین اساسی قدروں کا دعویٰ ہر ایک میں ملے گا۔ اِس لیے مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان عناصرِ ثلٰثہ کا غیر جانب دارانہ تجزیہ کیا جائے۔ آیے! سب سے پہلے ہم دنیا کے مشہور مذاہب کے نظامِ عقائد کا جائزہ لیں اس معذرت کے ساتھ کہ اِس مختصر سے مقالے میں عقائد کی تمام جزئیات کا استقصا نہ ہو سکے گا، البتہ ان میں صرف عقیدۂ الٰہ اور عقیدۂ رسالت پر گفتگو ہو سکے گی۔

عقیدۂ اِلٰہ: دنیا میں اپنے اِتّباع کی کثرت، اپنے مِشنوں کی حرکت اور بلند وبانگ دعوؤں کی وجہ سے مذہبِ مسیحیت اِس وقت پورے کرۂ ارض کے اوپر چھایا ہوا ہے لیکن جب ہم اس کی مادّی دل فریبیوں سے قطع نظر اس کے ایمانی، اخلاقی اور عبادتی اقدار کا جائزہ لیتے ہیں تو انتہائی حیرت ہوتی ہے کہ اِس قدر کم زور اور ضعیف بنیادوں پر قائم ہونے والا مذہب اِس قدر مقبول کیوں ہے! پھر ہمیں بے ساختہ اِس دور میں پروپیگنڈے اور اشاعتی اِداروں کی اہمیت کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جب تک دنیا کا ہر فرد اِس قدر بالغ نظر نہ ہو جائے کہ وہ

مذاہب کا تقابلی مطالعہ کر کے اپنے لیے ایک مَوزوں اور مناسب راستہ، دوسرے لفظوں میں -صراطِ مستقیم- اختیار کر سکے اس وقت تک لوگ پروپیگنڈوں پر ایمان لاتے رہیں گے۔

ہم یقیناً اُس اسلام کے اوپر ایمان لائے ہیں جسے لے کر حضرت عیسٰی علیہ السّلام جلوہ گر ہوئے تھے، جس کے متعلق نجاشی شہنشاہِ حبشہ نے کہا تھا کہ یہ دونوں مذاہب تو ایک ہی نورِ مطلق کے دو جلوے ہیں......لیکن مسیحیت کا موجودہ تصوّرِ الٰہ کس قدر لرزا دینے والا، کس قدر غیر معقول اور نا قابلِ یقین ہے، وہ اس عقیدے کی مشہور اصطلاح **التثلیث فی الوحدة والوحدة فی التثلیث** سے ظاہر ہے۔ یہ وہ اصطلاح ہے جس پر پورے عیسائی ازم کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ ایک تین اور تین ایک کی غیر معقول ریاضی تقسیم اور وحدت کو کون قبول کر سکے گا؟ اِس اصطلاح کا مفہوم مسیحی کتبِ عقائد میں یہ پیش کیا گیا ہے، حضرت عیسٰی، روح القدس اور مریم علیہا السّلام سے قطع نظر صرف حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے بارے میں مزعومہ الوہیت کا ہم جائزہ لیں۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو بندوں کے گناہوں کی جزا کے طور پر سولی دے دی گئی تا کہ وہ خود سولی پر چڑھ کر اپنے اُمّتیوں کے لیے کفّارہ بن جائیں۔ اوّل تو یہ بات کس قدر عجیب سی لگتی ہے کہ گناہ اُمّتی کر رہے ہیں اور کفّارے کے طور پر سولی رسول کو دی جا رہی ہے! دوسرے یہ کہ اگر حضرت عیسٰی علیہ السّلام خود الٰہ تھے تو پھر کیوں کر وہی منتقِم ہوئے اور وہی منتَقم بن گئے؟ اُنہیں کے حکم پر سولی لٹکائی گئی اور خود ہی اپنی مرضی پر قربان ہو گئے! اور پھر جو سولی پر چڑھ جائے اور تختۂ دار پر انتہائی اضطراب کے عالم میں دَم توڑ دے، کیا وہ خدا ہو سکتا ہے؟ پھر عبرانی کے تمام نوشتوں میں یہ بات متفق علیہ طور پر درج ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے وقتِ صلیب یہ ارشاد فرمایا تھا: اے میرے خدا، اے میرے خدا۔ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔

اگر وہ خدا تھے تو کس خدا کو آواز دے رہے تھے؟ الوہیت کی جو صفت ان کی ذات کا لازمہ تھی، وہ اُن سے جُدا کیوں کر ہو گئی؟ دراصل اسلام کے علاوہ تمام مذاہبِ عالم میں

شرک فی الالوهیة ہی ایک مشترک جُرم ہے جو نا قابلِ معافی ہے۔ عیسائیت کی طرح یہودیت بھی **ابوة الٰه** کی قائل ہے۔ چنانچہ یہودی حضرت عزیر علیہ السّلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ ہندومت میں ہر اَوتار درجۂ الوہیت پر فائز سمجھا جاتا ہے۔

العیاذ باللّٰه !......اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام کے علاوہ تمام مذاہبِ عالم کا تصوّرِ الٰہ بدیہی البطلان ہے کیوں کہ الٰہ واحد کے مقابلے میں متعدد الٰہ کا تصوّر خود عقیدۂ الٰہ کے منافی ہے، اِس لیے کہ متعدد الٰہ ممکن ہی نہیں۔ قرآنِ عظیم نے بہت واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا [الانبیآء: آیت ۲۲]

کائنات کا نظام متعدد خداؤں کے ذریعے نہیں چل سکتا۔

غالباً اِسی تصوّر کو ایک مغربی مفکر نے بہت واضح طور پر پیش کیا ہے:

''کوئی شخص دو آقاؤں کی بندگی نہیں کر سکتا ہے۔''

اسلام کا عقیدۂ الٰہ: تمام مذاہبِ عالم کے مقابلے میں اسلام نے عقیدۂ الٰہ کو بہت واضح طور پر پیش فرمایا ہے۔ اِس طور پر کہ ذاتِ پاک تعالیٰ شانہٗ کی تمام صفات کا تصوّر کر ڈالیے؛ کہیں بھی آپ کی عقل، آپ کا ذہن یہ نہ کہے گا کہ یہ صفت شانِ الوہیت کے منافی ہے، بلکہ ہر صفت کے حقائق و معارف کے انکشاف کے بعد ہر صاحبِ شعور بے ساختہ پکار اُٹھے گا کہ بے شک یہ صفت صفتِ الٰہ ہی ہے۔ اسلام کے عقیدۂ الٰہ میں **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ٥ اَللّٰهُ الصَّمَدُ** کے اثباتی انداز کے بعد **لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ٥** کا منفی طریقۂ تفہیم شانِ الوہیت کس قدر پیارا، کس قدر عقل و فکر سے قریب تر ہے! اسلام نے نہ صرف ذاتِ الٰہ میں ممکنات کی شرکت کا اِنکار کیا ہے، بلکہ واضح طور پر یہ اعلان فرمایا ہے کہ وَلَا ضِدَّ لَهٗ وَلَا نِدَّلَهٗ وَلَا شَبِيهَهٗ وَلَا مَثِيْلَ لَهٗ.

جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ صفات میں بھی شرکت ناممکن ہے۔ تجسیم وغیرہ کا انکار فرما کر عقیدۂ الٰہ کی بلند ترین حیثیت پیش فرما دی ہے۔ ایک مغربی مستشرق نے غالباً اِسی

حقیقت کا اعتراف اپنے اِن جملوں میں کیا ہے:

''قرآن کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس نے عقیدۂ الٰہ کو مرئی اور مُجسّم نہ پیش فرما کر ہمیشہ کے لیے ذلیل ہونے سے بچالیا۔''

حقیقت یہ ہے کہ تمثیل وتجسیم وغیرہ ہی حقیقت الٰہ پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور انسان الٰہ تک پہنچنے کے بجائے مظاہر میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ نقوشِ راہ کو منزلِ معرفت تصوّر کر لیتا ہے۔ عقیدۂ الٰہ کا اثر انسان کی پوری زندگی پر پڑتا ہے۔ بالخصوص وہ نظام تو براہِ راست متاثر ہوتا ہے جو اس عقیدے سے تشکیل پاتا ہے۔ وہ معاشرہ جس کی تعمیر عقیدۂ الٰہ کے تحت ہوتی ہے اُس کا ہر ہر گوشہ اس عقیدے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کذبِ باری تعالیٰ کو ممکن مان لیا جائے تو اسلامی نظامِ حیات کی دیواریں متزلزل ہو جائیں گی، بلکہ اسلامی قوانین کا قصرِ رفیع فرشِ زمیں پر ڈھیر ہو جائے گا۔ اِس لیے کہ یہ امکانِ کذب نہ معلوم کتنے نقائص کے اِمکانات اپنے دامن میں لیے ہوئے اُبھرے گا۔ یہاں تک کہ مسلم پرسنل لا میں جس کو خالص الٰہی قانون کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے، وہ خود منزل اِمکان میں ممکن التغیّر والتبدّل قرار پائے گا، کیوں کہ ممکن ہے کہ کسی قانون کے ارشاد کے وقت امکانِ کذب دائرۂ امکان سے صرف ایک قدم آگے بڑھ کر وقوع پذیر ہو گیا ہو...... **العیاذ باللّٰہ**۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام قومیں جو خدائے واحد کے مقابلے میں بے شمار خداؤں کی پرستش کرتی ہیں، جن کی پیشانیاں بے شمار بارگاہوں میں خراجِ سجدہ پیش کرنے کے لیے جھکی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے تمام مسائل میں انتہائی مضطرب اور بے قرار نظر آتی ہیں، ایک سَر ہے اور ہزاروں موہوم مراکزِ سجدہ سجدے طلب کررہے ہیں۔ بے چارہ کہاں کہاں اپنی پیشانی جھکائے اور اپنے کم زور سے وجود کے اوپر کس کس کی حاکمیتِ مطلقہ مسلّط کرے۔ غالبًا یہی وہ مصلحت تھی جس کے پیشِ نظر قرآنِ حکیم نے بے شمار مقامات پر عقیدۂ توحید کو بہت واضح طور پر پیش فرما کر بار بار مختلف اسالیبِ بیان کے ساتھ ساتھ ذہنوں میں اُتارا ہے کہ کہیں سے یہ مقدّس عقیدہ مجروح نہ ہونے پائے، ورنہ انسان گم

راہی کے ورطۂ دیجور سے نِکل کر ہدایت کے ساحلِ نور تک کبھی رسائی حاصل نہ کر سکے گا۔

مندرجۂ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام کے علاوہ تمام مذاہبِ عالَم کے یہاں عقیدۂ الٰہ تصدیقِ عقیدہ کی صراحت لیے ہوئے نہیں، بلکہ تصوّرِ محض کا اِبہام لیے ہوئے ملتا ہے۔ اِس لیے کہ ان کے یہاں الٰہ کا صرف تصوّر رہے جسے -تصوّرِ الٰہ- سے تعبیر کرتے ہیں اور اسلام میں الٰہ ایک حقیقت ہے، ایک عقیدہ ہے، اور یہ ایک اَمرِ مسلّم ہے کہ تصوّر زندگی نہیں دیتا، بلکہ زندگی صرف عقیدے سے مِلا کرتی ہے جو انسان کی پوری زندگی پر چھا جاتا ہے اور انسان اپنی زندگی کا ہر قدم الٰہ واحد کو شہید و بصیر یقین کرتے ہوئے اُٹھاتا ہے۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی بنیاد کا جب یہ عالَم ہے تو اِس بنیاد پر جس معاشرے کی عمارت تعمیر کی جائے اُس کا کیا عالَم ہوگا؟

عقیدۂ رسالت: اسلام کے علاوہ دوسرے اَدیان و مذاہب میں رسالت کا جو تصوّر ہے وہ تصوّرِ الٰہ کی طرح ہی سے ناقص، نامکمّل، مائل بہ ابتذال، غیر مؤثر اور منصبِ رسالت سے فروتر ہے، اِس لیے کہ -رسالت- جس مہتم بالشان منصب کا نام ہے اس کے حامل کی حیثیت خواہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو مگر مذاہبِ قدیمہ کے ارباب نے ان کو اس طور پر پیش کیا ہے کہ ان کی حیثیت ایک عام مُصلح اور ایک عام قائد سے آگے نہیں بڑھتی۔ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی تمام تحریروں کا مطالعہ کیجیے تو یہ کھل کر سامنے آجائے گا کہ مجرمینِ تحریف نے انبیا کی زندگی کو تضاد کا حامل بنا کر پیش کیا ہے۔ ایک طرف انبیاے کرام میں سے بعض افراد کو وہ خدا کا بیٹا اور الٰہ تصوّر کرتے ہیں تو دوسرے انبیا و رُسل کو نبی مان کر بھی انہیں لائقِ گردن زدنی، لائقِ صلیب ودار، باغی و مجرم وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہود کی تاریخ کو اُٹھا کر دیکھیے؛ نہ معلوم کتنے انبیاے کرام کے خونِ ناحق سے ان کے ہاتھ آپ کو رنگے ہوئے نظر آئیں گے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جن انبیا و رُسل کے قوانین کو وہ معیار مانتے ہیں، خود اُن کو گناہ گار، خطا شعار اور مجرم ثابت کرنے میں بڑے جری واقع ہوئے ہیں اور ان کی بے باکیاں اِس قدر بڑھ گئی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السّلام

جوابُو الانبیاء ہیں اور جن کی ذاتِ پاک کے بارے میں تمام مذاہب جو منزَّل من اللّٰہ ہیں یا ہونے کے دعوے دار ہیں، متحد القول ہیں کہ وہ جلیل القدر پیغمبر تھے، مگر ان کی نبوت کا اقرار کرتے ہوئے بھی یہود و نصاریٰ ان کو مجرم و خاطی تصوّر کرتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السّلام کی ذاتِ پاک سے منسوب کر کے انہوں نے یہ عقیدہ وضع کرلیا ہے کہ ہر انسان پیدائشی گناہ گار ہے۔ اِس لیے کہ حضرت آدم علیہ السّلام نے گناہ کیا تھا اور ان کے گناہ کے نتیجے میں ان کی اولاد فطرۃً اور خلقۃً گناہ گار ہے۔

کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ مصلحتِ ایزدی کی بنیاد پر حضرت آدم علیہ السّلام سے سرزد ہونے والے فعل کو وہ گناہ کہتے ہیں۔ غور فرمائیں کہ گناہ کے نتیجے میں ہمیشہ تباہیاں اور بربادیاں ہوتی ہیں، شہر ویران ہوجاتے ہیں، آبادیاں اُجڑ جاتی ہیں، چہرے بدل جاتے ہیں، صورتیں مسخ ہوجاتی ہیں، پتھر برسائے جاتے ہیں، آگ اور خون کی بارش ہوتی ہے، زمین اُلٹ دی جاتی ہے..... مگر ابوالبشر حضرت آدم علیہ السّلام کا یہ کیسا گناہ ہے کہ جس کے نتیجے میں آبادیاں بڑھتی ہیں، ویرانے ختم ہوجاتے ہیں، زندگی سنورتی ہے، ابنائے آدم خلافتِ ارض کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات بنا، لقد کرّمنا بنی اٰدم کے تاجِ کرامت سے نوازا گیا۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ [التین: آیت ۴] کے مظاہرِ حُسن جلوہ گر ہوئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی نسلِ پاک سے سیّد المعصومین حاصلِ تخلیقِ کائنات شاہ کارِ عالَمِ ایجاد و سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ گر ہوئے۔ کیا یہ ساری عظمتیں اور سَر بلندیاں انسان کو حضرت آدم کے مفروضہ گناہ کے ثمرے میں ملیں؟ عیاذاً باللّٰہ!

اِس عقیدے کی ایک دردناک تصویر یہ ہے کہ انہوں نے انسان کو پیدائشی مجرم قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ انسان مایوس ہوگیا اور اس یاس کے نتیجے میں جب گناہ بڑھے اور انسان نے یہ سوچنا شروع کردیا کہ ہم پیدائشی مجرم ہیں، جب ہمارے جُرم کی وجہ سے لذّتِ فرداہم کو ملنے والی نہیں ہے تو لذّتِ امروز سے دامن کشی نادانی ہوگی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ انسانوں نے اللہ کی زمین کو گناہ سے بھر دیا، تو عیسائیوں نے اور اَربابِ کلیسا نے فوراً عقیدۂ کفّارہ کو جنم

دیا، یعنی انسان پیدائشی مجرم تو ہے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے صلیب و دار قبول فرما کر تمام انسانوں کے گناہ بخشوا دیے۔ بس کیا تھا وہاں مایوسی نے انہیں بحرِ عصیاں میں غوطہ زنی پر مجبور کیا تھا، اور یہاں نجات کے یقین نے انہیں گناہوں میں ڈبو دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تمام لوگوں کے گناہوں کا کفّارہ بن چکے ہیں، تو پھر گناہ کیوں نہ کیے جائیں۔

ایک اور زاویۂ نگاہ سے غور کریں تو یہ بات اور زیادہ واضح ہوجائے گی کہ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اپنے انبیا کے مقدّس منصب کی توہین کی، بلکہ انہوں نے ان کے مشن، ان کی تحریک اور ان کے اخلاقِ حسنہ پر تحریف و تبدیل کے پردے ڈال دیے۔

مشہور مستشرق پروفیسر رینان لکھتا ہے: حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی حیاتِ گرامی زمانے کے قلب میں اِس طرح پوشیدہ ہوگئی ہے کہ ان کی حیات کے بعد زمانے کی زبان ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکی۔ ایک ایسا جلیل القدر پیغمبر جس کی زندگی کو پوری حیاتِ انسانی کے لیے دستورِ حیات مانتے ہیں۔ ان کے متعلق انہیں صرف اِتنا معلوم ہے کہ وہ بِن باپ کے پیدا ہوئے۔ گہوارے میں کلام فرمایا۔ ۱۲؍ برس کی عمر شریف تک لوگوں کے سامنے مختلف معجزات بالخصوص احیائے موتی و اشفائے مکموہ و مبروص وغیرہ سے متعلق پیش کرتے رہے۔ جب لوگوں کو ان کی نبوّت کا یقین ہوگیا تو وہ غائب ہوگئے۔ ۳۲؍ سال کی عمر میں دوبارہ ظاہر ہوئے۔ یہودیوں نے شدید اختلاف کیا۔ ایک سمندر کے کنارے کچھ مچھیروں اور چرواہوں کو وعظ فرمایا اور پھر انہیں صلیب دے دی گئی۔

کیا صرف اتنی ہی زندگی سے مہد سے لے کر لحد تک کے لیے کوئی دستورِ حیات تیار ہوسکتا ہے؟ اگر کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی زندگی سے معاشرتی مسائل اخذ کرنا چاہے، سلطنت و حکومت کے قوانین طلب کرے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے متعلق سوال کرے، قانونِ ازدواج و پرورشِ اولاد و حقوقِ والدین وغیرہ کے متعلق پوچھے تو ان کی موجودہ مشہور زندگی میں ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔

یہ تو اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا احسانِ عظیم ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو

پیغمبراور وَجِیۡهًا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ [آلِ عمران: آیت ۴۵] قرار دے کر عیسائیت کی آبرو رکھ لی ورنہ آج عیسائیوں کو یہ بھی ثابت کرنا دشوار ہو جاتا کہ حضرت عیسٰی نام کی کوئی تاریخی شخصیت بھی کبھی جلوہ گر ہوئی تھی۔ غالبًا اِسی بات کی طرف حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے اپنے آخری خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

''دنیا نے اپنے سردار کے پہچاننے میں غلطی کی ہے، جب وہ روح الحق فارقلیط [احمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم] جلوہ گر ہوگا تو میری صحیح حیثیت کو دنیا کے سامنے پیش کرے گا۔''

تقریباً یہی حال دُنیا کے دوسرے مذاہب کا بھی ہے۔ قرآنِ عظیم کا مطالعہ کریں تو یہود کا بھی حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہ آئے گا۔ ہنود وغیرہ کے یہاں جو اَوتار وغیرہ کا عقیدہ ہے وہ تو اربابِ فہم کے نزدیک بدیہی البطلان ہے، ان پر گفتگو کرنا تضیعِ اوقات کے مترادف ہوگا۔

لیکن یہاں آ کر ہمیں -اسلام کی حقّانیت- کے اعتراف پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اِس لیے کہ اس نے جو عقیدۂ رسالت پیش کیا ہے جامع، کامل، عظیم، واضح اور روشن ہے۔ اسلام انبیا اور رُسل کو مصطفٰی اور برگزیدہ تصوّر کرتا ہے، وہ انہیں خدا کی نگاہِ قدرت کا انتخاب کہتا ہے، وہ ان کی ہر حرکت وعمل کو مِن جانب اللّٰہ یقین کرتا ہے، وہ ان کے نطقِ پاک کو خدا کا کلام قرار دیتا ہے، ان کے ارشادات کو منشاے ایزدی سے تعبیر کرتا ہے، انہیں بشریتِ عامہ کی سطح سے بہت بلند تصوّر کرتا ہے، اس طور پر کہ ایک غیر نبی لاکھ ترقی کر جائے مگر نبی نہیں ہو سکتا اور ان میں سب سے بڑھ کر یہ عقیدہ ہے کہ وہ عصمتِ انبیا کا قائل ہے۔ اسلام کی نگاہ میں ہر نبی اور رسول معصوم عن الخطاء ہے، اِس لیے کہ اگر نبی خطا کر سکتا ہے تو یقیناً جو قانون وہ عطا کرے گا اُس کو ہم خطا سے پاک تصوّر نہیں کر سکتے۔ اس طور پر صرف نبی کی ذات ہی نہیں بلکہ پورا قانونِ حیات مجروح ہو جائے گا۔ پھر یہ دعویٰ ممکن نہ ہوگا کہ ہمارے نبی نے ہم کو جو قانون عطا فرمایا ہے وہ مبرّا عن الخطاء ہے، افضل ترین ہے، اس سے بہتر قانون کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ہماری جمعیة

رھبان و قِسّیسین نے اور پاپایانِ کلیسا نے؛ دوسرے لفظوں میں خدایانِ مسیحیت نے غور و فکر کے بعد فیصلہ دے دیا ہے کہ اس میں کوئی خطا نہیں ہے تو یہ اور حیرت انگیز بات ہوگی، اِس لیے کہ نبی کی مقدس ترین زندگی اور اس کے پیغام کی صداقت پر مُہرِ تصدیق ثبت فرمانے والا خدا ہے، نبی کے اُمتی نہیں۔ یہ بات تو اس سے بھی زیادہ عجیب ہوگی کہ قانون ساز پارلی منٹ کے عالی دماغ افراد سڑک پر کھڑے ہو کر عوام النّاس کی بھیڑ سے سندِ صحت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

یوں ہی اگر جس کے نا کام طرفین کے اقوالِ باطلہ کی طرح سے نبی کو اپنے ہی جیسا فرض کر لیا جائے تو پھر ہم اس کے قوانین کو بالاے طاق رکھ کر خود قانونِ حیات کی ترتیب کا حق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ جب نبی ہمارے ہی جیسا ہے تو ہمیں بھی حق ہے کہ ہم قانون بنالیں یا پھر اس بات کی کیا ضمانت کہ نبی سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی ہوگی یا پھر یہ کہ نبی نے جس ماحول میں بیٹھ کر قانون پیش فرمایا تھا، یقیناً وہ اس کے مطابق ہوگا۔ مگر آج حالات بدل گئے ہیں۔ نبی کو غیب معلوم نہیں تھا، کہا جانے لگا ہے۔

یوں ہی قرآن نے نبی علیہ السّلام کو بشر تو فرمایا ہے مگر عام انسانوں جیسا نہیں بلکہ سیّد البشر؛ امام الانبیاء؛ حاملِ سیادتِ مطلقہ وافضلیتِ عامہ- ظاہر ہے اِس عقیدۂ رسالت کے بعد نبی کی حیاتِ پاک ہر لغزش اور ہر خطا سے معصوم ہے۔ جو مذہب اس قدر پاکیزہ تصورِ رسالت پیش کرتا ہو، اُس کو حق ہے کہ وہ ایک عالَم گیر نظامِ حیات کے حامل ہونے کا دعویٰ کر سکے اور کائنات اس کے دعوے پر ایمان لائے۔

نظامِ عبادت: اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی عبادتوں کا جائزہ لیجیے تو یہ محسوس ہوگا کہ مسیحیت، یہودیت، ہندومت، بودھ مت میں عبادت رہبانیت اور ترکِ لذات کا نام ہے۔ عبادت زندگی نہیں دیتی، بلکہ زندگی سے فرار سکھاتی ہے۔ عبادت زندگی کا حوصلہ، مستقبل کا عزم، کامیابی کا یقین اور جرأت و ہمت بخشنے کے بجائے یاسیت، قنوطیت، عافیت پسندی، نوازعِ فطریہ سے علاحدگی اور زندگی کے اقدار، عزت سے بیزاری بخشتی ہے۔ وہ

انسان کی بہترین صلاحیتوں کو فنا کر دیتی ہے، جن کے ذریعے سے وہ جہاں بانی کے فرائض انجام دے سکتا تھا، وہ انسانوں کا رشتہ انسانوں سے توڑ دیتی ہے اور صومعہ نشینی یا صحرا نوردی کا حکم دیتی ہے، جہاں یہ نغمہ گنگنایا جاتا ہے ع

”کسے را با کسے کارے نباشد“

ظاہر ہے کہ یہ نظامِ عبادت اس دُنیا کے بسنے والوں کا نہیں ہوسکتا جہاں زندگی کی عمارت تعاون اور تمانع پر قائم ہوتی ہے، جہاں خوشیاں ہیں، مسرّتیں ہیں، غم واندوہ ہیں، قہقہے اور نغمے ہیں، سسکیاں اور آہیں ہیں، جہاں جذبات واحساسات کی کارفرمائی ہے، جہاں فطرت کا حُسن کائنات کی ہر شے کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے، جہاں ؎

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید — وحدہٗ لا شریک می گوید

کے نغمے بربطِ دل پر چھڑتے ہیں اور جہاں ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

کی آئینہ بندی ہے۔

جو عبادت زندگی کی عظمتوں کے حصول کی تڑپ کے بجائے زندگی سے بیزاری کا درس دیتی ہے، وہ زندگی نہیں بلکہ مَوت ہے...... اِس کے برعکس اسلام کا نظامِ عبادت کس قدر خوب صورت اور زندگی کی عظمتوں سے بھرپور ہے! اسلام ایک خدائے وحدہٗ قدوس کی بارگاہ میں سجدے کا حکم دیتا ہے، تو دوسری طرف رزم گاہِ حیات میں تیزگامی کو لازمۂ حیات قرار دیتا ہے، هُمْ بِالَّيْلِ رُهْبَانٌ وَبِالنَّهَارِ فُرْسَان. اپنے ماننے والوں کی صفت بیان کرتا ہے۔ اِسلام ایک طرف تو توکّل علی اللّٰہ کا حکم دیتا ہے تو دوسری طرف لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى [النجم: آیت ۳۹] کے مقدّس فرمان سے رہ وارِ فکر وعمل کو مہمیز دیتا ہے۔ اسلام اگر روزے کا حکم دیتا ہے تو دوسرے مذاہب کے برت کی طرح آسودگیِ شکم کے لیے دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کے لیے نہیں، بلکہ دوسروں کی بھوک کو محسوس کر کے دوسروں کے لیے آسودگیِ حیات کا سامان فراہم کرنے کے لیے۔ اسلام اگر

حجِ پاک کا حکم دیتا ہے تو صرف اس لیے نہیں کہ چند دنوں کے لیے علائقِ دنیوی سے قطعِ تعلق کر کے اللہ کی راہ میں جہاد بالنّفس کی لذّت کشی کی جائے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی مرکزِ اسلام سے وابستہ ہونے کے لیے کعبۃ اللہ کی دیواروں کے نیچے سجدہ ریزی کا حکم دیتا ہے، تاکہ وحدتِ کلمہ کی بنیاد پر انسان رنگ ونسل کے تمام امتیازات کو فراموش کر کے، طبقاتیت کی تمام دیواروں کو ڈھا کر، نسلی اور جغرافیائی حد بندیوں سے آزاد ہو کر اپنے وجود کو اسلام کے مقدس ترین معاشرے کا ایک فرد تصوّر کرے، جس میں ایک انسان دوسرے انسان کی تمام تر انسانی قدروں کا محافظ ہے، جہاں ایک کا درد دوسرے کا درد اور ایک فرد کی خوشی تمام ملّتِ اسلامیہ کی مسرت سے تعبیر کی جاتی ہے۔

عبادت کے نظام کا جائزہ لیں تو یہاں بھی زندگی سے فرار نہیں، بلکہ زندگی کے بحرِ ناپیدا کنار میں اپنے قطرۂ وجود کو فنا کر دینے کا نام ہے ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا

۲۴ر گھنٹے میں ۵ر بار ایک محلّے کے لوگ محلّے کی مسجد میں حاضر ہو کر اپنی وحدتِ ملّی کا ثبوت دیں، سال میں ایک بار اطراف وجوانب کے لوگ عید گاہ میں حاضر ہو کر اجتماعی زندگی کی مسرتوں سے ہم کنار ہوں اور زندگی میں ایک بار کعبۃ اللہ کی دیواروں کے نیچے تمام دُنیا کے مسلمان رنگ ونسل، جغرافیائی تقسیموں، لونی ونسلی غرور کو پاش پاش کر کے اجتماعی سجدۂ نیاز پیش کریں۔

عبادت کے لیے بھی کسی خاص گوشۂ عافیت کی اس طور پر قید نہیں لگائی گئی کہ اس کے بغیر عبادت ممکن ہی نہیں، بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے لیے پوری زمین سجدہ گاہ ہے۔ احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کریں تو یہ بات ثابت ہوگی کہ اللہ کی بارگاہ میں سَر جُھکانا بھی عبادت ہے اور اللہ کے بندوں سے پیار کرنا بھی عبادت۔ اسلام میں عبادت زندگی بخشتی ہے، زندگی کا وقار عطا فرماتی ہے، آفاق وانفس پر حکم رانی کا مستحق بناتی ہے، استقلال وہمت بخشتی ہے، جرأت وحوصلے سے نوازتی ہے،

خدا کی بارگاہ میں سَر جھکا کر اپنی انسانی خودی کی حفاظت کا درس دیتی ہے۔ اندازہ فرمائیں کہاں اسلام کا پاکیزہ ترین نظامِ عبادت اور کہاں دوسرے مذاہب کی عبادتیں جن کا نقشہ قرآنِ عظیم نے اپنی اِس آیت کریمہ میں کھینچا ہے:

وَمَا كَانَ صَلَا تُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً [الانفال: آیت ۳۵]

اوران کی عبادت تو گھر کے پاس صرف سیٹیاں اور تالیاں ہیں

نظامِ اخلاق: نظامِ عقائد اور نظامِ عبادت کی طرح سے دُنیا کے دوسرے مذاہب کے دامن ایک باضابطہ نظامِ اخلاق سے بھی خالی ہیں، اِس لیے کہ اِس وقت ہمارے سامنے متمّمِ مکارمِ اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ جتنے بھی معلّمینِ اخلاق کے صحائف موجود ہیں ان میں انسان کی صِرف چند خصلتوں کا تذکرہ ہے، جنہیں انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر مسیحیت ہی کو لیجیے، اس کی کُل اخلاقی تعلیمات کو صِرف اِن چند فقروں میں سمیٹا جاسکتا ہے:

[۱] اکرامِ والدین [۲] خونِ ناحق سے پرہیز [۳] زنا سے بچنا
[۴] سَرقہ سے دست برداری [۵] شہادتِ کاذبہ سے احتیاط

کیا اِن چند اخلاقی تعلیمات سے انسان کی پوری زندگی کو سنوارا جاسکتا ہے؟ کیا مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے تمام گوشوں پر یہ تعلیمات حاوی ہیں؟ کیا اِن تعلیمات میں انسان کے اُن تمام رشتوں کا تذکرہ ہے جن سے وابستہ انسان کی پوری زندگی کو صِرف اِن چند اوامر ونواہی کے حوالے کیا جاسکے؟...... اِن سوالات کا جواب آپ کو یقیناً نفی میں ملے گا۔

اِس کے برعکس اگر آپ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت ہی تکمیلِ اخلاق ہے...... خود ارشاد فرماتے ہیں:

بَعِثْتُ لِاُ تَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَ خْلَاق.

قرآنِ عظیم ان کے مقدس منصب کی نشان دہی فرمارہا ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ. [القلم: آیت ۴]

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ اخلاق انسان کی پوری زندگی کے اوپر چھایا ہُوا ہے۔ مہد سے لے کر لحد تک زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے لیے اسلام کی اخلاقی پابندیاں موجود نہ ہوں...... یہی وجہ ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب ایک شخص نے سوال کیا کہ: ''اے امّ المؤمنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلقِ پاک کیا تھا؟'' تو انہوں نے ارشاد فرمایا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن. ''اُن کا خُلق قرآن ہے۔''

قرآن پاک میں الحمد کی الف سے لے کر وَالنّاس کی س تک ہر ہر آیتِ کریمہ پر تمہیں تصویر کردارِ مصطفیٰ نظر آئے گی۔

ایک اور نقطۂ نظر سے اگر آپ مسیحی اخلاقیات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مسیحی اخلاقیات کا حاصل صرف تذلّل اور انفعال ہے۔ خدا کے علاوہ انسانوں کے آگے بھی جذبۂ خودسپردگی ہی اس کا خلاصہ ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی طرف منسوب یہ جملہ زبان زد عوام وخواص ہے:

مَنْ ضَرَبَ عَلٰى خَدِّكَ الْاَيْمَنِ نا ذِرُله الايسر

جو تمہارے داہنے رخسار پر طمانچہ مارے، اُسے بایاں رخسار خود بخود پیش کردو۔

کیا اِس کا مطلب یہ نہ ہُوا کہ جو تمہارے ایک کلیسا پر حملہ کرے، اُس کو دوسرا کلیسا بھی پیش کردو، جو تمہاری ایک مملکت چھین لے، اُسے دوسری مملکت بھی پیش کردو؟ کیا یہ تعلیم کسی نظامِ سلطنت واقتدار کے لیے کوئی اخلاقی ضابطہ دے سکتی ہے؟ اس تعلیم کی روشنی میں - امر بالمعروف - اور - نہی عن المنکر - ناممکن ہے، ظلم کا استیصال اور عدل کی ہم نوائی محال ہے۔ کم زوروں کا تعاون اور ظالمانہ قوتوں کی مدافعت بعید از قیاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور جرمن مفکر نٹشے نے جب مسیحی اخلاقیات کا مطالعہ کیا تو بے ساختہ پکار اُٹھا:

''مسیحیت کی اخلاقی تعلیمات، انحطاط، تذلّل اور بوسیدگی کی طرف مائل ہیں، وہ انسان کی بہترین صلاحیتوں کو فنا کردیتی ہیں۔''

ڈاکٹر کیلی نے بھی اِسی مفہوم کو پیش کیا ہے:

''جاو بے جا انکسار اور فروتنی ظلم کے سامنے خود سپردگی یہ ساری خصلتیں مسیحیت کی پیداوار ہیں۔ غیر متمدّن دُنیا کے لیے ممکن ہے کہ اس طرزِ اخلاق میں زندگی رہی ہو مگر آج کی متمدّن دُنیا کا مسیحی اخلاقیات میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔''

دوسرے لفظوں میں وہ اعلان کر رہا ہے کہ عیسائیت کی اخلاقی قدریں عصرِ جدید اور تمدّنِ حاضر کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ اس کے برعکس اگر آپ اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کریں، اور اسلام کی اخلاقی قدروں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے جہاں تواضع اور انکساری کا حکم دیا ہے، وہیں ظلم و کفر اور عصیان و سرکشی کے مقابلے میں جہاد کا بھی حکم دیا ہے۔ اسلام ایک نظامِ عدل ہے، ایک متوازن نظامِ خلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ نے مسیحیت کی اخلاقی تعلیمات سے عملاً کنارہ کشی اختیار کرلی ہے اور اسلامی اخلاقِ حسنہ کو انہوں نے شعوری اور لاشعوری دونوں طریقوں سے قبول کرلیا ہے۔

غور فرمائیں کہ دُنیا کے سب سے بڑے مدّعیِ اخلاق مذہب [مسیحیت] کا جب یہ عالَم ہے تو یہودیت، بودھ مت اور ہندومت وغیرہ کا کیا عالَم ہوگا، جہاں کسی اجتماعی اخلاق کا کوئی تصوّر رہی نہیں ہے، محض بعض صداقتوں کی طرف کچھ مبہم اشارے ہیں جو انسان کی مکمل رہ نمائی نہیں کر سکتے۔ جب اِسلام کے علاوہ دُنیا کے تمام مذاہب کے نظامِ عقائد، نظامِ عبادت، نظامِ اخلاق کا ناقص ہونا ثابت ہوگیا......تو آیئے! ہم قرآن عظیم کی اِس آیت کریمہ کی تلاوت کریں:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ. [آل عمران: آیت ۱۹]

بے شک دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

☆☆☆

یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی ضرورت

اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس کے رہ نما اصول اسلام کے اندر موجود نہ ہوں۔ جغرافیائی، لونی، لسانی اقتصادی بنیادوں پر منقسم کوئی ایسا طبقہ نہیں ہے جس کے لیے اسلام یکساں ممکن العمل نہ ہو۔ اسلام تمام انسانوں کا مذہب ہے۔ اجتماعی طور پر تمام اقوام اور انفرادی طور پر ابنِ آدم کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

اسلام ایک معزز اور باوقار زندگی کی دعوت دیتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو پستیوں سے نکال کر حیاتِ انسانی کی عظمتوں سے ہم کنار کرتا ہے: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ. [آل عمران: آیت ۱۳۹] ''تمھیں سربلند ہوا گر تم مومن ہو۔''

ایمانِ کامل اور سربلندی دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان کے بعد یا تو سربلندی میسر ہو یا سربلندی کے لیے جدوجہد جاری رہے تو خیر؛ ورنہ اگر ذلّت و نکبت میسر ہو اور اُس پر قناعت کر لی جائے تو ایسے ماحول میں ایمان کے دعوے داروں کو علیٰ وجہ البصیرۃ اپنے بارے میں غور کرنا ہوگا کہ وہ حقیقی معنوں میں مومن ہیں یا نہیں۔

اگر آپ مسلمانوں کے عروج و زوال کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ماضی میں اُمّتِ مسلمہ کے سامنے کئی ایسے موڑ آئے جب اس سے اس کا اقتدار چھین لیا گیا اور اسے ذلّت و پستی کے غار میں ڈھکیل دیا گیا، لیکن اس کا احساس زندہ تھا۔ احساسِ زیاں نے اسے جھنجھوڑا، دوبارہ عمل کی طرف مائل کیا، اس کی منتشر قوتوں کو اکٹھا کیا اور باطل کے مقابلے میں صف آرا ہوگئی۔ الحاصل اس نے پھر اپنا کھویا ہُوا وقار حاصل کرلیا۔

صلاح الدین ایوبی کے لیے ستّائیس رجب کی وہ دردناک ترین رات تھی جب وہ مسجدِ اقصٰی کے تصوّر میں لرز رہا تھا اور خداے برتر و بالا کے سامنے گڑ گڑا رہا تھا کہ: اے

پروردگارِ عالم! قومِ مسلم پر اِس سے دردناک رات اور کوئی نہ آئے گی کہ جس مسجد میں آج کی شب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاے کرام کی امامت کی تھی، آج وہی عظیم وجلیل مسجدِ اقصیٰ عیسائیوں کے قبضے میں ہے۔ اسلام کا وہ فرزندِ عظیم شبِ معراج کی فجر تک روتا رہا اور جب خداے پاک کی جانب سے اُس کے قلب کو قدرے اطمینان ہُوا تو اُس نے مسجدِ اقصیٰ کی طرف رُخ کر کے کہا: ''اے قبلۂ اوّل آنے والی شبِ معراج سے پہلے ہم تجھے دُشمنوں کے تسلّط سے آزاد کرلیں گے- ان شاءاللہ- اور آنے والی شبِ معراج میں ہمارا یہ سجدۂ اضطراب سجدۂ شکر میں تبدیل ہوجائے گا۔ پھر تاریخ شاہد ہے کہ اُس نے ایک سال کے اندر ہی صلیبی قوتوں کو مکمل شکست دے دی، اور نہ صرف یہ کہ اپنا کھویا ہُوا وقار حاصل کرلیا بلکہ صلیب برداروں سے بعض ایسے علاقے بھی حاصل کرلیے جو پہلے سے مسلم مملکت کی حدود میں نہ تھے۔

شہابُ الدین غوری نے پہلی بار پرتھوی راج سے شکست کھانے کے بعد قسم کھائی تھی کہ جب تک مَیں ہندوستان میں اسلام کی صداقت کا پرچم نہ بلند کرلوں گا، مَیں اپنے اوپر زندگی کی تمام آسائشیں حرام کرتا ہوں۔ کھانا بس اتنا ہی کھاؤں گا جس سے زندگی باقی رہ سکے اور لباس اتنا ہی پہنوں گا جو ستر کے لیے کافی ہو، تخت کے بجائے زمین پر سوؤں گا۔ اور پھر اس بطلِ عظیم نے اسی طرح ایک سال گزار دیا۔ راتوں کو خدا کی بارگاہ میں روتا اور تڑپتا رہتا اور دن بھر فوجوں کی ترتیب، نئے فوجیوں کے داخلے اور سامانِ جنگ کی فراہمی کا کام کرتا:

هُمْ بِاللَّيْلِ رُهْبَانٌ وَبِالنَّهَارِ فُرْسَان.

مسلمان رات کے عابدِ شب زندہ دار اور دن کے مجاہد ہیں۔

آخر اس کا گریۂ پیہم مستجاب بارگاہِ خداوندی ہُوا، اور خواجۂ اعظم سلطانُ الہند غریب نواز کے ذریعے مشیّت نے یہ ظاہر کردیا کہ دوبارہ محاذ پر ڈٹ جاؤ۔ فتح ونصرت تمہارے قدم چومے گی اور پھر ایک سال کے احساسِ شکست کا درد اُٹھانے کے بعد شہابُ الدین غوری نے دوبارہ ہندوستان پر حملہ کیا اور خواجۂ ہند نے ارشاد فرمایا: مَیں نے پرتھوی راج کو

زندہ مسلمانوں کے حوالے کردیا...... پرتھوی راج گرفتار ہوچکا تھا اور شہابُ الدین؛ حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے حضور میں نذرِ عقیدت پیش کررہا تھا کہ حضور یہ صرف آپ کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اگر کسی قوم کو شکست کا منھ دیکھنا پڑے، لیکن اس کا احساسِ زیاں زندہ ہو تو پھر وہ دوبارہ فتح حاصل کرلیتی ہے۔ لیکن وہ قوم دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتی جسے پے درپے شکستیں ہورہی ہوں اور وہ اپنی ذلتوں اور شکستوں کو مقدر سمجھ کر انھیں پر قانع ہوگئی ہو۔

آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمان زندگی کے ہر میدان میں دُنیا کی دوسری اقوام سے پیچھے ہے، خواہ وہ سیاسی ہو یا ثقافتی، معاشرتی ہو یا اقتصادی، تعلیمی ہو یا تجرباتی۔ گزرے ہوئے سو سال میں کسی بھی شعبے میں اس نے کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ سیاسی اعتبار سے آج سے صدیوں پہلے ہمارے اسلاف نے اپنے مفتوحہ علاقے جو ہم تک ورثۂ منتقل کیے تھے ان میں سے چند ایک قابلِ لحاظ خطّوں کو گنوا دینے کے علاوہ ہم نے ایک قدم آگے نہیں بڑھایا ہے۔

تہذیب وتمدن کے میدان میں ماضی میں ہماری عظیم الشان خدمات سے دُنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ لیکن حال میں ہمارا شمار دُنیا کی غیر متمدّن اور غیر مہذب قوموں میں ہورہا ہے۔ ماضی میں اقتصادی میدان میں بھی ہم نے دُنیا کے لیے نئی راہیں ہموار کی تھیں اور صدیوں تک ایک آسودہ، مطمئن اور خوش حال معاشرے میں زندگی گزارنے کے بعد ہم آج سب سے زیادہ بدحال اور اقتصادی پس ماندگی کا شکار ہیں۔ تحقیقی اور تجرباتی میدان میں ہم نے سب سے پہلے اقدام کیا تھا اور دُنیا کو فطرت کے اُن پوشیدہ خزانوں سے آشنا کیا تھا جس سے کام لے کر آج دُنیا کی قومیں بہت آگے نکل چکی ہیں، اور ہم صدیوں کی نیند سے اُٹھے تو دیکھا کہ ہمارے تحقیقی خزانوں پر دوسروں کا قبضہ ہے اور ہم آج سرِ راہ بیٹھے یارانِ تیز گام کی عظمتوں کی پیمائش کررہے ہیں۔

لیکن سب سے رُوح فرسا بات یہ ہے کہ ہم اپنی اِنہیں ذلتوں پر قانع اور انھیں فاقہ مستیوں میں مست ہیں، اور ہر طرح کی پس ماندگی اور محکومی کو اپنا مقدّر سمجھ کر ہم نے جدوجہد کے تمام دروازے مقفّل کر دیے۔ وقت کا ایک سیلاب ہے جو ہمیں تنکوں کی طرح نامعلوم سمت کی طرف بہائے لیے جا رہا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہماری منزل کیا ہے اور آئندہ ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے، اور نہ ہی آنکھ کھول کر ہم مستقبل کے ان بھیانک غاروں کی طرف دیکھ رہے ہیں جن کی طرف ہم تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا یہ حال خود بخود ہو گیا ہے یا ہم لاشعوری طور پر کسی باشعور حریف طبقے کی جانب سے پیش کردہ زہر کو تریاق سمجھ کر حلق سے نیچے اُتارتے چلے جا رہے ہیں جو ہمارے قویٰ پر اضمحلال، ہمارے قلوب میں افسردگی اور ہماری قوتِ عمل پر موت کی خموشی مسلّط کرنا چاہتا ہے اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہے۔

اگر ہم حالات اور واقعات کو ترتیب دیں اور بعض تحریکوں کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دوسری بات صحیح ہے۔ ناکامیوں سے کامیابی کا سبق لینا اور شکستوں کا احتساب کر کے فتح مندیوں کی طرف قدم اُٹھانا یہ قومِ مسلم کا شعار ہے، لیکن اگر آج ایسا نہیں ہو رہا ہے تو اِس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ مذہب نے حرکت وعمل کی جو زندگی دی تھی، وہ مر چکی ہے اور اِس کا سبب وہی زہر ہے جو شہد کی حلاوت کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ قومِ مسلم کے رگ و ریشے میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

کیا اسلام صرف فرد کی اصلاح چاہتا ہے؟ اسلام اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان اِس تصور سے پہنچا ہے کہ اسلام بھی ہندومت، عیسائیت اور بودھ مت کی طرح صرف فرد کی اصلاح چاہتا ہے، معاشرہ خواہ کیسا ہی ہو۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کسی معاشرے کے قیام کا قائل نہیں جس میں صرف اسلامی اصولوں کی حکم رانی ہو اور غیر اسلامی

اقدار کو معاشرے سے باہر نکال دیا گیا ہو۔ اگر مذہب کے حدودِ عمل کا یہ تعیّن اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگ کرتے ہیں تو وہ حق بجانب ہیں، کیوں کہ اُن کے یہاں تاریخ کا کوئی ایسا دَور نہیں گزرا ہے جب خالص مذہبی بنیادوں پر دُنیا کے اندر کوئی معاشرہ قائم ہوا ہو۔ لیکن معتقدینِ اسلام جب اِس طرح کی بات کرتے ہیں تو ہمارے اِس یقین کو تقویت ملتی ہے کہ یا تو وہ خود فریب خوردہ ہیں یا فریب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دُنیا میں ہمارے مذہبی حریفوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام دُنیا میں ایک مثالی معاشرے کے قیام کے لیے جلوہ گر ہوا ہے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ مساعی کا محور بھی یہی اسلامی معاشرہ تھا، چنانچہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا معاشرہ قائم فرمایا تھا جس میں زندگی کے کسی حصے میں غیر اسلامی تصوّرات کے داخل ہونے کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ انھوں نے اسلامی معاشرے کے لیے جو قانون عطا فرمایا، اس میں زندگی کی تمام جُزئیات کا استقصا کر لیا گیا ہے اور کسی بھی گوشۂ حیات کو تشنۂ قانون نہیں چھوڑا گیا۔

یہ صحیح ہے کہ معاشرہ افراد ہی کے اجتماع سے بنتا ہے لیکن یہ بھی ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اس معاشرے کا جذبہ اُن افراد میں پوری طرح موجود ہونا چاہیے جو اس نظام کو عملاً قبول کر رہے ہیں، ورنہ کوئی معاشرہ قائم نہ ہوگا۔ البتہ غیر تربیت یافتہ افراد کی ایک بھیڑ اکٹھا ہو جائے گی۔ اسلامی اصولوں کی روشنی میں جس معاشرے کا قیام عمل میں لایا جائے اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر اعتبار سے نمایاں اور ممتاز ہو اور اپنے افراد کو باعزت اور باوقار فیروز مندیوں سے آسودہ زندگی بخشتا ہے۔ اگر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھامنے کے بعد اُن کے صدقے میں مسلمانوں کو مکمل کامیابیاں نہ ملتیں اور آٹھ سو سال تک ان کا سیلِ رواں اکنافِ عالَم کو سیراب نہ کر چکا ہوتا تو دُنیا یہ کبھی اعتراف نہ کرتی کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو غلبہ وقوت کی زندگی بخشتا ہے۔

لیکن ٹھیک اُس وقت جب کہ پوری دُنیا اسلام کی آغوشِ رحمت میں سکون حاصل

کرنے کے لیے پیش قدمی کر رہی تھی، مسلمانوں نے دین کی اجتماعی جدوجہد میں کمی شروع کردی ۔

زمانہ بڑے غور سے سُن رہا تھا　　تمھیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

رفتہ رفتہ یہ تصور ہی مِٹ گیا کہ اسلام تمام ابنائے آدم کا مذہب ہے اور مسلمانوں کو بہ حیثیت خیرِ اُمّت ، [بیگانوں کو] اُمّتِ اجابت میں شامل کرنا ہے ۔

یہاں تک کہ ایک دور ایسا بھی آیا کہ لوگوں نے صرف بعض مسلم افراد ہی کی اصلاح کو تبلیغ کا نام دے دیا اور انھوں نے مذہب و سیاست کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا حالاں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا حاصل یہ ہے کہ جو ہمارا دین ہے، وہی ہماری دُنیا ہے۔ جو ہمارا مذہب ہے، وہی ہماری سیاست ہے۔ دین و سیاست کی علاحدگی کے اِس رُجحان کے پھیلنے کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ مذہب سے آزاد ہو کر حکومت و اقتدار کے لیے کوشش کرنے لگا اور دوسرا طبقہ مذہب کے تحفظ کے لیے گوشہ نشین ہو گیا، اور آج جب آنکھ کھلی تو دُنیا بدل چکی ہے ۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک جام
نکلے جو مے کدے سے تو دُنیا بدل گئی

مسلمان آج بھی اگر اپنی سابقہ فروگذاشتوں کا کفّارہ ادا کرنا چاہیں اور مذہبی بنیادوں پر حصولِ زندگی کی جدوجہد کو تیز تر کر دیں تو مذہب کی بے پایاں قوتوں کا سہارا لے کر ہم صدیوں کا فاصلہ برسوں میں طے کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس صد افسوس! کہ پہلے تو یہ انفرادی رُجحان تھا کہ مذہب کا دُنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر اب بعض تحریکیں اور جماعتیں اجتماعی طور پر کوشش کر رہی ہیں کہ مذہب کو کسی اجتماعی معاشرے کا ابدی نظام نہ قرار دیا جائے اور مذہب پسند لوگ بغیر میدانِ عمل میں اُترے ہوئے صرف چلت پھرت کے ذریعے دُنیا کے سیاسی، تمدّنی اور معاشرتی معرکے سَر کر لیں۔ صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کو جدوجہد اور حرکت و عمل سے روکا جائے بلکہ ایسا ماحول تیار کیا جائے کہ انھیں دُنیا کی ترقیوں کا

کوئی علم نہ ہو سکے، اور مذہب کو کہاں سے مجروح کیا جا رہا ہے اس کے مطالعے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ پہلے کم از کم اتنا تو ہوتا تھا کہ علمائے کرام تاج داروں سے تعلقات رکھتے تھے، اُن کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے تھے، اُنھیں مفید مشورے دیتے تھے اور اُن کے اندر خوفِ خدا پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور احتسابِ یوم الدین کو ملحوظ رکھ کر قوم کو آگے بڑھانے کی تلقین کرتے تھے مگر اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ مسلم معاشرہ اور زعمائے معاشرہ کہاں کہاں غلطیاں کر رہے ہیں، معاشرہ کس طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے اور کون سے محرّکات ہیں جن کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقے سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے، ان خامیوں کا جائزہ لینا ہی بنامِ مذہب جینے والے طبقے کے لیے دشوار ہو گیا ہے۔

آج ایسی تحریکوں کو بعض ایسی قوتیں بھی سہارا دے رہی ہیں جن کو یقین ہے کہ یہ کوشش تبلیغ کے نام پر کی جا رہی ہے، مگر جیسے جیسے ان مبلغین کا حلقہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے مسلم عوام کے ذہن سے تبلیغ اور مفہومِ تبلیغ دونوں نکلتے جائیں گے، دوسرے لفظوں میں تبلیغ ہوتی رہے گی اور روحِ تبلیغ مرتی رہے گی۔ یہ گلی کوچوں میں تبلیغ کرتے رہیں گے اور حقیقی اسلام ان کی ناعاقبت اندیشیوں پر ماتم کرتا رہے گا۔ پھر ایک دور ایسا بھی آئے گا کہ بیمار مصلحین اور مفلوج معالجین کی ایک جماعت تیار ہو جائے گی جو بنامِ تبلیغ زندگی کو موت کے گھاٹ اُتارتی رہے گی۔ آج بنامِ تبلیغ ایک ایسی بیمار جماعت پیدا ہو رہی ہے جو زندگی کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے اپنی خیالی جنت میں مصروفِ ناؤ نوش رہے اور پھر کوئی طاقت اُبھر کر اس کو غلامی کی زنجیر پہنا دے۔ ظاہر ہے کہ دُنیا میں طاقت کا جواب طاقت سے اور علم کا جواب علم سے دیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کوئی قوم مادّی قوتوں سے مسلح اور تمام علمی اسلحوں سے آراستہ ہو اور اس کے مقابلے میں ایک بیمار، پست ہمت، حالات سے نا آشنا، غیر مسلح، جاہل اور پس ماندہ قوم ہو، تو کامیابی مؤخر الذکر قوم کو ملے۔ اگر حالات سے بے نیاز ہو کر اسباب و وسائل سے کنارہ کش ہو کر محض دُعاؤں کے ذریعے سارے مسائل حل ہو جاتے تو قرآنِ عظیم بار بار حریف کے مقابلے کے لیے ہر طرح کی تیاری کا حکم

نہ دیتا اور خود رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر و حنین، خیبر و اُحد کے بجائے کعبۃ اللہ کے نیچے صرف تمنا فرماتے اور تمام قومیں اُن کے قدموں میں جھک جاتیں۔ حالاں کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ تمنّاؤں میں یہ اثر تھا کہ کونین کو اُن کے قدموں میں جھکا دیا جاتا، اِس لیے کہ جس کی محض ایک نظر اُٹھ جانے سے قبلہ بدل جائے اگر وہ لبِ اعجاز کھولتے تو کائنات کی تقدیر کیوں نہ بدل جاتی؟ لیکن اگر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرماتے تو ان کے معجزات میں ایک معجزے کا اور اضافہ ہو جاتا، لیکن ان کے دین کی بقا و تحفظ کے لیے اُمّتِ مسلمہ کو جہاد فی سبیل اللّٰہ کا عظیم قانون نہ ملتا، اِس لیے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دُشمنانِ دین کے لیے ہر طرح کی تیاریوں کا حکم دیا اور غزوۂ بدر میں جب اپنی کُل متاعِ جہاد لے کر اُترے تو خداے برتر و بالا کی بارگاہ میں دُعا فرمائی۔ کیا ان کا یہ اسوۂ پاک ہمیں اِس بات کی طرف متوجہ نہیں کرتا کہ پہلے ہم ہر طرح کے اسباب و وسائل سے خود کو آراستہ کر لیں اور خود کو شہادت گہِ اُلفت میں اُتارنے کے لیے ہمیشہ تیار رکھیں اور جب بھی باطل ہم کو چیلنج کرے تو ہم حق و عدل کا سر بلند کرنے کے لیے سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں کود پڑیں؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان اسباب پر نہیں خالقِ اسباب پر بھروسہ کرتا ہے۔ بارہا ایسا ہُوا ہے کہ مسلمان بے سروسامانی کے عالَم میں نکلے ہیں اور بے سروسامانی کے عالَم میں پروردگارِ عالَم نے ان کو فتحِ کامل عطا فرمائی ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے، لیکن کب؟ جب مسلمان مجبور کر دیے گئے، وہ اسباب و وسائل مہیّا کرنا چاہتے تھے لیکن نہ کر سکے اور ان پر اضطرارِ کامل طاری ہو گیا تو...... اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکۡشِفُ السُّوۡٓءَ [النمل: آیت ۶۲] کے ضابطے کے پیشِ نظر پروردگارِ عالَم نے فتح و نصرت عطا فرمائی۔

مگر آج قومِ مسلم اسباب و وسائل فراہم کر سکتی ہے، لیکن نہیں کر رہی ہے تو یہ سہل کوشی ہے، کسل ہے، زندگی سے فرار ہے۔ یہ وہ اضطرار نہیں ہے جس کے نتیجے میں کامیابی مومن کا مقدر ہے، اہلِ عزیمت کا حصہ ہے۔ ایسی قوم میدانِ کارزار میں اپنی غفلتوں اور لاپرواہیوں کی سزا ضرور بھگتے گی اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دی

جائے۔ اسلام تو ہمیشہ زندہ رہے گا اور زندہ ہی رہنے کے لیے آیا ہے، مگر یہ ضروری نہیں کہ مسلمان بھی ہمیشہ باقی رہیں۔ اگر موجودہ مسلمانوں پر یہ کسل اور ناعاقبت اندیشی مسلط ہے تو اس کا امکان ہے کہ پروردگارِ عالَم ان مسلمانوں کو جُرمِ غفلت کوشی کی سزا میں کسی ظالم قوم کے ہاتھوں فنا کر دے اور ان کی جگہ دوسرے مسلمان لے لیں جو قوتِ عمل سے سرشار اور یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی دولت سے آسودہ ہوں، تاریخ میں ایسا ہُوا بھی ہے۔ بغداد کی ناعاقبت اندیش، عیش پسند اور سہل کوش قوم کو چنگیزیوں کے ذریعے سے ہلاک کیا گیا۔ اسلام کی بقا کے لیے انھیں لوگوں کو مسلمان بنا دیا گیا ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

آج جو جماعتیں مسلمانوں کو صرف دُعا گو بنانا چاہتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی قوتِ فکر و عمل کے خلاف ایک خطرناک سازش ہیں، جن کی سرپرستی اسلام کے ذہین ترین حریف کر رہے ہیں۔ شاہ راہوں، چوراہوں، ٹرینوں، دکانوں، بازاروں پر دعائیں۔ جنگوں کے پُر خطر موقع پر دُشمن کے ٹینکوں میں کیڑے پڑ جانے کی دُعائیں! عجیب ہیں یہ دُعا گویانِ زمانہ اور خیر خواہانِ اسلام!

آج ایک طرف تو مستشرقینِ یورپ اپنے پُر فریب لٹریچر سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف ہزاروں غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں، دوسری طرف کمیونزم اور سوشلزم جیسی تحریکوں نے اسلام کے متعلق ہزاروں شکوک و شبہات کھڑے کر دیے ہیں، تیسری طرف اِلحاد و نیچریت دماغوں کو مذہب کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، چوتھی طرف مغربی تہذیب؛ اسلامی تہذیب پر مسلسل ضربِ کاری لگا رہی ہے۔ ان حالات میں ایسے مصلحین کی ضرورت تھی جو اسلام کو اِس طور پر دُنیا کے سامنے پیش کرتے کہ دُنیا کا ہر صاحبِ ہوش اس کی معقولیت کا قائل ہو جاتا، شکوک و اَوہام کے بادل چھٹتے اور لوگ اسلام کی حقیقی عظمتوں سے آشنا ہو سکتے۔ آج کسل و گوشہ نشینی کی بجائے اُس ہوش

مندانہ اور جرأت مندانہ تبلیغ کی ضرورت ہے جس میں عصرِ حاضر کے تمام حملوں کا جواب دیا جاسکے، خواہ وہ حملے کسی طرح کے ہوں...... جب ہماری سرحدوں پر کفر توپوں اور ٹینکوں کی گھن گرج کے ساتھ حملہ آور ہو تو ہمیں انہیں اسلحوں سے دُشمن کا دفاع کرنا ہوگا۔ لیکن آج باطل مادّی اسلحوں کے ساتھ نہیں بلکہ علم وتحقیق کے مقابلے کے نام پر ہماری نسلِ جدید کو گمراہ کررہا ہے، اِس لیے ضرورت ہے کہ علم وتحقیق کے مقابلے میں علم وتحقیق پیش کیا جائے۔

جس زمانے میں فلسفۂ یونان اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے ساتھ اسلامی فکر پر حملہ آور ہُوا تھا تو امام غزالی ورازی جیسے مفکرین نے نہ صرف یہ کہ فلسفۂ یونان کے مُضر اثرات سے اُمّتِ مسلمہ کو بچایا، بلکہ انہیں مسلمان بنالیا اور ان کے ذریعے سے دین کی خدمت فرمائی۔ آج اگر فلسفۂ جدید حملہ آور ہے تو مسلمانوں کے ہوش مند طبقے کو انتہائی بصیرت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرنا ہوگا اور انتہائی جرأت واستقلال اور کمالِ پامردی کے ساتھ ان کا دفاع کرنا ہوگا۔

آج ایک خاموش ارتداد ہے جو ہمارے معاشرے میں گھستا چلا آرہا ہے۔ ہماری نوجوان نسل کے قلب ودماغ سے خدا اور رسول کا تصوّر نکلتا جارہا ہے لیکن ذمّے دارانِ معاشرہ کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ کاش یہ احساس عام ہوجائے کہ آج اُمّتِ مسلمہ کو ایک ہوش مندانہ قیادت کی ضرورت ہے جو یقیں محکم اور عمل پیہم کی طاقتوں سے آراستہ ہو اور باطل کا ہر محاذ پر مقابلہ کرسکے۔

☆☆☆

مسیحیت اور اِسلام

دُنیا میں بے شمار مذاہب حیاتِ انسانی کی رہ نمائی کے لیے ظہور پذیر ہوئے اور سب نے یہ دعویٰ کیا کہ ہم حیاتِ انسانی کے اُلجھے ہُوئے گیسوؤں کو سلجھانے، اس کے لاینحل مسائل کی عقدہ کشائی کرنے اور دُنیا کے اندر پھیلے ہوئے اَن گنت طریقہ ہائے زندگی میں اس کے لیے شاہ راہِ حیات متعین کرنے آئے ہیں اور تقریباً ہر دور وعصر میں ان کے ماننے والوں کی الگ الگ جماعتیں ایک دوسرے سے متصادم ومتحارب رہیں، لیکن جب آفتابِ اسلام عالَم تاب ہُوا، تو دُنیا کے سارے مذاہب نے سرِ تسلیم خم کردیا اور خود بخود ان مذاہبِ قدیمہ کا شیرازۂ ملّی بکھر گیا۔ اوہام وخرافات کے پردے، جو صدیوں سے عقلِ انسانی پر پڑے ہوئے تھے، چاک ہوکر رہ گئے۔ ان میں بیش تر مذاہب مُردہ ہوگئے اور جو کچھ باقی رہ گئے وہ اس وقت سے لے کر آج تک حیات ومَوت کی کشمکش میں سسکیاں لے رہے ہیں...... لیکن کچھ عجیب بات ہے کہ مسیحیت اپنی اساس کے اعتبار سے سب سے زیادہ کم زور اور لاغر ہوتے ہوئے بھی اپنے تبلیغی مشن اور حکومتی مشنریوں کے بھروسے پر آج بھی بانگِ دہل یہ اعلان کررہی ہے کہ وہ اور صرف وہی دنیائے انسانیت کے لیے واحد نظامِ حیات ہے۔ اس کی جرأت وہمّت یہاں تک حد سے تجاوز کرگئی ہے کہ مستشرقینِ یورپ نہ صرف یہ کہ اس کو اسلام کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں، بلکہ تقابلی تجزیے میں اسلام جیسے پاکیزہ اور ٹھوس نظامِ عقائد واخلاق پر رکیک حملے بھی کرتے ہیں...... آج مسلمانوں کا وہ طبقہ جو اسلامی ماحول سے دور رہ کر جدید روشنی میں سائنٹفک انداز سے اسلام اور مسیحیت کا تقابلی مطالعہ کررہا ہے، سخت حیران وسرگرداں ہے کہ مسیحیت اور اسلام میں کس کو ترجیح دیں اور پھر وہ اسی عالَم حیرانی میں کوئی درمیانی راستہ ڈھونڈنے لگتا ہے اور اس طرح سے خود وہ ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈال دیتا ہے۔

سرسیّد احمد خاں بانی مسلم یونی ورسٹی اور موجودہ پرویزیت وغیرہ کی ''مذہبی عقلیت''

اورمعجزات وغیرہ سے کھلا ہُوا انکار اِسی درمیانی طرزِ فکر کا نتیجہ ہے۔ کاش یہ طبقہ اپنی عقل وفکر کو دلیلِ راہ اور معیارِ ایمان بنانے کے بجائے قرآن پاک کی جانب دلیل طلب نگاہوں سے دیکھتا تو اسلام کے چشمۂ حیواں اور قرآن کے مینارۂ نور سے دور ہوکر جہل وگم راہیت کی تاریکی میں غیر مطمئن اور پیاسا سرگرداں نہ رہتا۔

قرآنِ پاک نے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا [بنی اسرائیل: آیت ۸۱] فرما کر اسلامی دور میں قیامت تک کے لیے نہ صرف یہ کہ سارے مذاہب کی افادیت کا انکار فرمایا ہے، بلکہ ان کے لیے کوئی گنجائشِ قدم زدنی ہی باقی نہ رکھی ہے۔ جہاں قرآنِ پاک نے سارے مذاہبِ قدیمہ کی ''موجودہ حقیقت'' بیان کی ہے وہیں اس نے مسیحیت کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ یہ وہ مسیحیت نہیں ہے جس کو حضرت مسیح لے کر تشریف لائے تھے، بلکہ موجودہ مسیحیت تحریف وتبدیل کا شکار ہوکر مسیحیوں کی تابع ہَوس عقل کی ذاتی اختراع کا نتیجہ اور ان کی فکرِ معاش کا آلۂ کار بن کر رہ گئی ہے، اور جب ہم خود ہی مسیحی اساسیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو قرآنِ پاک کے اِس دعویٰ کی صداقت کو اپنی نگاہوں سے دیکھ کر طبیعتِ ایمانیہ جھوم جھوم اُٹھتی ہے اور عقلِ ایمانی تاب ناک ہوجاتی ہے اور نیز مسیحیت کا چیلنج کہ وہ حیاتِ انسانی کی کامل رہ نما ہے، بالکل کھوکھلا اور بے بنیاد نظر آتا ہے، بلکہ اس طرح سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مسیحیت کے خود ساختہ ''روشن تصورات'' کے پردے میں انتہائی بھیانک برائیاں پرورش پا رہی ہیں جو معاشرۂ انسانی کے اثر پذیر جسم کے رِستے ہُوئے ناسور کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کسی بھی ایسے مذہب کا جائزہ لینے کے لیے جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ مُنَزَّل من اللّٰہ ہے اُس کے عناصرِ ثلٰثہ یعنی [۱] نبی یا رسول [۲] کتاب- اور ان دونوں عناصر عظیم سے پیدا ہونے والے تیسرے عنصر [۳] نظامِ عقائد واخلاق کا تجزیہ کیا جائے۔ اس ٹھوس اصول کے تحت مسیحیت پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے تفصیل کی جانب قدم بڑھائیں۔

مسیح انجیلی کی حقیقت: مسیحی اپنے کو حضرت عیسٰی علیہ السّلام کا پیرو سمجھتے ہیں، بلاشبہہ

حضرت عیسٰی علیہ السّلام ایک برگزیدہ پیغمبر ہیں۔ ان کی عظمت کا اعتراف قرآن کررہا ہے، مگر ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ عیسائی حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے پیرو نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنے ہی فرسودہ خیالات ونظریات کو تعلیماتِ مسیح کی صورت میں دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ عیسٰی علیہ السّلام کی تعلیمات اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں، بلکہ تحریف وتبدیل کا شکار ہوگئی ہیں کہ کسی نبی کی تعلیمات کے زندہ ہونے کا ثبوت خود نبی ہوتا ہے اور جو نبی ایک مکمل نظامِ حیات پیش کررہا ہو، ضروری ہے کہ اُس کی زندگی کا کوئی گوشہ تاریکی میں نہ ہو۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ مسیحیت موجودہ نے حیاتِ مسیح پر اس قدر دبیز پردے ڈال دیے ہیں کہ عقلِ انسانی میں ان کی اصل سیرت تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ مستشرقینِ یورپ نے زمانے کے مطالبے کو مدنظر رکھتے ہوئے بے پناہ عرق ریزی کی، حیاتِ مسیح کو انہوں نے آثارِ حوادث میں تلاش کیا، نیز حضرت عیسٰی سے متعلق شہروں اور صحراؤں کی خاک چھانی، بابل، الور، شام، مصر، افریقہ وغیرہ کی قدیم تاریخوں کا جائزہ لیا اور ان کے آثارِ قدیمہ کی تحقیق وتدقیق کی اور اس قدر ورق گردانی کے بعد دُنیا کے سامنے صرف اس قدر پیش کرسکے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے کُل ۳۳ر سال تک زندگی گزاری۔ دُنیا میں تشریف لائے اور پھر مصر لائے گئے۔ ان سے دو ایک معجزات صادر ہوئے، پھر اچانک غائب ہوگئے۔ پھر ۳۰ر سال کی عمر میں ظاہر ہوئے اور جنگلوں میں جانوروں کے چَرانے والوں اور دریا کے کنارے ملّاحوں اور شکاریوں کو وعظ فرماتے ہوئے دیکھے گئے۔ پھر یہودیوں کے حکام نے ان کو گرفتار کرلیا اور پھر ان کا مقدمہ روم کے قاضی القضاۃ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس نے صلیب کا حکم دے دیا۔ پھر حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو صلیب دے دی گئی۔ ظاہر ہے کہ ایک عالم گیر نظامِ حیات کے داعی کی صرف اِتنی مختصر حیات پیش کرکے وہ زندگی کا کون سا قانون مرتب کریں گے؟ کِس قدر کثیف پردے ڈال دیے گئے ہیں اُن کی حیاتِ مبارکہ پر! انھوں نے اپنی گم شدگی کی ۲۵ر سالہ زندگی کہاں اور کس صورت میں گزاری؟ سارے مسیحی صحائف خاموش ہیں، نہ صرف یہ کہ خاموش ہیں، بلکہ بعض اوقات اپنی خاموشی اور عجز

کااعتراف بھی کر لیتے ہیں، چنانچہ مشہور مسیحی مستشرق رینان نے جب بے پناہ کوشش کی اور اس کے ہاتھ تاریخی اعتبار سے کچھ نہ لگ سکا تو بالآخر زبانِ قلم سے اُس نے اِس امر کا اعتراف کر لیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی اصلی سیرت ضرور زمانے کی قبر میں دفن ہو چکی ہے۔ یہ لکھتا ہے:

ستکون عیسیٰ علیه السلام واحواله لاتزال سیرًا مکنوناً فی ضمیر الزمان لم یجر به لسانه بعد.

''عیسیٰ علیہ السّلام کے احوال زمانے کے دل میں کچھ اس طرح سے پوشیدہ ہو کر رہ گئے ہیں کہ زمانے کی زبان ان کے بعد ان کے متعلق کچھ عرض کرنے سے قاصر ہے۔''

ظاہر ہے جب کہ جس نبی کی زندگی پر اِس قدر دبیز پردے ڈال دیے گئے ہوں اور جو کچھ معلوم ہو، وہ بھی ظنِ محض ہو، یقینی اور قطعی نہ ہو تو ایسی صورت میں اُس کی سیرت کو اسوۂ حیات کیسے بنایا جاسکتا ہے! ایک الٰہی دین کا یہ عنصرِ عظیم کس قدر غیر واضح، مبہم اور نا قابلِ اعتبار نقوش ثبت کر رہا ہے! اِس سے کہیں زیادہ نا قابلِ اعتبار دوسرا عنصر کتاب ہے۔

اناجیل کی حقیقت: اناجیل اِس قدر زیادہ ہیں کہ شمار ممکن نہیں۔ جس شہر میں کوئی پوپ موجود تھا، اُس نے اپنی ایک الگ اور سب سے مختلف انجیل بنا رکھی تھی، جس کی بنیاد محض اوہام وخیالات پر تھی۔ تشتت وافتراق کا یہ عالَم کہ ہر مسیحی رہ نما دوسرے رہ نما کی انجیل کو غلط اور بے بنیاد اور کفریات کا مجموعہ قرار دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ انھوں نے ضخیم انجیل کی تلاش کے لیے ایک عالمی میٹنگ کی جو۔ مجلس نیقیہ۔ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں دُنیا کے مسیحی رہ نما آ موجود ہوئے اور قسطنطینِ اعظم [شہنشاہِ بیت المقدس] صدارت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اناجیل پر بحث طول پکڑ گئی، یہاں تک کہ معاملہ جنگ وجدال تک پہنچ گیا۔ اور ایک دوسرے پر کفر و اِرتداد اور صابی ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ آخر میں صدرِ کانفرنس قسطنطینِ اعظم نے اپنے ایک مشیرِ خاص جس کو بولس شمشاطی کے نام سے دُنیا جانتی ہے، جو پہلے یہودی تھا پھر بعض سیاسی اغراض کے تحت مسیحی

ہو گیا، نے اپنی قوت وصولت استعمال کی اور بالجبر بطریق بیت المقدس کی خود ساختہ اناجیلِ اربعہ پر دُنیا کے تمامی علماے مسیحیت سے دستخط کروالیے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اناجیل کو اس قدر تحقیق وتدقیق کے بعد دُنیا کے سامنے پیش کیا گیا، جب ان کا مطالعہ کوئی ذی فہم وہوش انسان کرتا ہے تو ان میں بعض ایسی بھی آیتیں ملتی ہیں، جو اپنے جامعین کی موت وولادت و دفن کا ذکر کرتی ہیں، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے جامعین کے سیکڑوں سال بعد معرضِ تحریر میں آئی ہیں اور الحاقی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب متیٰ، یوحنا، مرقس اور لوقا کی زندگی ہی نہ معلوم ہو تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ انجیلیں انھوں نے ہی مرتب کی ہیں؟ جامعین کی موت وحیات ودفن وتولّد کے تذکرے سے قطعِ نظر اگر صرف انجیل کے نصائح ومواعظ کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں اِس قدر تضاد، اختلاف، ٹکراؤ، **الجمع بین الضدین** نظر آتا ہے کہ کوئی بھی بالغ نظر آدمی کسی بھی صورت میں اس کو کسی نبی کی جانب منسوب کرنا تو درکنار، کسی ذی ہوش مصنف یا مؤلف کی جانب بھی منسوب نہیں کر سکتا۔ گویا انجیل کی روایات قرآنِ پاک کے مقابلے میں تو کجا، کسی ضعیف تر حدیث یا کم زور ترین تاریخی واقعے کے مقابلے میں بھی نہیں پیش کی جاسکتی ہیں، بلکہ اگر اظہارِ حقیقت سے کام لیا جائے تو یہاں تک کہنا پڑتا ہے کہ ان کی حیثیت داستانِ امیر حمزہ، قصہ قندور بندور، داستانِ بیر الالم اور الف لیلیٰ اور طلسم ہوش رُبا کی سی ہے۔ غور فرمایے کہ مسیحیت کا دوسرا عنصرِ عظیم کس قدر مفلوج اور نا قابلِ عمل ہے۔

سیرتِ نبی [عیسیٰ علیہ السلام] اور کتاب کی موجودہ حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد ان دونوں سے مرتب ہونے والا، تیسرا عنصر نظامِ اخلاق وعقائد خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ مگر تمثیلاً چند بات عرض کر دوں تا کہ آئندہ بحث کا مقدمہ آپ کے سامنے آجائے۔

عقیدۂ تثلیث: مسیحیت کا خدا کے متعلق یہ عقیدہ پورے نظامِ مذہب کی اساس ہے۔ یعنی اَب [یعنی خدا]، ابن [یعنی حضرت مسیح] اور روح القدس یہ تینوں ایک خدا ہیں۔ تینوں تین اور تینوں ایک ہیں، ان کو مسیحی۔ اقانیمِ ثلٰثہ۔ کہتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے جُدا ہونا محال ہے۔ اس عقیدے کے لیے مسیحی **الوحدة فی التثلیث و التثلیث فی**

الــــوحـــــده کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ ایسا ہے جسے انسانی عقل کسی بھی صورت میں قبول نہیں کرسکتی۔ اگر **الواحدہ فی الثلث والثلث فی الواحدہ** کو تسلیم کر لیا جائے، تو ماننا پڑے گا کہ واقعۂ صلیب میں حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے ساتھ خدا بھی مصلوب ہوا۔[**العیاذ باللّٰہ**] اور انجیل کی ایک روایت[عیسٰی علیہ السّلام حاویہ میں جلائے گئے] اِس عقیدے کے تحت گویا خدا بھی حاویہ میں جلتا رہا۔ نیز ان کا عقیدہ یہ ہے کہ واقعۂ صلیب اور حاویہ میں جلنا یہ قیامت تک کے لیے مسیحیوں کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ غور فرمایے کہ گناہ بندے کریں اور جلایا جائے نبی! کتنی نامعقول بات ہے! پھر اگر حضرت عیسٰی علیہ السّلام جزاءً جلائے گئے یا سولی دیے گئے[**العیاذ باللّٰہ من ھٰذہ العقیدۃ الفاسدہ**] تو پھر منتقمِ حقیقی کون تھا؟ جب کہ خدا خود جل رہا تھا، یا مصلوب ہو گیا[**العیاذ باللّٰہ**]- ایک تین اور تین ایک- کی غیر معقولیت اور کفارہ کے عقیدۂ باطلہ کو انسانی عقل کیوں کر تسلیم کرسکتی ہے؟

مسیحی نظامِ اخلاق: ایک کامل مذہب کے لیے ضروری ہے کہ وہ معیشتِ دنیویہ کے قوانین بھی پیش کرے، جسے نظامِ اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس حیثیت سے نبی کی ذات اور اس کے فرامین ہر فردِ بشر کے لیے دلیلِ راہ ہوتے ہیں، مگر اس حیثیت سے جب ہم عیسٰی علیہ السّلام کی اُس حیات کا تجزیہ کرتے ہیں جسے مسیحیت پیش کرتی ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ وہ حیاتِ انسانی کی کامل رہنما نہیں ہوسکتی، کیوں کہ جب ہم انسانی زندگی کے لابدی مسائل پر غور کرتے ہیں مثلاً ازدواجیت، حقوق العباد، بیع وشرا، قوانینِ عدل وانصاف تو ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ کچھ ایسے کلمات ملتے ہیں جو انسان کی معاشرتی زندگی کو فنا کردینے والے ہیں۔ مثلاً انجیل میں سختی سے فرمایا گیا ہے، وہ مسیحی نہیں ہوسکتا جو شادی کرے۔ عورت شجرِ ممنوعہ کی طرف لے جانے والی بُرائی کی جڑ ہے۔ جس نے عورت سے قربت اختیار کی وہ آسمانی حکومت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اِن احکامات سے صاف صاف واضح ہوتا ہے کہ انسان ازدواجی زندگی گزارنے کے بجائے تجرّد کی زندگی پر

قناعت کرے۔ بفرضِ محال اگر مسیحیت سارے عالم کے لیے نظامِ حیات ہے تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ تجرّد کی زندگی کی تعلیم تو نظامِ موت ہے، نظامِ حیات کہاں؟ فرض کیجیے سارا عالَم مسیحی ہوکر عورت سے کنارہ کشی کرلے تو کیا پھر انسان کی کاشت کھیتوں میں کی جائے گی اور سبزیوں کی طرح انسان بھی زمین سے اُگے گا؟ کس قدر نا قابلِ عمل ہے یہ قانونِ تجرّد! بندوں سے تعلقات کے بارے میں مسیحیت صرف اِس قدر کہتی ہے:

مَنْ ضَرَبَ عَلٰی خَدِّکَ الْاَیْمَنْ نَاذِرْ لَهٗ الْاَیْسَرْ.

کوئی اگر تمہارے داہنے رُخسار پر طمانچے مارے تو بایاں رُخسار بھی پیش کردو۔

اِس قانون کے تحت غور کیجیے کہ کیا مسیحیت کسی صورت میں بھی زمانے پر حکومت کر سکتی ہے اور کوئی ملکی نظام مرتب کرسکتی ہے؟ عدل وانصاف کے قوانین پیش کرسکتی ہے؟ ناممکن ہے، محال ہے۔

☆☆☆

میدانِ جنگ اور اخلاقِ حسنہ

میدانِ جنگ غیظ وغضب، فساد وتخریب، قتل وغارت گری کے جذبات کی سب سے بڑی آماج گاہ ہوتا ہے، چنانچہ تاریخ کی ابتدا سے لے کر آج تک اگر دُنیا کی غیر اسلامی جنگوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ میدانِ جنگ میں دو متحارب گروہ کسی بھی اخلاقی ضابطے کے پابند نہیں ہوتے اور ہر ایک فریق کا مدعا ہوتا ہے کہ دوسرے فریق کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کر دیا جائے، خواہ اس کے لیے کیسی ہی سفاکی کا مظاہرہ کیوں نہ کرنا پڑے۔

چنانچہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے چار سو سال بعد قسطنطینِ اعظم نے جب بنامِ مذہب یہودیوں پر لشکر کشی کی تو اُن کا اِس طرح قتل عام کیا کہ تاریخ آج بھی اس کے تصور سے لرزہ براندام ہے۔ بابل کا بادشاہ بخت نصر جب بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوا تو اُس نے ایک بھی انسان اور جانور کو زندہ نہیں چھوڑا اور جب اُس کے غیض وغضب کی آگ انسانوں اور حیوانوں کے خون سے بھی نہ بجھ سکی تو اُس نے دیارِ قُدس کے تمام آثار کو مٹانا شروع کر دیا اور ایک مدت تک اپنے جنگی جنون کی تسکین کے لیے وہاں کے کھیتوں اور درختوں کو جلاتا رہا۔

روم اور ایران کی جنگیں جو صدیوں کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی ہیں، قیصر وکسریٰ کے جنگی جنون کی بھیانک ترین مثالیں ہیں، بارہا کسریٰ پر قیصر نے غلبہ حاصل کیا تو ایران کی تباہی وبربادی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی اور یوں ہی جب کسریٰ نے قیصر پر فتح پائی تو عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کا قتلِ عام کیا۔

چنگیز اور ہلاکو کی فوجوں نے جب بعض اسلامی شہروں کو تاخت وتاراج کیا تو گھروں میں محصور مسلمانوں نے اپنے ننھے بچوں کو اِس امید پر التجاے رحم کرنے کے لیے بھیجا کہ بے قصور اور بے گناہ بچوں پر دستِ ظلم نہ اُٹھ سکے گا۔ آخر چنگیزیوں کے گھروں میں بھی تو

بچے ہوں گے، مگر ظالم فوجی افسروں نے اپنے مسلح فوجیوں کو حکم دیا کہ ان بچوں کو گھوڑوں کے سموں سے روند دیا جائے۔

یہ تو بخت نصر، قسطنطین، قیصر وکسریٰ اور چنگیز وہلاکو کے دور کی مثالیں تھیں، لیکن آج کا دور تو ان اَدوارِ گذشتہ سے بھی زیادہ بھیانک نقشۂ جنگ پیش کر رہا ہے۔ پہلے تو جنگ میدانِ جنگ میں ہوتی تھی اور دو متحارب فوجیں آمنے سامنے ہو کر نبرد آزما ہوا کرتی تھیں، مگر آج کے نقشۂ جنگ کو ترتیب دینے والے لوگ سب سے پہلے آبادیوں، فیکٹریوں، صنعتی اور تعلیمی اداروں، دیگر اقتصادی اور فلاحی مراکز کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں، تاکہ مقابل قوم کی اقتصادی اعتبار سے کمر ٹوٹ جائے اور وہ بہت دنوں تک زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا رہے۔ آج کے انسان نے اپنی تخریبی توانائیوں کو بے جان ہتھیاروں کے حوالے کر کے پوری دُنیا کو موت کے دروازے پر پہنچا دیا ہے، اور کسی بھی وقت انسان کی جنگی وحشت کی نمود دُنیا کے اوپر ہزاروں ہیروشیما اور ناگاساکی جنم دے سکتی ہے۔

چنانچہ آج کے دَور کی ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ دُنیا کے سامنے اسلامی جہاد کی اُن اعلیٰ ترین اخلاقی قدروں کو پیش کیا جائے جن کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد حالتِ جنگ میں بھی انسان جذبات سے مغلوب نہ ہو، بلکہ ان کے سامنے اس کا وہ عظیم نصب العین ہو جس کے لیے انہوں نے جنگ کی ناگزیر راہ اختیار کی ہے۔ آج ضرورت ہے کہ دُنیا کی جنگ جُو طاقتوں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ جنگوں سے - **فساد فی الارض** - کی بجائے - **اصلاح فی الارض** - اور ظلم کے بجائے استیصالِ ظلم، غصبِ حقوق کے بجائے ظالم سے مظلوم کے حقوق دلانے کا کام لیں۔ اسلام میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے مجاہدین کا یہ مزاج بنا دیتا ہے کہ ان سے ظلم سرزد ہی نہ ہو سکے خواہ وہ کتنے ہی غصے کی حالت میں کیوں نہ ہوں، وہ انھیں اس بات کی ہدایت کرتا کہ حالتِ غیظ وغضب میں بھی انسانی حقوق کو ملحوظ رکھیں۔ اسلام ان کے ذہن میں یہ بٹھا دیتا ہے کہ رحم وکرم وعفو ودرگذر ہی انسان کو خدا کے قریب کر سکتے ہیں، اور ظلم خدا کی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور چوں کہ ایک مومن میدانِ جنگ

میں بھی رضائے الٰہی تلاش کرنے کے لیے نکلتا ہے، اِس لیے کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھا سکتا جس میں اللہ کی ناراضی کا خطرہ ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار رحم اور محبت کی تاکید فرمائی ہے:

[۱] ومن لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منّا.

جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور جو ہمارے بڑوں کا ادب نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

[۲] ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء.

زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

[۳] ان اللّٰہ رفیق یحب الرفق.

اللہ نرمی فرمانے والا ہے اور نرمی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

چوں کہ اسلام کی اساس ہی رحم و محبت پر رکھی گئی ہے اِس لیے اسلام جنگ کی اُس وقت اجازت دیتا ہے جب کہ دُنیا کی اصلاح اور مظلوم کی دادرَسی کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہ رہ جائے۔ چنانچہ قرآنِ عظیم مقصدِ جہاد کی وضاحت اِن الفاظ میں فرماتا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰہَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ.[البقرۃ: آیت ۲۵۱]

اگر اللہ بعض کے ظلم کو بعض سے دفع نہ فرماتا تو زمین پر فساد برپا ہوجاتا لیکن اللہ تمام عالَم پر بہت زیادہ فضل فرمانے والا ہے۔

میدانِ جنگ میں باطل قوتوں کی سرکوبی اور ظلم کا استیصال مظلوم دُنیا کے لیے فضلِ الٰہی ہے اور یہ فضل اُس وقت تک فضل رہے گا جب تک کہ مظلوم ظالم سے اپنے حقوقِ زندگی حاصل کرنے کے بعد اُنھیں راہوں پر نہ چلنے لگے جن پر چل کر ظالم قوت اپنی پاداش کو پہنچی ہے۔

اسلام کی اعلیٰ ترین ہدایات سے ہٹ کر جب بھی جنگ ہوگی ہوسکتا ہے کہ ابتداءً اُس

کا نصبُ العین مظلوم کی دادرسی ہی رہی ہو، لیکن جب فتح حاصل ہوجاتی ہے تو وہ بھی وہی کردار پیش کرتی ہے جو اُس کے سامنے ظالم قوم پیش کرتی رہی ہے۔ اس طرح سے ظلم و جبر کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہوجاتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اسلام نے سختی سے حکم دیا ہے کہ حالتِ جنگ میں عدل وانصاف کو برقرار رکھا جائے۔ چنانچہ قرآنِ عظیم ارشاد فرماتا ہے:

لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ.[البقرۃ: آیت ۱۹۰]

حد سے نہ گزرو بے شک اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو ناپسند فرماتا ہے۔

لَا یَجْرِ مَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی.

[المآئدۃ: آیت ۸]

کسی قوم سے انتقامانہ جذبات تم کو عدل سے باز نہ رکھیں، انصاف کرو اس لیے کہ انصاف تقویٰ سے قریب تر ہے۔

جنگ کے سلسلے میں اسلام نے جو اخلاقی پابندیاں بہ صورتِ قانون عائد فرمائی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

[۱] اعلانِ جنگ کے بغیر دُشمن پر حملہ نہ کیا جائے۔

[۲] شکست خوردہ دُشمن کا تعاقب نہ کیا جائے۔

[۳] ہتھیار ڈالنے والوں پر تلوار نہ اُٹھائی جائے۔

[۴] بچوں، بوڑھوں، عورتوں، عبادت گذاروں، خانقاہ نشینوں، راہبوں اور تارکُ الدُّنیا افراد سے تعرض نہ کیا جائے۔

[۵] قیدیوں کے ساتھ نرمی اور محبت کا برتاؤ کیا جائے۔

[۶] زخمیوں کو ہر طرح کی طبّی امداد بہم پہنچائی جائے۔

[۷] زخمی اور بیمار قیدیوں سے کام نہ لیا جائے۔

[۸] سرسبز درختوں کو نہ کاٹا جائے، عمارتوں کو نہ ڈھایا جائے۔

[۹] افادۂ عوام کے وسائل کو غارت نہ کیا جائے۔

اسلام مجاہدین کو حکم دیتا ہے کہ جیسے ہی **فساد فی الارض** پر قابو پالیا جائے اور مخالف قوتیں سلامتی کے لیے جُھک جائیں تو پھر قتال اور جہاد کو باقی رکھنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ قرآنِ عظیم کا ارشادِ عالی ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ. [الانفال: آیت ۶۱]

اسلام مجاہدین کے اندر یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں ہر کام **خالصتاً لوجہ اللّٰہ** کریں۔ جملہ عبادات کی طرح جہاد کو بھی ہر طرح کے غیر اسلامی جذبات کی آمیزش سے پاک رکھیں، حالتِ جنگ میں بھی ان کا دل خشیتِ الٰہی سے ایک لمحہ کے لیے خالی نہ ہو، اور جنگ افرادِ انسانی کے خلاف نہ کریں بلکہ اُس باطل ماحول کے خلاف کریں اور اُس باطل نظام کو مٹائیں جس کو لوگوں نے قبول کرلیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی مجاہدین کے صبر و تحمل کی ایسی کثیر مثالیں ملتی ہیں کہ اسلام کے سپاہی کی تلوار بلند ہے اور قریب ہے کہ مدِ مقابل کا لاشہ زمین پر تڑپنے لگے کہ اچانک اس نے تلوار جھکالی اسی لمحہ مجاہد فی سبیل اللہ نے بھی تلوار نیام میں کرلی، جذبات پر کنٹرول کی یہ اعلیٰ ترین مثال ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک کافر سے برسرِ پیکار ہیں؛ متعدد خطرناک واروں کو اپنی ڈھال پر روکنے کے بعد اُسے کمر سے اُٹھا کر زمین پر ڈال دیتے ہیں اور سینے پر بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ اس کا سرتن سے جُدا کردیں کہ وہ شدتِ غیظ وغضب میں شیرِ خدا کے چہرۂ منوّر پر تھوک دیتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوراً اُس سے الگ ہوجاتے ہیں، وہ اُٹھ کر کھڑا ہوجاتا ہے، لیکن تلوار اُٹھا کر حملہ کرنے کے بجائے وہ پوچھتا ہے کہ: آپ نے مجھے مغلوب کرکے چھوڑ کیوں دیا؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ میں نے تلوار اللہ کے لیے اُٹھائی تھی اور میں نے تمہیں اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے مغلوب کیا تھا، لیکن جب تم نے میرے ساتھ ایک گستاخی کی تو مجھے غصہ آگیا، میں فوراً تمہیں چھوڑ کر الگ ہوگیا اِس

لیے کہ اس حالت میں اگر تمہیں قتل کرتا تو رضاے الٰہی کی تعمیل میں اپنے جذبۂ غضب کی تسکین کی خواہش شامل ہوجاتی، ایسی حالت میں میرا یہ کام **خالصتاً لوجہ اللّٰہ** نہ ہوتا۔

فوجی معاہدے ہر دور میں ہوتے رہے ہیں، لیکن ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ دو حلیف طاقتیں اس میں حق و باطل کا امتیاز کیے بغیر ایک دوسرے کا ساتھ دیتی ہیں۔ ایک ملک خواہ کتنا ہی جارح کیوں نہ ہو؛ کوئی دوسرا ملک اگر اُس کا حلیف ہے تو اُس کے ظلم و جارحیت میں بھی اُس کا ساتھ دے گا۔ اس کے برعکس اسلام صرف مظلوم کا ساتھ دینے کی اجازت دیتا ہے، ظلم کا نہیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اُنْصر اخاکَ ظالِمًا کَانَ اَوْ مَظلومًا.

اپنے بھائی کی مدد کرو، وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

صحابۂ کرام نے عرض کی یارسول اللہ! ظالم کی مدد کس طرح کی جائے۔ ارشاد فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اُس کو ظلم سے باز رکھو۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ اسلام دفاع، اصلاح، استیصالِ ظلم کے لیے جنگ کی اجازت دیتا ہے، مگر حالتِ جنگ میں بھی کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اپنے اندر پوشیدہ بہیمانہ طاقتوں کو جنگ کی غضب ناکیوں میں استعمال کرے، بلکہ جنگ کے لیے بھی اخلاقی ضابطے متعین فرمادیے ہیں، تاکہ جوش وغضب میں انسان انسانی قدروں کو پامال نہ کرے۔ اے کاش! آج کی مہذب دُنیا اسلام کے اِن بلند ترین اصولوں کو پیشِ نظر رکھتی۔

☆☆☆

باب دوم

بزمِ نور

مطلع حجاز پر آفتابِ رسالت کی جلوہ گری

ربیع النور اپنی جملہ تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو چکا ہے۔ اسی ماہِ مقدس کی ۱۲؍تاریخ کو مطلعِ فاران پر وہ آفتابِ رسالت جلوہ فگن ہوا تھا جس نے اس ظلمت کدۂ عالَم کو روشن و منوّر فرما دیا۔ جس نے اوہام وخرافات کی تاریکیوں کو ایمان ویقین کے نور سے بدل دیا، جس نے عالَمِ انسانی کو عدل وانصاف کا حقیقی شعور عطا فرمایا اور انسانوں کو انسانیت کے احترام کی تعلیم دی۔ اسی ماہِ مقدس کی بدولت انسان ان تمام اقدارِ حیات سے مشرف ہوا جنھیں اختیار کر کے وہ اس سرزمین پر نیابتِ الٰہی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ رحمتِ عالَم صلی اللہ علیہ وسلم نے غافل اور گم کردہ راہ انسانوں کو ان کی منزل کا پتا بتایا، انہیں لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِی اٰدَمَ کے تاجِ عظمت سے نوازا اور انہیں احسنِ تقویم کی خلعتِ زیبا سے سرفراز فرمایا، انہیں اسفل السافلین کی پستیوں سے نکال کر خلافتِ ارضی کی رفعتوں پر پہنچایا، انہیں وحشت کے ماحول سے نکال کر عدل وانصاف کی زندگی عطا فرمائی۔

سیّدنا مسیح علیہ السّلام کے رفعِ آسمانی کے بعد سے سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تک ۵۷۰؍سال کا زمانہ، تاریک ترین زمانہ تھا۔ اس طویل عرصے میں انسان اپنی اخلاقی پستیوں کی بدترین سطح پر پہنچ چکا تھا۔ اس پورے عرصے میں دُنیا میں کوئی نبی یا رسول جلوہ گر نہ ہوا، جو لوگوں کی اخلاقی اور روحانی رہ نمائی کرتا۔ دُنیا میں کوئی ایسی حکومت قائم نہ ہوئی جو عدل وانصاف کی علَم بردار ہوتی، اور نہ کوئی ایسا معاشرہ قائم ہوا جو انسانی قدروں کا آئینہ دار ہوتا۔ اس تاریک ترین دور میں ہر طرف ظلم وجور کی حکم رانی تھی۔ دُنیا کی متمدن قومیں مِٹ چکی تھیں۔ انسانوں کے خود ساختہ قوانین نے کم زوروں سے زندگی کے تمام حقوق سلب کر لیے تھے۔ یونان اور روم میں صرف طاقت ور کو زندہ رہنے کا حق دیا جاتا تھا۔ برِصغیر میں زندہ انسانوں کو ظلم کی چِتاؤں پر جلایا جاتا تھا، اور یورپ کے بہت سے علاقوں میں تڑپتی ہوئی لاشوں کو رقصِ بسمل کے نام سے پیش کیا جاتا تھا۔ مصر میں دریائے نیل کے کنارے نیل پرستی کے نام پر گلستانِ حیات کے نوشگفتہ پھولوں کو مَسل

دیا جاتا تھا، اور حجاز میں زندہ بچیوں کو دَرگور کر دیا جاتا تھا۔ پوری دُنیا مظالم سے بھری ہوئی تھی، مگر ان مظالم کے خلاف ایک بھی انسان کوئی مؤثر صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ ان حالات میں کائنات کا اجتماعی ضمیر خلاقِ کائنات کی بارگاہ میں التجا کر رہا تھا کہ:

اے ربِ قدوس! اس زمین پر ایک ایسی ہستی کو مبعوث فرما جو اسے ظلم وستم، جور و وحشت، شرک اور جہالت کی نجاستوں سے پاک فرما کر اسے معمورۂ امن وسکون بنا دے۔ خدائے قدوس نے یہ التجا سُن لی، اور ۱۲/ربیع الاوّل کو دوشنبہ کے دن صبحِ صادق کے وقت رسالت کے اس آفتابِ عالم تاب کو جلوہ گر فرمایا، جو حقیقی طور پر کائنات کا نجات دہندہ اور امنِ عالم کا ضامن ہے۔ خدائے قدیر نے اس نورِ کامل کی تشریف آوری کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا:

قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ. [المآئدۃ: آیت ۱۵]

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب۔

اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيۡرًا. [الاحزاب: آیت ۴۵-۴۶]

بے شک ہم نے تمہیں بھیجا حاضر ناظر اور خوش خبری دیتا اور ڈر سناتا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلاتا اور چمکا دینے والا آفتاب۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ. [الانبیاء: آیت ۱۰۷]

اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔

پورا عالمِ اسلام اللہ رب العزت کے انہیں فرامینِ مقدسہ کو دُہرانے کے لیے ماہِ ربیع الاوّل میں -جشنِ میلادُ النبی- منعقد کرتا ہے۔ مصر و شام، عراق و ایران، ہند و پاک، ترکی و قبرص، نائجیریا و لیبیا، سوڈان و یوگوسلاویہ؛ الغرض جہاں جہاں بھی مسلمان بستے ہیں، جشنِ عیدِ میلادُ النبی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ میلادُ النبی کی ان محافل میں قرآنِ عظیم کی آیات پڑھی جاتی ہیں، نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پیش کی جاتی ہے، سیرتِ رسول بیان کی جاتی ہے اور صلوٰۃ وسلام ہوتا ہے۔ صدیوں سے دُنیا کے بیش تر ملکوں میں سیرتِ رسول اور پیغامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر خاص و عام تک پہنچانے کا یہ ایک منظم اور باضابطہ طریقہ ہے۔ آپ

اگر برِصغیر ہند و پاک کے اُن علاقوں میں تشریف لے جائیں جہاں ہنوز علم کی روشنی نہیں پہنچی ہے تو وہاں بھی عیدِ میلادُ النبی کی برکات کا مشاہدہ کر سکیں گے۔ مسلمانوں کے اندر شریعت سے وابستگی، عشقِ رسول اور دینِ اسلام سے فِدا کاری کی حد تک تعلق، سب کچھ عیدِ میلادُ النبی کی برکتوں کا ظہور ہے۔

جشنِ میلادُ النبی کے سلسلے میں حکومتِ سعودیہ عربیہ کا منفی کردار: جہاں ایک طرف پوری دُنیا میں جشنِ میلادُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام کیا جاتا ہے وہیں دُنیا کی ایک محسوس اور واضح اقلیت کے نمائندے میلادُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تقریب کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر دُنیا کو ان محافل سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور ان تقاریب پر -شرک اور بدعت- کا فتویٰ صادر کر کے مسلمانوں کے ذہن کو پراگندہ اور ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور جب بھی عیدِ میلادُ النبی کا زمانہ آتا ہے تو مسلمانوں کے گھروں میں ایسے کتابچے پہنچائے جاتے ہیں جن میں غیر علمی اور غیر منطقی مواد موجود ہوتا ہے۔ مگر اس کو علم و دانش کا نام دے کر مسلمانوں کو فریب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ چند سالوں میں مفتیِ وہابیت ابنِ باز کے فتاویٰ تقسیم کیے جاتے ہیں، اور اب اس سال ابوبکر جابر الجزائری کا کتابچہ گھر گھر تقسیم کیا جارہا ہے۔ ظلم کی انتہا یہ ہے کہ حجازِ مقدس سے آنے والے حجاج کرام کو یہ کتابچہ سعودیہ عربیہ کی جانب سے تحفے میں دیا جاتا ہے اور گنبدِ خضریٰ کے انوار سے فیض یاب ہو کر آنے والے حجاج کو رسول دُشمنی کی یہ جیتی جاگتی دستاویز بطورِ تبرک پیش کی جاتی ہے۔ سُنّی دُنیا میں ان کتابچوں کا شدید ردِ عمل ہوتا ہے اور محافلِ میلاد و جلسہ ہائے سیرت میں ان کی تردید کی جاتی ہے اور لوگوں کو اس کے فریب سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ نتیجتاً مسلمانوں کی جو توانائیاں کفر و شرک، الحاد و مغربیت کے خلاف صرف ہونی چاہئیں وہ تردیدِ وہابیت کی نذر ہو جاتی ہیں۔ سعودی حکومت نے پوری دُنیا کے اسلامی لٹریچر کے لیے اپنی نام نہاد حکومت کے دروازے بند کر رکھے ہیں، مگر وہابیت کے گم راہ کُن لٹریچر کو عام کرنے کے لیے حج پاک کے موقع پر زائرینِ حرم کی سادہ

لوحی کو شکار کیا جاتا ہے۔ وہ آبِ شفا زم زم کے ساتھ بدعقیدگی کا یہ زہر بھی ساتھ لاتے ہیں۔ یہ ہماری وسعتِ ظرفی کہ ہم اس طرح کے لٹریچر کے خلاف کوئی متحدہ آواز نہیں بلند کر رہے ہیں، اس لیے کہ سعودی عرب کے ایوانِ اقتدار سے جس اَمر کی مخالفت کی جائے گی مسلمانانِ عالَم اُسے ضرور کریں گے۔

کاش! سعودی عرب کے اندر بھی یہ اخلاقی جرأت ہوتی اور اہلِ سنت کے ۱۴ر سو سالہ مذہبی لٹریچر کو اپنی حدودِ مملکت میں درآمد کی اجازت دیتا تو سعودی عوام کے سامنے تصویر کے دونوں رُخ ہوتے، اور حق و باطل کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی۔ آج برطانیہ کی نوجوان نسل مغربیت، الحاد، بے دینی، اِرتداد اور اسلامی اقدار سے انحراف کے راستے پر گام زَن ہے۔ کیا حکومتِ سعودیہ عربیہ کو کبھی توفیق ہوئی کہ وہ ان برائیوں کے خلاف لٹریچر تیار کرواکے تقسیم کرتی؟ کیا ان تمام مفاسد کے مقابلے میں اُسے صرف محافلِ میلاد ہی ایسا مفسدہ نظر آتی ہیں جس کے خلاف وہ پٹرو ڈالر کے تمام وسائل استعمال کر رہی ہے؟

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ماہِ ستمبر میں میلادُ النبی کے خلاف لٹریچر تقسیم کیا جا رہا ہے، اور اسی ماہ میں سعودی حکومت کا جشنِ تاسیس انتہائی دُھوم دھام سے منایا جا رہا ہے۔ میلادُ النبی۔ جشنِ تاسیسِ اسلام۔ ہے مگر اس کی مخالفت کرنے والے اُس حکومت کا جشنِ تاسیس مناتے ہیں، جس نے خلافتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کر دیا اور حکومتِ ترکی کے خلاف بغاوت کر کے ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈالی جس کے عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی حجازِ مقدس میں مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا، مزاراتِ مقدسہ کا انہدام عمل میں لایا گیا اور مآثرِ شرعیہ وشعائرِ اسلامیہ کی توہین کی گئی۔ جس کے حکم رانوں نے اپنی ہوسِ اقتدار پرستی میں ڈوب کر سرزمینِ حجاز کو اقوامِ مغرب کا باج گذار بنا دیا۔ جنھوں نے اسلام کے تصورِ خلافت سے انحراف کر کے ملوکیت کو زندہ کیا اور اسلام و عالَمِ اسلام کی مقدس امانت کو اپنی جاگیر قرار دے دیا۔ ایسی حکومت اور اس کے مفتیانِ شرع کے نزدیک عیدِ میلادُ النبی تو شرک و بدعت ہے مگر سعودی عرب کا جشنِ تاسیس عین شریعت ہے ؏

بریں عقل و دانش بباید گریست

معراجِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ معراج اسلامی تاریخ کا اہم ترین واقعہ، معجزاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک اہم ترین معجزہ اور خصائصِ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک اہم ترین خصوصیت ہے۔ اس سفرِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قُرب سے نوازا، آسمان و زمین کی سیر کرائی، جنت و دوزخ، لوح و قلم، عرش و کرسی اور بے شمار آیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرایا، تا کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جن حقائق اور اُمورِ غیبیہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں اُن کو بچشمِ خود ملاحظہ فرما لیں۔ اُمّتِ مسلمہ کو جن راہوں سے گزرنے کی اطلاع دیتے ہیں اُن گزرگاہوں سے پہلے خود ان کا گزر ہو جائے تا کہ لوگ علمِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ، نگہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائیں اور آخرت کے تمام اُمور کی حیثیت صرف خبر ہی کی نہ ہو، بلکہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ اور ان کا سفرِ معراج ان تمام اُمورِ غیبیہ پر جن کی اطلاع بذریعۂ وحی دی گئی تھی، گواہ ہو جائے۔

رحمتِ عالَم صلی اللہ علیہ وسلم اُس دور میں جلوہ گر ہوئے جب کہ تاریخ انسانی ایک نئے باب کا آغاز کرنے والی تھی، جہل کا لباس اُتارنے والی تھی اور علم و تحقیق کی راہوں میں قدم رکھنے والی تھی۔ انبیاے کرام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پروردگارِ عالَم جب کبھی کسی نبی کو کسی قوم کی جانب مبعوث فرماتا ہے تو اس کو ایسے معجزاتِ باہرہ سے نوازتا ہے جن کے سامنے اُس قوم کو اعترافِ شکست کرنا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ سحر و طلسم کے دَور میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو عصاے کلیمی سے نوازا گیا، اور طب و حکمت کے دور میں جناب عیسیٰ علیہ السّلام کو مسیحا بنا کر مبعوث کیا گیا، تا کہ دُنیا کا کوئی علم، کوئی فلسفہ نبی مبعوث کی مقدس عظمت کو چیلنج نہ کر سکے۔

چوں کہ رسولِ گرامی قدر صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر مبعوث کیا گیا ہے،

قیامت تک ان کے بعد کوئی اور نبی تشریف لانے والا نہیں ہے۔ اس لیے ان کی ذاتِ اقدس کو مجموعۂ صفاتِ جلیلہ بنا دیا گیا۔ وہ تمام معجزات جو دوسرے انبیائے کرام کو الگ الگ عطا ہوئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اطہر میں جمع فرما دیے گئے۔ دوسرے الفاظ میں انبیائے سابقین علیہم السّلام کو معجزات دے کر بھیجا گیا تھا، مگر رحمتِ عالَم صلی اللہ علیہ وسلم کو سرتاپا معجزہ بنا کر بھیجا گیا۔

حُسنِ یُوسف، دمِ عیسٰی یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور یہی وجہ ہے کہ قیامت تک جتنی بھی ایسی طاقتیں عالَمِ وجود میں آنے والی تھیں جن کی بنا پر انسان خدا کی بندگی کا انکار کر دیتا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو ہر ایک کا جواب بنا کر مبعوث کیا گیا تا کہ انسان کسی بھی دور میں ان کی رسالت سے انحراف نہ کر سکے۔ خدائے شہید و بصیر کے علمِ پاک میں یہ بات ازل ہی سے تھی کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت ہی میں لوگ چاند پر کمندیں ڈالیں گے، سیاروں سے آنکھ مچولی کھیلیں گے، کائنات کے پورے نظامِ کشش سے متعارف ہو کر سیاروں میں زندگی کے امکانات پر غور کریں گے۔ اسی لیے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے مقدس سفر میں عالَمِ بالا کی سیر کرائی گئی تا کہ بیسویں صدی یا اس کے بعد کا ترقی یافتہ انسان اگر خلاؤں میں پرواز کر کے کہکشاؤں کے رازہائے سربستہ معلوم کرے اور سیاروں میں زندگی بسر کرنے کے اقدامات کرے تو اسے آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ پا پہلے ہی سے دکھائی دیں اور حدیثِ معراج ان کو آگاہ کرے کہ تم جن منزلوں کی گردِ راہ ہو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کاروانِ بہار اب سے چودہ سو برس پہلے گزر چکا ہے۔

کہکشاں جلوہ فشاں ہے کہ اسی رستے سے
ہونے والا ہے محمد کا گزر آج کی رات

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو اُسی منصبِ بلند کا حق دار قرار دیا جس

سے وہ صدیوں پہلے اپنی بداعمالیوں کی بنیاد پر اُتار دیا گیا تھا اور اس نے انبیائے کرام کی مقدس تعلیمات سے گریز کر کے خود کو اسفل السّافلین کی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ انسان کی باعظمت پیشانی مظاہرِ فطرت کے سامنے جُھکی ہوئی تھی۔ زمین کے ذرّوں سے لے کر آسمان کے ستاروں تک ہر شے اس کا معبود بن چکی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندگی کا حقیقی مفہوم دُنیا کے سامنے پیش کیا اور ارشاد فرمایا کہ: تمہارا معبود صرف خدائے برتر و بالا ہے، جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ انہوں نے انسانوں کو ایک سجدے کا پابند بنا کر ہزاروں سجدوں سے نجات دلا دی۔

وہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

انہوں نے اپنے سفرِ معراج کے ذریعے انسانوں کو یقین دلایا کہ اس پوری کائنات میں انسان سب سے بلند ہے۔ وہ خلیفۃ اللّٰہ فی الارض ہے اور عالَمِ امکان اس ممکن الوجود کی گردِ راہ ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰی سے مجھے
کہ عالَمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

معراجِ پاک کے مقدس سفر میں لباسِ بشری میں تشریف لے جا کر آپ نے نوعِ بشر کو عزت و سربلندی کے اُس مقامِ بلند تک پہنچا دیا کہ بغیر آپ کے انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

دلیلِ عظمتِ انسانیت ہیں
محمد مصطفٰی انسانِ کامل

آپ نے اپنے سفرِ معراج میں عبدیتِ کاملہ کے اس ارفع اور بلند ترین تصور سے ذہنِ انسانی کو آراستہ کیا جس کے پیشِ نظر انسان خدائے قدیر و جبار کی ہیبت و جلال کے سامنے ہمیشہ سرنگوں رہے گا۔ جنابِ عیسٰی علیہ السّلام کے دستِ پاک سے چند مریضوں کو

شفایاب ہوتے ہوئے اور چند مُردوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھ کر ایک طبقے نے انہیں خدا بنالیا تھا۔ مگر حریمِ نور میں خرام ناز فرمانے والے مقام قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی پر سرفراز ہونے والے جلوت کدۂ محبوب میں اپنے محبوبِ حقیقی کو سر کی آنکھوں سے دیکھنے والے رسول عالی وقار صلی اللہ علیہ وسلم وہاں بھی بہ ہمہ صفت محبوب بشانِ بندگی ہی تشریف لے گئے۔

چنانچہ قرآنِ عظیم نے اس سفرِ عظیم کی حکایت ان الفاظ میں کی ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا۔ [بنی اسرائیل: آیت ۱]

''پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرایا اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے لے کر مسجد اقصیٰ تک۔''

ثابت ہوا کہ یہ کائناتِ بلند و رفیع جس کے سفرِ عظمت کی گرد راہ ہے جب وہ بھی بندے ہی ہیں تو پھر کائنات کی کوئی اور شے معبود کیوں کر ہو سکتی ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد بنا کر مبعوث فرمایا گیا ہے اور ان کے فرائض نبوت میں سے ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ جملہ انبیائے سابقین کی اُمّتوں نیز اپنی اُمّت کے اعمال و کردار کی گواہی دیں۔ چنانچہ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ [الاحزاب: آیت ۴۵۔۴۶]

ہم نے آپ کو شاہد، مبشّر، نذیر، داعی الی اللہ اور سراجِ منیر بنا کر بھیجا۔

ان کے منصبِ جلیل کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام انبیا کو اور ان کی اُمّتوں کو بچشمِ خود ملاحظہ فرمالیں، ان کے احوال کا جائزہ لے لیں تا کہ خدائے وحدہ قدوس کی بارگاہ میں گواہی دے سکیں۔ چنانچہ معراجِ مقدس کے سفر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السّلام تا حضرت عیسٰی علیہ السّلام تمام انبیائے کرام سے ملاقات کی، اُن کی اُمّتوں اور ان کے جملہ اعمال کا مشاہدہ فرمایا۔

سیّدِ عالَم صلی اللہ علیہ وسلم کو امام الاوّلین والآخرین بنا کر مبعوث فرمایا گیا تھا۔ زمانے کے اعتبار سے تو سب کے بعد میں تشریف لائے لیکن اپنے منصب و مرتبہ کے اعتبار سے آپ تمام انبیا کے سردار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ واجب الوجود جل جلالہ نے شاہ کارِ عالَمِ ایجاد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روزِ ازل ہی تمام انبیائے کرام سے وعدہ لیا تھا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ۔

[آل عمران: آیت ۸۱]

''اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا؟ سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔''

یہی وہ میثاقِ ازلی تھا جس کے پابند تمام انبیائے کرام تھے۔ چنانچہ شبِ معراج مسجدِ اقصیٰ میں تمام انبیائے کرام؛ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کے لیے موجود تھے اور جب نماز کا وقت آیا تو انبیائے کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا امام بنایا، تا کہ ان کا سیّد المرسلین اور امام الانبیاء ہونا ایک امرِ مشاہد بن جائے اور کائنات مشاہدہ کر لے کہ سب سے بعد میں تشریف لانے والے آج سب رسولوں کے امام ہیں۔

جملہ انبیائے کرام کے فرائضِ نبوت میں سے ایک فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دیں اور اپنے اپنے عصرِ نبوت میں اپنی اُمّتوں کو نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے عصرِ رحمت کے بارے میں بتائیں۔ چنانچہ قرآنِ عظیم حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے مقصدِ بعثت کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًا م بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ .

[الصّف: آیت ۶]

''اور جب فرمایا عیسٰی ابن مریم علیہ السّلام نے اے بنی اسرائیل میں تمہاری جانب اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں میں اس توریت کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے ہاتھوں میں ہے اور اُس رسول کی بشارت دے رہا ہوں جو میرے بعد آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا۔''

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے فرائضِ نبوت میں دو اہم ترین فرض تھے؛ اوّل توریت کی تصدیق اور دوم سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت تاکہ دُنیا ان کی آمد سے پہلے ہی ان کے لیے دیدۂ انتظار بنی رہے اور جب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو لوگ ان کے روئے زیبا کو توریت وانجیل کے آئینے میں دیکھ کر ایمان لائیں۔ دوسرے لفظوں میں تمام انبیائے کرام کی ذمے داری تھی کہ کائناتِ انسانی کو رسولِ عالَم پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں پہنچا دیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب یہ تھا کہ وہ کائنات کو خدائے وحدہٗ قدوس کے قُربِ خاص میں لے جائیں۔ اسی لیے صرف رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو معراج کرائی گئی کہ بالآخر کائنات انہیں کے آستانے سے خدائے پاک کے جلووں سے آشنا ہوگی۔

جب خدائے قدیر کو منظور ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو توریت جیسی عظیم الشّان کتابِ زندگی عطا فرمائے تو اس نے انہیں کوہِ طور پر جانے کا حکم دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے خدا کے حضور میں کلامِ خدا کے ساتھ جمالِ خداوندی کی بھی تمنا کی مگر ان کے عشق، ان کے درد اور ان کے سوزِ دروں کے جواب میں ہمیشہ لَنْ تَرَانِي کا مقدس جملہ سنائی دیتا رہا لیکن فخرِ انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کو رب العزت نے اس عزت وشان کے ساتھ اپنے

قربِ خاص سے نوازا کہ جناب جبریل بارگاہِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے۔ عرش سے لے کر فرش تک ملائکہ قطار اندر قطار پیشوائی کے لیے ایستادہ ہوئے۔ آدم علیہ السّلام سے لے کر جناب عیسٰی علیہ السّلام تک تمام انبیائے کرام اپنے قلوبِ مبارکہ میں اشتیاقِ ملاقات لیے سراپا انتظار بنے رہے۔ آسمانوں کی رفعتوں کو صدیوں کے انتظار کے بعد نبیِ رحمت پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم چومنے کا موقع ملا اور اس طرح سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کون ومکاں کی وسعتوں کو بھی معراج ملی ؎

تیری معراج محمد تو ہے قُربِ معبود
میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

اور جب واپس تشریف لائے تو اپنی گنہ گار اُمّت کو بھی لذتِ معراج اور کیفِ قُربِ خداوندی سے آشنا کرنے کے لیے نماز کا تحفہ لے کر آئے۔

اَلصَّلٰوۃُ مِعرَاجُ الْمُؤمِنِین
نماز مومنوں کی معراج ہے۔

☆☆☆

باب سوم

فکرِ مغرب اور ہماری ذمے داریاں

یورپ میں مسلمانوں کی نئی نسل کا مستقبل

پورے برِاعظم یورپ میں مسلمانوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے۔ بیش تر ممالک میں تعداد کے اعتبار سے مسلمان دوسرے نمبر پر ہیں۔ برطانیہ، فرانس، مغربی جرمنی، ہالینڈ، بلجیم، ناروے، ڈنمارک، بلغاریہ، اسپین، جبرالٹر، یوگوسلاویہ وغیرہ میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ ان ملکوں میں بیش تر مسلمان ہندوستان، پاکستان، فرانس، انڈونیشیا، ترکی، قبرص، شام، الجزائر، تیونس اور سرینام سے آ کر آباد ہوئے ہیں۔ یورپ میں مسلمان ابتداءً حصولِ معاش کے لیے آئے تھے لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ انہیں ملکوں کے ہو رہے اور اب یہاں ان کی دوسری اور تیسری نسل پروان چڑھ رہی ہے۔

یورپ میں مستقلاً آباد ہونے والے مسلمانوں نے اپنے دینی فرائض کی ادائیگی اور اپنے مذہبی تشخّص کو باقی رکھنے کے لیے مساجد قائم کیں اور ان میں مذہبی تعلیم کے لیے جُز وقتی مدارس کا اِجرا کیا۔ اِس وقت پورے یورپ میں ہزاروں کی تعداد میں مساجد اور مدارس موجود ہیں۔ یورپ کے تمام ملکوں میں مقامی نومسلموں کی ایک معتد بہ تعداد بھی موجود ہے۔ ان مسلمانوں نے اسلام کا ازخود مطالعہ کیا ہے اور بلا کسی غرض، جبر یا تحریص کے مسلمان ہو گئے۔ یہ مسلمان مسلم ممالک سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں سے زیادہ حساس، متحرک اور فعال ہیں۔ چوں کہ انہوں نے اِسلام کی حقانیت کا مطالعہ کیا ہے، اور وہ جب موجودہ دور کو اسلام کی برکات سے محروم دیکھتے ہیں تو اُنہیں بے پناہ غم ہوتا ہے۔ اُنہیں یقین ہے کہ اسلام اور صرف اسلام عصرِ جدید میں پوری دُنیا کو تباہی اور بربادی سے بچا سکتا ہے۔

یورپ میں مسلمانوں کی دین سے وابستگی اور شیفتگی نہ صرف مسلمانوں کے لیے اطمینان اور سکون کا باعث ہے بلکہ مغربی پریس اور ذرائع ابلاغ بھی اس کو اسلام کی انقلابی پیش رفت کا نام دے رہے ہیں۔ یہ تو تصویر کا ایک رُخ ہے مگر تصویر کا دوسرا رُخ زیادہ روشن

اور تاب ناک نہیں ہے، اور وہ رُخ مسلمانوں کی نئی نسل سے متعلق ہے۔ اگر چہ مسلمانوں نے اپنے بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے مساجد میں جُز وقتی درس گاہیں قائم کرلی ہیں، مگر ان کو وہ حقیقی اسلامی ماحول نہیں مل رہا ہے جس میں ان کی شخصیت اور ان کے کردار کی حقیقی تعمیر ہو سکے۔ وہ دو گھنٹے کے علاوہ مکمل طور پر مغربی ماحول میں رہتے ہیں۔ جن اسکولوں میں وہ تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں وہاں کا ماحول انتہائی گِھناؤنا اور اسلامی اقدار کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بے شرمی، جنسی انارکی، عُریانیت اور فحاشی مغرب کی درس گاہوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اسکول سے واپسی پر گھر آتے ہوئے جن بازاروں اور شاہ راہوں سے وہ گذرتے ہیں وہاں مغرب کے مہذب انسانوں کو جانوروں کی طرح جنسی تسکین حاصل کرتے ہوئے دیکھ کر اس سے متاثر ہونا ایک فِطری عمل ہے۔ گھر پہنچنے کے بعد وہاں بھی انہیں وہی سب کچھ نظر آتا ہے، جو وہ بازار میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ٹی وی اور ویڈیو کی لعنت سے اب کوئی گھر محفوظ نہیں ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ جن بچوں کے ۲۲ر گھنٹے اِس قدر زہرناک ماحول میں گذر رہے ہوں اُن کو مسلمانوں کی ایک یا دو گھنٹے کی یومیہ جُز وقتی درس گاہیں کیا دے سکیں گی؟ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے بچے کو سمندر میں ڈبونے کے بعد یہ کہے کہ خیال رکھنا دامن تر نہ ہونے پائے۔

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای　　بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

دراصل یورپ میں بسنے والے مسلمانوں کو اپنی نئی نسل کو اسلام سے وابستہ رکھنے کا مسئلہ انتہائی اہم ہے، بلکہ یہ مغرب کا سب سے بڑا چیلنج ہے، جس سے یہاں کے مسلمان دوچار ہیں۔ اگر مسلمانوں نے اِس مسئلے کی نزاکت اور اہمیت کا اِحساس نہ کیا اور اپنی نئی نسل کے دین وایمان کو بچانے کے لیے سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل سے کام نہ لیا تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یورپ میں مسلمانوں کا مستقبل انتہائی تاریک ہے۔

اور اگر مسلمانوں نے مغرب کے اِس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اپنی تمام کوششیں اپنے بچوں کے مستقبل پر صرف کیں اور ایک نسل کو بھی بچالے گئے، تو پھر یہاں اسلام کا

سورج کبھی غروب نہ ہوگا، بلکہ وہ مسلم ممالک جو مغرب کے جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کی تاب نہ لاکر اپنی بصیرت اور بصارت کھو بیٹھے ہیں، اُن کے لیے یہ ایک انتہائی حیرت انگیز مثال ہوگی کہ مغرب کے مسلمانوں نے مغرب کے قلب میں بیٹھ کر اپنی اِسلامی اقدار کو اپنے سینے سے لگائے رکھا اور اپنے دینِ متین پر قائم رہے۔ انھوں نے مغربیت کے سمندر میں ڈوب کر بھی اپنے دامنِ حیات کو تر ہونے سے بچائے رکھا، اگر ایسا ہُوا تو مشرق کے مغرب زدہ لوگ ان مسلمانوں کو سامنے رکھ کر اپنے لیے خطوطِ عمل متعین کریں گے۔

اگر مغرب کے کروڑوں مسلمان اپنا دینی ورثہ اپنی نئی نسل کو منتقل کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور ان کو مستقبل میں اپنی دینی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے پر آمادہ کرلیں تو ہم پیشین گوئی کرسکیں گے کہ قیامت سے پہلے ہی اسلام کی سر بلندی کا سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور ساری دُنیا کو منوّر کرے گا، ان شاء اللہ العزیز...... اِس کے برعکس مسلمانوں نے اپنی دینی ذمے داریوں کو محسوس نہیں کیا اور اپنے بچوں کے دینی مستقبل کو بچانے کے لیے اجتماعی جہاد میں شریک نہ ہوئے تو خطرہ ہے کہ موجودہ نسل کے بعد یورپ میں نام کے مسلمان بھی نہ رہ جائیں گے۔ اِس لیے کہ وہ اپنے ناموں کا عربی اور فارسی تلفّظ بھی بھول چکے ہوں گے، اور جو مساجد اور درس گاہیں آج مسلمانوں کی گاڑھی کمائی سے تعمیر ہو رہی ہیں کل اُن کو آباد کرنے والے اور اذان دینے والے بھی موجود نہ ہوں گے۔ یورپ کے ہزاروں کلیسا ویران ہو چکے ہیں، خدا نہ کرے کہ یہ ویرانی مساجد میں بھی داخل ہو جائے۔ **عیاذًا باللّٰہ**

پس چہ باید کرد: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِن حالات میں یورپ میں بسنے والے مسلمان کون سا طریقہ اختیار کر کے اپنے بچوں کے دینی مستقبل کا تحفّظ کرسکتے ہیں؟

اِس سوال کا جواب انتہائی طویل اور کافی شرح وبسط کا طالب ہے۔ دراصل یورپ میں بسنے والے مسلمانوں کو ہمہ جہتی جدوجہد کرنی ہوگی۔ بچوں کی مذہبی تعلیم وتربیت کا بھرپور خیال رکھنا ہوگا۔ ان کے لیے گھر اور گھر کے باہر ایک ایسا ہی مذہبی معاشرہ تشکیل دینا

ہوگا جہاں وہ گھٹن محسوس کرنے کے بجائے خوشی اور مسرت کے ساتھ رہ سکیں۔ ان کے اندر دینی غیرت اور اپنی تہذیب سے والہانہ شیفتگی پیدا کرنی ہوگی۔ انہیں اپنی مذہبی انا کی تربیت کے لیے اپنی دینی برتری کا احساس دلانا ہوگا، اور اس سلسلے میں انہیں خیرِ اُمّت کے حقیقی منصب سے روشناس کرانا ہوگا۔ انہیں شعور کی منزلوں میں قدم رکھتے ہی دینی کاموں میں عملاً شریک کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرنی ہوگی اور ان کے ہر کام کو استحسان کی نظر سے دیکھنا ہوگا۔ انہیں مذہبی تعلیم ایسے علما سے دلانی چاہیے جو ان کے ذہن وفکر میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب دے سکیں۔ مُسلم ملکوں کے روایتی طریقۂ تعلیم سے اعراض کرتے ہوئے بچوں کی نفسیات اور ان کے ماحول کو سامنے رکھ کر تعلیم دینی ہوگی تاکہ وہ مذہبی تعلیم میں دِل لگا سکیں۔ بچوں اور بچیوں کے لیے علاحدہ کُل وقتی مسلم اسکول قائم کرنے ہوں گے، جہاں وہ اپنے اوقاتِ تعلیم میں بھی اپنے اسلامی ماحول میں رہ سکیں اور اس طرح سے ان کا بیش تر وقت اسلامی ہدایات کے مطابق گذرے۔

مندرجہ بالا تجاویز پر عمل درآمد کے لیے طویل وقت اور اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ یہ سارے کام مشکل ضرور ہیں مگر ناممکن نہیں۔ اگر مسلمانانِ یورپ متحد ہو کر ان خطوط پر گام زَن ہو جائیں تو ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ لوگوں کو خطرات کا حقیقی احساس ہو جائے۔

ایک بات جو فوری طور پر توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے گھر کو اسلامی اَقدار کا آئینہ دار بنا دے۔ گھر کے تمام افراد نماز کی پابندی کریں، بُرائیوں سے پرہیز کریں، سچ بولیں، بچوں سے محبت کریں اور ان کو انتہائی نرمی و ملاطفت کے ساتھ اپنی تمام دینی مصروفیات میں شامل رکھیں، بچوں کو ساتھ لے کر مساجد اور دینی اجتماعات میں جایا کریں، ان کے ذہن پر غیر ضروری بوجھ ڈالے بغیر ان کو پیغمبرانِ کرام، اولیاے کرام اور مجاہدینِ اسلام کے واقعات سے روشناس کرائیں۔ ان کے سامنے ہمیشہ سچ بولیں اور ان سے جو وعدہ کریں وہ ضرور پورا کریں۔ ہر روز ان کے ساتھ کچھ وقت ضرور گذاریں۔ ان کی

جائز مصروفیات میں دل چسپی لیں، اچھے کاموں میں ان کی ہمّت افزائی کریں۔ انہیں انعامات دیں، ان کو مذہبی اور دینی مقابلوں میں شرکت کے لیے تیار کریں اور کامیابی پر کھل کر ان کی تعریف کریں۔

خبردار! ان سے ہرگز کسی ایسے کام کے لیے نہ کہیں جو آپ خود نہ کرتے ہوں، اگر ان سے نماز کے لیے کہیں تو خود بھی نماز کی پابندی کریں، ورنہ بچہ زبان اور عمل کے تضاد کو برداشت نہ کر سکے گا اور باغی ہو جائے گا۔ مغرب میں پروان چڑھنے والا بچہ عملی منافقت کو گوارا نہیں کر سکتا۔

گھر میں اسلامی ماحول ہوگا اور مذہب کا چرچا ہوگا تو بچوں پر اسلامی رنگ غالب آ جائے گا۔ اگر آپ غور کریں تو خود ہمارا اسلام بھی ہمارے گھریلو ماحول کا مرہونِ منّت ہے۔ ہم جب صبح کو اُٹھتے ہیں تو مسجدوں سے اذان کی آواز آ رہی ہوتی، والدہ مصلّے پر ہوتیں، والد مسجد جانے کی تیاری کر رہے ہوتے، دادی کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور بہنیں قرآنِ عظیم کی تلاوت میں مصروف ہوتیں۔ اسی روحانی ماحول نے ہماری تربیت کی اور آج ہم مسلمان ہیں۔ یہی ماحول ہمیں اپنے بچوں کو بھی دینا ہوگا۔

یاد رہے کہ یہ بچے آپ کی جنت بھی ہیں اور [خدا نہ کرے] آپ کا جہنم بھی، قرآنِ عظیم کا فرمان ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ. [التحریم: آیت ٦]

اے مسلمانو! خود کو اور اپنی اولاد کو جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں سے بچاؤ جس کے ایندھن انسان بھی ہیں اور پتھر بھی۔

☆☆☆

مغرب کا نظامِ تعلیم اور اس کے لرزہ خیز اثرات

تعلیم کا بنیادی مقصد ایک مسرت بخش، پُرسکون تخلیقی اور تعمیری زندگی کا حصول ہے۔ صحیح تعلیم، معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں انتہائی اہم رول ادا کرتی ہے مگر خراب تعلیم معاشرے کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔

امریکہ کے صدر جان ایف کینڈی نے کہا تھا:

”بچے کی خراب تعلیم بچے کے قتل کے مترادف ہے۔“

جوزف اسٹالن نے کہا تھا:

”تعلیم ایک ہتھیار ہے مگر اس کا استعمال معلم، مقصدِ تعلیم اور متعلم کے ارادوں پر مبنی ہے، اس سے اچھائیوں کا خون بھی کیا جا سکتا ہے اور برائیوں کا استیصال بھی۔“

یونانی فلاسفر ارسطاطالیس نے کہا تھا:

”حکومتوں اور بادشاہوں کا مستقبل بچوں کی تعلیم پر منحصر ہے۔“

مندرجہ بالا اقوال کی روشنی میں آج ہم مغربی اور بالخصوص برطانوی نظامِ تعلیم کا جائزہ لیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ موجودہ نظامِ تعلیم تعمیرِ انسانیت کی طرف نہیں بلکہ تخریب کی طرف ایک منظم اور خوف ناک پیش رفت ہے۔

آج کے اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں جو نظامِ تعلیم رائج ہے اس کے نتیجے میں پورا معاشرہ تباہی اور بربادی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ قتل، لوٹ، غارت گری، زِنا، غیر شادی شدہ ماؤں کی کثرت، یہ سارے مفاسد موجودہ نظامِ تعلیم کا منطقی نتیجہ ہیں۔

آج کے اسکول اور کالج ایک ایسے جنگل میں تبدیل ہو چکے ہیں جہاں اخلاقی گراوٹ، جنسی انارکی، ڈرگ کا استعمال، انسانیت کی تضحیک، مستقبل سے بے نیازی اور انجام کار کے طور پر مایوسی اور خود کشی سبھی کچھ موجود ہیں مگر انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار کا دور دور تک پتا نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا سب سے مختصر اور مکمل جواب یہ ہے کہ آج کے نظامِ تعلیم سے روحانی اور اخلاقی مضامین کو خارج از نصاب قرار دے دیا گیا ہے۔ آج ان کے ہاتھ میں علم کا ہتھیار تو دیا جا رہا ہے مگر انہیں یہ بتانے والا موجود نہیں ہے کہ ہمارا مقصدِ حیات کیا ہو، ہمارے فرائض دوسروں سے متعلق کیا ہیں، ہمیں کس لیے پیدا کیا گیا ہے، اور ہمیں مقصدِ تخلیق کو حاصل کرنے کے لیے کن راہوں پر چلنا ہوگا؟ موجودہ نظامِ تعلیم کو اخلاقی مضامین سے بے نیاز کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ خود غرضی اور نفس پرستی نے ظلم و جبر کا بازار گرم کر رکھا ہے اور انسان؛ انسان کو نگل جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

ایک عظیم سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن نے کہا تھا کہ:

”بچے اگر اخلاقی اعتبار سے معیارِ تعلیم پر پورے اُتریں تو وہ انسان ہیں ورنہ ان کی حیثیت ایک تربیت یافتہ کتے سے زیادہ نہیں ہے۔“

مشہور انگلش رائٹر جان رسکن نے کہا تھا:

”تعلیم کا یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگوں کو وہ بتایا جائے جو وہ نہیں جانتے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو یہ پڑھایا جائے کہ وہ کام کریں جو وہ نہیں کرتے۔“

تعلیم کا مقصد خالی دماغوں میں معلومات کا بھرنا نہیں بلکہ ایسی چیزوں کی تعلیم دینا ہے جو ان کے لیے مفید اور تعمیری ہوں۔

مذہبی اور روحانی، اخلاقی اور اعتقادی اقدار کو نصابِ تعلیم سے خارج کر دینے کا پہلا بھیانک نتیجہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی صورت میں نکلا تھا اور اب بھی اگر ان مفاسد کا سدِ باب نہ کیا گیا اور انسانوں کو انسانوں سے محبت اور احترام کی تعلیم نہ دی گئی تو تیسری جنگِ عظیم دُنیا کی مکمل تباہی پر منتج ہوگی۔

آج امریکہ اور روس ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایٹمی اسلحے تیار ہی کیوں کیے گئے؟ کیا اِس قدر بھیانک اسلحے تیار کرنے والے جاہل تھے؟ کیا اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ ہم دُنیا کی مکمل تباہی کا سامان فراہم کر رہے

ہیں؟ کیا ایٹم بم بناتے وقت اُن کے کانوں میں لاکھوں کراہیں، اُن کی آنکھوں کے سامنے کروڑوں تڑپتی ہوئی لاشیں نہیں آئی تھیں؟ کیا اُنھوں نے چشمِ تصور سے جھلسی اور جلی ہوئی دُنیا کا مشاہدہ نہیں کیا تھا؟ جواب صرف یہ ہے کہ یہ اُن کے نظامِ تعلیم کا قصور تھا جس میں انسانیت سے محبت اوراس کے احترام کا کوئی عنصر باقی ہی نہ رہنے دیا گیا تھا۔ اگر سائنس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُن کو مذہب کی تعلیم بھی دی گئی ہوتی، ان کی اخلاقی اور انسانی قدروں کو جلا بخشی گئی ہوتی تو مادّی ترقی کے جملہ وسائل کو تخریب کے لیے نہیں بلکہ صرف تعمیر کے لیے استعمال کیا گیا ہوتا۔

انسانیت کو موت کے دروازے پر پہنچانے کے بعد بھی اگر مغربی درس گاہوں نے اخلاقی تعلیمات کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا تو پھر اس دُنیا کو مکمل تباہی سے بچانا ناممکن ہو جائے گا۔ آج اگر آپ صرف برطانیہ کا جائزہ لیں تو یہ پتا چلے گا کہ یہ نوعمر بچے پوری حکومت کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔ یہ تفریحاً پورے ملک کی خوب صورت عمارتوں کو توڑتے پھوڑتے نظر آرہے ہیں۔ آسودگی کے باوجود چوریاں کرتے ہیں۔ ذرا بڑے ہوئے تو قتل اور ڈاکے کی راہ پر لگ جاتے ہیں۔ ہیروئن اور دیگر منشیات کو استعمال کر کے خود کو تباہ کر لیتے ہیں۔ ماں باپ کا احترام نہیں کرتے، اساتذہ کا احترام بھی دِلوں سے نکل گیا ہے، بلکہ ان کی توہین اور ایذا رسانی میں ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتے ہیں۔ اسکول میں اپنے ساتھیوں کی جیب خرچ [Pocket Money] چراتے ہیں اور بڑے ہو کر بے سہارا بوڑھے اور کم زور انسان جو موت کے انتظار میں پڑے سسک رہے ہوتے ہیں، اُن کو قتل کر کے اُن کی جیب کے چند پونڈ بھی لے بھاگتے ہیں۔ مسجدوں اور چرچوں کے شیشے توڑتے ہیں۔ قانون شکنی کرتے ہیں، اور پولیس سے ہاتھا پائی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بوڑھے والدین کو خیراتی اداروں میں بھیج کر شراب اور زِنا کی غلاظت میں ڈوب جاتے ہیں۔ امریکہ وغیرہ کا تو یہاں سے بھی بُرا حال ہے، جہاں تمام بُرائیاں کرنے کے بعد مایوسی کا شکار ہو کر ہر اٹھارہ منٹ کے بعد کم از کم ایک نوجوان خودکشی کر لیتا ہے۔

موجودہ معاشرے کو ان تمام برائیوں سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ مذہب کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور مذہب کی تعلیم اُن ملحدوں کے ذریعے نہ دِلائی جائے جو خود بھی مذہب پر یقین نہیں رکھتے، بلکہ انھوں نے مذہبی تعلیم کو بطورِ پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ بلکہ مذہب پر یقین رکھنے والے اور اس پر عمل کرنے والوں کو مذہبی اُمور کا ذمے دار قرار دیا جائے۔ آج کے اسکولوں میں مذہب کی تعلیم کو بطورِ رسم کہیں کہیں باقی رکھا گیا ہے مگر اس کے معلم وہ لوگ ہیں جو مذہب کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات پڑھنے کے بجائے ان کو مذہب سے بے زار کرنے کے لیے ایسے مضامین پڑھاتے ہیں جو ان کو شکوک وشبہات کی دَل دَل میں پھنسا دے۔

انسانیت کی تھوڑی بہت اصلاح دوسرے مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کو پڑھانے سے ہوسکتی ہے، مگر اس کی مکمل اصلاح صرف مذہبِ اسلام کو نصابِ تعلیم کا لازمہ بنانے سے ہو سکے گی، اِس لیے کہ اِسلام زندگی کے تمام معاشرتی، تمدنی، اخلاقی، سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی مسائل سے بحث کرتا ہے اور رہ نما خطوط متعین کرتا ہے۔

مذہبِ اسلام ہی اساتذہ اور طلبہ کے ان بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب فراہم کرتا ہے۔ ہم کون ہیں؟ ہم کیا ہیں؟ ہم کیوں ہیں؟ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ دوسرے انسانوں سے متعلق ہماری ذمے داریاں کیا ہیں؟ ہم اپنی زندگی کو کن خطوط پر چلا کر عظیم اور حقیقی مسرت حاصل کر سکتے ہیں؟ ہم کس طرح سے اپنے لیے، خاندان کے لیے اور پڑوسیوں کے لیے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں؟ ہم اقوامِ عالَم کے درمیان کس طرح امن قائم کر سکتے ہیں؟

جنھیں حقیر سمجھ کر بُجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

☆☆☆

برطانوی اسکولوں میں صبح کی دُعائیں اور مسلمانوں کی غفلت

پورے یورپ بالخصوص برطانیہ کے تمام اسکولوں میں تعلیم کے آغاز سے پہلے کم و بیش آدھا گھنٹہ تمام بچوں کو ایک ہال میں جمع کر کے مختلف قسم کی دُعائیں پڑھائی جاتی ہیں۔ عام طور پر ان دُعاؤں کے دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلے حصے میں بچے سُنتے ہیں اور دوسرے حصے میں دُعاؤں میں عملاً شریک ہوتے ہیں اور اخیر میں -آمین- کہتے ہیں۔ دُعاؤں کا یہ رواج یورپ میں سیکڑوں سال پُرانا ہے، اور عصرِ حاضر میں چرچ کی روایات میں سے صرف یہی ایک روایت باقی رہ گئی ہے۔ برطانیہ اپنے تمام اداروں کو سیکولر بنیادوں پر چلا رہا ہے مگر اِس طرح کی اسمبلیاں تمام اسکولوں میں ہوتی ہیں۔

عام طور پر ان دعاؤں میں جو الفاظ شامل ہوتے ہیں اُن کے بعض حصے مسلمانوں کے عقائد کے قطعاً خلاف ہیں۔ مثلاً باپ، بیٹا اور روح القدس کے نام سے دُعا کرنا۔

1. Jesus Son of God
2. Father, Son and Holy Spirit
3. Jesus Died on the Cross

مندرجہ بالا الفاظ چرچ کے اسکولوں میں تو عام طور پر استعمال ہوتے ہیں مگر دوسرے اسکولوں میں بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف ہیں۔ اگر چہ اب برطانیہ کو ایک کثیر النسلی اور کثیر الثقافتی معاشرہ تسلیم کر لیا گیا ہے، اور ایجوکیشن اتھارٹیز کی ہدایات بھی ہیں کہ اُن اسکولوں میں جہاں غیر عیسائی بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں وہاں اُن کے مذہب کے خلاف کوئی کام نہ کیا جائے، مگر پھر بھی شعوری یا لاشعوری طور پر بہت سے ایسے اسکولوں میں جہاں مسلمان بچوں کی تعداد ۸۰/ اور ۹۰/ فی صد ہے، وہاں بھی اسی طرح کی دُعاؤں کا رواج ہے۔ غالبًا اِس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک مسلم والدین نے اِس طرف توجہ نہیں کی یا انہیں خبر ہی نہیں کہ اسکولوں میں اس طرح کی

دُعائیں پڑھائی جاتی ہیں، جو اسلام کے قطعاً خلاف ہیں یا پھر وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ بچوں کا عمل قابلِ مواخذہ نہیں ہوتا، یا بعض لوگ یہ سوچتے ہوں گے کہ اِس طرح کی باتوں پر احتجاج کرنے سے ہماری رواداری پر حرف آئے گا۔

اب یہ مسلمانانِ برطانیہ کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ اپنے مذہب کے سلسلے میں کس حد تک روادار ہو سکتے ہیں۔ کیا رواداری کی نام نہاد روایت کو نباہنے کے لیے وہ جان بوجھ کر عقیدۂ توحید کے خلاف دُعاؤں کو گوارا کر لیں گے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو انہیں اسکولوں کے ذمے داروں سے احتجاج کر کے دُعاؤں سے ایسے الفاظ کو خارج کرانا ہوگا جو عقیدۂ توحید کے منافی ہیں یا پھر اپنے بچوں کو ان اسمبلیوں سے مستثنیٰ کرانا ہوگا، یا بطورِ متبادل برطانوی نظامِ تعلیم کے اربابِ حل وعقد سے اجتماعی طور پر یہ مطالبہ کرنا ہوگا کہ وہ ان اوقات میں مسلم علما اور اسکالرس کو یہ حق دیں کہ وہ اسلامی اسمبلیوں کا اہتمام کریں۔

عقیدۂ توحید کے منافی کلمات بچوں پر انتہائی خطرناک اثرات مرتب کر سکتے ہیں۔ بار بار ان کلمات کے اِعلان سے ان کے ذہن سے توحید کی عظمت نکل جائے گی، وہ شرک کی طرف مائل ہوں گے یا کم از کم شرکیہ کلمات کی ادائیگی ایک گوارا حقیقت بن جائے گی، بعد میں وہ دین سے انحراف بھی کر سکتے ہیں۔ **العیاذ باللّٰہ**.

برطانیہ میں مسلمان آئے دن اپنے حقوق کے سلسلے میں احتجاج کرتے رہتے ہیں مگر افسوس کہ اِس اہم دینی معاملے میں وہ بے حسی بلکہ مجرمانہ غفلت کا شکار ہیں۔ کاش! وہ اِس حقیقت کا ادراک کر سکتے کہ اللہ ربّ العزت کی غیرتِ وحدانیت شرک کو کسی بھی شکل میں معاف نہ فرمائے گی۔ قرآن عظیم نے شرک کو ظلمِ عظیم اور نا قابلِ معافی گناہ قرار دیا ہے۔ اِسلام میں عقیدۂ توحید ہی تمام عقائد کی اساس ہے، اگر یہی عقیدہ مجروح ہو جائے تو دوسرے عقائد کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ پورے قرآنِ عظیم میں سیکڑوں مقامات پر شرک کی مذمّت کی گئی ہے۔ اِس سلسلے میں پوری پوری سورتیں نازل کی گئی ہیں بلکہ میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ قرآنِ عظیم کی ہر آیت عظمتِ توحید کی آئینہ دار ہے۔ قرآنِ عظیم

کے علاوہ احادیثِ مبارکہ میں سیکڑوں مقامات پر شرک سے متعلق بڑے واضح احکامات موجود ہیں۔

سیدنا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا تم کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ جب کہ وہ تمہارا خالق ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ: مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ خواہ تمہیں قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔

اِن واضح احکامات اور وعیدوں کی موجودگی میں ایک مسلمان کی موحدانہ غیرت ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں کرسکتی کہ ان کے بچے ایسے الفاظ ادا کریں جو عقیدۂ توحید کے منافی ہیں۔

میں برطانیہ کے تمام مسلمان والدین سے استدعا کروں گا کہ وہ اپنے بچوں سے معلوم کریں کہ کیا ان کو اس طرح کی دُعائیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اِس سلسلے میں اسکول ہیڈ ٹیچر سے مل کر دُعاؤں کا متن بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ بات معلوم ہوجائے تو اپنے بچوں کو ایسی دُعاؤں سے مستثنیٰ کرالیں۔ اس سلسلے میں اسکولوں کے ہیڈ ماسٹرس کے نام درخواست کا ایک فارم شائع کیا جارہا ہے۔ آپ اس کی فوٹو کاپی کرا کے فارم کی خانہ پُری کے بعد اسکولوں کے ہیڈ ٹیچرس کے حوالہ کردیں۔[۱] مجھے امید ہے کہ برطانوی اسکولوں کے سیکولر ذہن رکھنے والے اساتذہ اِس مسئلے پر ہمدردانہ غور کریں گے۔

☆☆☆

[۱] یہاں مجلّہ ''حجاز'' برطانیہ کے شمارے میں –درخواست فارم– کی نقل شائع کی گئی تھی، جس کی یہاں ضرورت نہیں–مرتب

کرسمس میلادِ مسیح علیہ السّلام اور ہماری ذمے داریاں

کرسمس قریب ہے۔ پوری عیسائی دُنیا کرسمس کی تیاریوں میں مصروف ہے، بازار سجائے جارہے ہیں، گھروں میں کرسمس کے مصنوعی درختوں پر تہنیتی خطوط سجائے جارہے ہیں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں کرسمس کی سیل سے متعلق اشتہارات کی بھرمار ہے۔ گرجا گھروں کو سال بھر میں صرف ایک مرتبہ آنے والوں کے لیے آراستہ کیا جارہا ہے، بچے اپنے والدین، اعزا اور دوستوں کے درمیان کرسمس کے تحائف کے تبادلے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ نونہالانِ مسیحیت ایک فرضی کرسمس فادر کا خواب دیکھ رہے ہیں کہ وہ کرسمس کی شب میں گھر کی غلیظ، گرد آلود اور دُھوئیں سے اَٹی ہوئی چمنی کے ذریعے گھر میں داخل ہوگا اور ان کے تکیوں کے نیچے تحائف رکھ کر چلا جائے گا، [جو خود ان کے والدین رات کو رکھ دیتے ہیں] سٹی ہال کی عمارت پر پلاسٹک کا بنا ہوا کرسمس فادر تحائف کی گٹھری پیٹھ پر لادے ہوئے چڑھ رہا ہے جو شب میں چمنیوں کے ذریعے بچوں کی خواب گاہوں میں داخل ہوگا۔ اِس طرح ان کو یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ دراصل پوری دُنیا میں مذہب کی عمارت اسی طرح کی فرضی بنیادوں پر استوار کی گئی ہے۔

دُنیا بھر کا مسیحی معاشرہ اور خاص طور پر یورپ اپنی سال بھر کی محفوظ کمائی کرسمس پر بے دریغ خرچ کررہا ہے۔ سب سے زیادہ بھیڑ شراب کی دوکانوں پر ہوتی ہے، جو کرسمس کے موقع پر عبادت گزارانِ مسیحیت کے لیے سب سے عمدہ تحفہ ہے۔ کرسمس کے موقع پر ٹیلی ویژن پر بھوتوں چڑیلوں اور ڈراکیولا وغیرہ کے فرضی افسانوں پر مشتمل فلمیں دِکھائی جائیں گی جن میں کچھ غیر مرئی خبیث قوتیں انسانوں کو پریشان کرتی ہیں اور پھر صلیب کو دیکھتے ہی رفو چکّر ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے عہد نامۂ قدیم پر مشتمل وہ فلم بھی دکھائی جائے جو بارہا دِکھائی جاچکی ہے یا سلیمان اور ملکۂ سبا، نامی فلم پھر ٹی وی پر پیش کی جائے جس میں حضرت سلیمان علیہ السّلام کی کردار کشی کی گئی ہے اور ان کو ایک ذہین، مدبّر مگر جنسی اعتبار سے غیر

مختاط بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

کرسمس کی شب میں ولادتِ مسیح کے منظر کو اصنام اور تصاویر کے ذریعے پیش کیا جائے گا جس میں ایک دوشیزہ مریم بنی ہوگی، سامنے گھاس پھوس پر ایک عُریاں بچہ رکھا ہوگا، جس کو یہ مسیحِ مصلوب اور خدا کا نام دیتے ہیں۔ قریب ہی چرواہے بکریاں چَرا رہے ہوں گے، یہی چَرواہے پیدائشِ مسیح کی سب سے پہلے مبارک باد پیش کرنے والے ہیں۔ گھاس پھوس پر ایک عریاں بچے کو دیکھ کر اس فرضی خدا کی بے چارگی کس قدر نمایاں ہے، مگر آج کے متمدن دور میں اوہام وخرافات کے پجاری جب اس فرضی تصویر کے سامنے سرخمیدہ ہو کر نجات، کامیابی اور فلاحِ دارین طلب کرتے نظر آتے ہیں تو عقلِ انسانی ماتم کناں نظر آتی ہے اور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر اللہ عقلِ سلیم نہ دے تو دانشِ حاضر ان کو اوہام وخرافات کی ظلمتوں سے نکال نہیں سکتی۔

کرسمس کے دنوں میں مغربی ممالک بالخصوص برطانیہ کی حکومت کو ایک عجیب طرح دردِسر سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کرسمس کے ''شرابیوں'' سے بے گناہ انسانوں کی جانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے Do not Drink and Drive [شراب پی کر گاڑی مَت چلاؤ] کی تحریک چلانی پڑتی ہے، اور پھر بھی کرسمس کے مدہوش جب ہوش میں آتے ہیں تو اُن کی نگاہ اخبارات کی اُن سُرخیوں پر ضرور پڑتی ہے جن میں ان کی ''میلادِ مسیح'' کے نام پر مے کشی کے نتیجے میں متعدد خاندان برباد اور کتنی ہی جانیں ضائع ہو چکی ہوتی ہیں۔ اسی شب میں مریم عذرا علیہا السّلام کی پاکیزگی کی قسم کھانے والے کتنی عورتوں کے گوہرِ عصمت لوٹ چکے ہوتے ہیں۔

موجودہ مسیحی دُنیا اور بالخصوص یورپ میں میلادِ مسیح کو جس طرح منایا جاتا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ مذہب کا تقدس پامال ہوتا ہے، بلکہ انسانی دلوں میں مذہب کی محبت کے بجائے بغاوت جنم لیتی ہے اور ملحدین کا یہ مفروضہ صحیح معلوم ہونے لگتا ہے کہ مذہب اُن اندھیروں کا نام ہے جہاں روشنی کی کوئی کرن داخل نہیں ہوسکتی۔

المیہ یہ ہے کہ کرسمس کے ان ہنگاموں سے یورپ میں بسنے والے لاکھوں مسلمان بچے بھی متاثر ہوتے ہیں اور ان کے ذہنوں میں بھی حضرت عیسٰی علیہ السّلام کا وہی باطل تصوّر قائم ہو جاتا ہے جو عیسائی دینا چاہتے ہیں۔

ان حالات میں مسلمانوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام اور حضرت مریم علیہا السّلام کے حقیقی چہرے دُنیا کے سامنے پیش کریں اور ایسے پروگرام ترتیب دیں جن میں حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی پاک اور مقدس زندگی، ان کے پیغمبرانہ معجزات، ان کی مسیحائی اور شفا ارزانی، ان کا گہوارے میں کلام فرمانا، حیاتِ مسیح اور رفع الی السّماء کا تذکرہ اور دُنیا میں دوبارہ جلوہ گری کی باتیں ہوں۔ ان کی مزعومہ الوہیت، تثلیث اور دیگر مزخرفات کی تردید کی جائے، تاکہ ایک طرف تو انسانی ذہنوں میں حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی عظمت اُجاگر ہو اور دوسری طرف توحیدِ باری تعالیٰ کا زندہ اور عظیم عقیدہ دلوں میں راسخ ہو سکے اور اس طرح ہم حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی اِس خواہش کا احترام کریں جس کا ذکر انھوں نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا تھا:

''دُنیا نے اپنے نبی کے پہچاننے میں غلطی کی ہے مگر جب وہ فارقلیطِ اعظم جلوہ گر ہوگا تو میرا حقیقی جمال ظاہر فرمائے گا۔''

حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے حقیقی جمال کو قرآن نے ظاہر اور روشن فرمایا اور اب ہماری ذمے داری ہے کہ اس جمالِ جہاں آرا کو مسیحی اور غیر مسیحی دُنیا کے سامنے پیش کریں۔

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارت دیتے ہُوئے حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے وضاحت کے ساتھ فرمایا تھا:

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗۤ اَحْمَدُ. [سورۃ الصّف: آیت ۶]

میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، اپنے سے پہلی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہُوا اور اُن رسول کی بشارت سُناتا ہُوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے اُن کا نام احمد ہے۔ [صلی اللہ علیہ وسلم]

☆☆☆

باب چہارم

لمحۂ فکریہ

ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور برطانوی مسلمان

برطانوی مسلمان آج کل ایک عجیب کرب کے عالم سے گزر رہا ہے، سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب ''سیٹینک ورسیز'' نے نہ صرف یہ کہ مسلمانانِ برطانیہ کا سکون غارت کیا ہے، بلکہ اس صورتِ حال نے سنجیدہ مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اگر مغربی پریس کی اسلام دُشمنی کا یہی حال عالَم رہا تو برطانوی مسلمانوں کا دینی مستقبل کیا ہوگا؟

کیا ہم یہاں رہ کر اپنے دینی اقدار کا تحفظ کر سکیں گے؟ یا رفتہ رفتہ زندگی کی کچھ سہولتوں کے بدلے میں اپنی روایات، اپنی تہذیب اور اپنے دینی اقدار کے ساتھ اپنا عقیدہ اور اپنی متاعِ ایمان بھی کھو بیٹھیں گے؟

برطانیہ میں دُنیا کے مختلف ملکوں سے مسلمان اس لیے آ کر آباد ہو گئے تھے کہ اس جمہوری ملک میں اپنے عقیدہ اور مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ لیکن اب اس آزادی کا ایک ایسا بھیانک رُخ سامنے آ رہا ہے، جس سے اہلِ ایمان لرز اُٹھے ہیں۔

اپنی تہذیب اور روایات کے خلاف برطانوی معاشرے کے مسموم اثرات کا جائزہ یہاں کا دین دار طبقہ پہلے ہی سے لے رہا ہے اور اس سے اپنی نسلوں کو محفوظ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش بھی، چنانچہ جہاں ایک طرف لوگ حلّت وحرمت کی پرواہ کیے بغیر عظیم الشان بلڈنگیں تعمیر کرنے اور کاروباری وسعتوں میں گم ہیں، وہیں یہاں کا دین دار طبقہ مساجد کی تعمیر، مدارس کے قیام، بچوں کی اخلاقی اور دینی تربیت کے لیے اداروں کی تاسیس پر بھرپور توجہ دے رہا ہے۔ ۲۰۔۲۵ر سال کے عرصے میں کم وبیش ۶۰۰ر مساجد اور جُز وقتی اور بعض کُل وقتی مدارس کا قیام یہاں کے مسلمانوں کا مثالی کارنامہ ہے۔

مساجد اور مدارس کے قیام کے ساتھ ساتھ برطانوی اسکولوں اور ہسپتالوں میں حلال کھانوں کا اہتمام، لباس کی پابندی سے استثنا، غیر اسلامی دُعاؤں میں شمولیت سے اجتناب، جنسی تعلیم سے پرہیز وغیرہ جیسے مسائل میں مسلمانوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی

اور بڑی حد تک اپنی نئی نسل کو یہ محسوس کرانے میں کامیاب ہیں کہ ہم ایک جداگانہ تہذیب کے مالک ہیں، اور ہمیں اپنی تہذیب کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

مسلمانوں کی ان کامیاب کوششوں کو دیکھ کر وہ طبقہ جو مسلمانوں کو برطانوی معاشرے میں ضم کرلینا چاہتا ہے، سخت مایوسی کا شکار ہوا، اور اس نے ایک نئے انداز سے مسلمانوں کی نئی نسل کو دین سے منحرف یا بدگمان کرنے کے لیے کوششیں کرنی شروع کر دیں۔ چنانچہ اسکولوں میں یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اسلام میں عورت کو مناسب حیثیت نہیں دی گئی ہے، چار شادی کی اجازت دے کر عورتوں کے حقوق کو غصب کیا گیا ہے، نوجوانوں کو جنسی آزادی نہ دے کر ان کی فطرت کو کچلا جارہا ہے، غیر مسلم لڑکیوں سے شادی اور ہر طرح کے جنسی اختلاط سے روک کر انہیں ان کے فطری حقوق سے محروم کیا جارہا ہے...... اسلام ایک دقیانوسی مذہب ہے جو حلّت وحرمت کے قوانین پیش کرکے انسانوں کو ان فطری لذتوں سے محروم کررہا ہے جس کے وہ مستحق ہیں، پنج وقتہ نماز کی پابندی اور رمضان میں روزے کا اہتمام طبیعتِ انسانی پر ایک بے جا جبر کے ساتھ ترقی کی راہوں میں رکاوٹ کے مترادف ہے...... موسیقی اور ناچ و رنگ میں شمولیت مغربی تہذیب کا طرّۂ امتیاز ہے، مسلمان اپنے بچوں کو ان فنونِ لطیفہ سے محروم کرکے ان کے لطیف جذبات کو کچل رہے ہیں، مسلمان والدین اپنے پسند کی زندگی اپنے بچوں پر مسلط کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ انہیں شادی اور بیاہ وغیرہ کی آزادی بھی حاصل نہیں ہے۔ وہ انہیں ماضی کی ظلمتوں میں رکھنا چاہتے ہیں، جب کہ مستقبل کا سورج طلوع ہوچکا ہے اور یہ مسلم نوجوان اس کی روشنی سے محروم ہیں۔

نہ صرف یہ کہ اس طرح کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے بلکہ ایسے ادارے بھی قائم ہوچکے ہیں جو مسلمان بچوں اور بچیوں کو اپنے معاشرے سے بغاوت پر اُکساتے ہیں اور اگر کوئی بچی یا بچہ ان کے دامِ فریب میں آجائے تو وہ اسے باضابطہ رہائش کی سہولت اور اپنی خواہشات کی تکمیل کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں آئے دن بچوں اور بچیوں سے یہ سوال کیا جارہا

ہے کہ تم خود اپنی مرضی سے شادی کروگے یا ماں باپ کے فیصلے کا احترام کروگے؟ کیا تمہاری کوئی گرل فرینڈ یا بوائے فرینڈ ہے اگر نہیں تو کیوں؟ بارہا ٹی وی پر اسکولوں اور کالجوں کے ناپختہ ذہن نوجوانوں سے یہ کہلوایا جارہا ہے کہ ہم اپنی خاندانی روایات سے مجبور ہیں، ہمارے ماں باپ ہم پر جبر کررہے ہیں اور پھر ماں باپ کو یہ مشورہ دیا جارہا ہے کہ انہیں خود کو نئے ملک اور نئے حالات کے سانچے میں ڈھال لینا چاہیے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میڈیا صرف ان ہی بچوں کو پیش کرتا ہے جو اپنے معاشرے سے بغاوت پر آمادہ ہوں، مگر جو بچے ایسا نہیں کرتے اُنہیں پیش کرنے سے گریز کرتا ہے، اس ملک میں ایسے ہزاروں نوجوان ہیں جو اپنے معاشرے کی خوبیوں کو نہایت مدلل انداز سے پیش کرسکتے ہیں، مگر ان پر قدامت پرستی کا الزام عائد کرکے اس طرح کے مباحثوں سے دور رکھا جاتا ہے۔

مسلمانانِ برطانیہ اس طرح کے چیلنجوں کا سامنا کم وبیش ربع صدی سے کررہے ہیں، اور اس کے مثبت اثرات بھی مرتب ہورہے ہیں۔ مسلمانوں کو نئی نسل کو گم راہ کرنے کا جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا وہ ساحرانِ مغرب کی توقعات کے مطابق پورا ہوتا نظر نہ آیا۔ اس صورتِ حال سے پریشان ہوکر اہلِ مغرب نے اندازِ جنگ تبدیل کرلیا ہے۔ چنانچہ اسلام اور اس کے محاسن پر تنقید کرنے کے بجائے پیغمبرِ اسلام کی ذات ہی کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ ''سیٹینک ورسیز'' اس کی زندہ مثال ہے۔ جب سے سیٹینک ورسز کا قصہ برطانیہ میں ایک شعلۂ جوالہ کی حیثیت سے اُبھرا ہے؛ برطانیہ کے تمام اخبارات، ریڈیو، ٹی وی اور عمائدینِ حکومت سیٹینک ورسز پر پابندی کے خلاف بیانات دے رہے ہیں۔ کبھی وہ مسلمانوں کی کوششوں کو نازی ازم کا نام دے رہے ہیں، اور کبھی آزادیِ اظہار کے خلاف ایک سازش قرار دے رہے ہیں، اور مسلمانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ انہیں اس کتاب کو گوارا کرلینا چاہیے اور اہلِ مغرب سے تہذیب وشائستگی کی سَند حاصل کرنے کے لیے انہیں مکمل خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ مظاہرے، یہ جلوس یہ سب اُس جنون کی پیداوار ہے جس کے لیے

آج کے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں۔

مسلمانوں کے یہ نام نہاد خیر خواہ مسلمانوں کو تو مشورہ دے رہے ہیں مگر سلمان رشدی سے آج تک کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ تم نے یہ لرزہ خیز کتاب کیوں لکھی۔تم نے اپنے ناول کے لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پرائیوٹ زندگی کے علاوہ اور کوئی موضوع کیوں نہیں اختیار کیا۔تم نے سستی شہرت کے حصول کے لیے کائنات کی سب سے عظیم اور محترم ہستی کی شان میں گستاخیاں کیوں کیں اور تم نے دیدہ ودانستہ دُنیا کے ایک ارب مسلمانوں کا دل کیوں دُکھایا؟......مسلمان اپنے عقیدے اور عقیدت دونوں کی روشنی میں سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو اپنی مقدس مائیں تصور کرتے ہیں۔تم نے ایک ارب مسلمانوں کی مقدس اور عظیم ماؤں کے سلسلے میں ناشائستہ الفاظ کیوں استعمال کیے؟

کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ ایک شر پسند کسی کی محترم ماں کو گالیاں دے رہا ہے اور آپ اس شر پسند کو اس عمل سے روکنے کے بجائے اُس بیٹے کو برا کہہ رہے ہیں جو اپنی عظیم ماں کی مقدس آبرو کا دفاع کرنا چاہتا ہے۔ برطانوی پریس نے روزِ اوّل سے ہی مسلمانوں کے ساتھ انتہائی دل آزارانہ رویّہ اپنا رکھا ہے اور پریس کی مطلق العنان آزادی کے دفاع میں دُنیا کے ایک ارب مسلمانوں کے احساسات کا خون کر رہا ہے۔

ہم اظہار کی آزادی کے قائل ہیں لیکن اظہار اور تحریر کی ایسی آزادی جو دوسروں کی کردار کشی اور توہین کے مترادف ہو، دُنیا کے کسی بھی شائستہ معاشرے میں قابلِ قبول نہیں ہے۔مسلمانانِ برطانیہ اس ناول کے خلاف نہیں بلکہ اس میں موجود اس ناپاک زبان کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں جو انسانیت اور شرافت کے دامن پر بدنما داغ ہے۔کاش برطانیہ کے اربابِ اقتدار اس فرق کو محسوس کر سکتے۔آپ کو اختیار ہے کہ آپ اپنا ہاتھ جس طرح چاہیں استعمال کریں، مگر دُنیا کا کوئی بھی قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ اپنے ہاتھ کو کسی کا گلا دبانے کے لیے استعمال کریں اور یہ عذر پیش کریں کہ میں اپنے ہاتھ کے استعمال میں آزاد ہوں، مجھے یہ آزادی ضرور ملنی چاہیے۔

دُنیا کے ہر انسان کو اختلافِ رائے اور آزادیِ تحریر وتقریر کا حق حاصل ہے۔خود اسلام اس حق کو تسلیم کرتا ہے، مگر اس آزادیِ تحریر وتقریر کے ذریعے اگر کوئی شخص کسی کی کردار کشی کرے تو اسے دُنیا کا کوئی قانون برداشت نہیں کرے گا۔سلمان رشدی نے حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم پر الزامات عائد کرنے کے لیے ناول کا سہارا اس لیے لیا ہے کہ وہ اس میں اپنی منحوس فکر کو شامل کر سکے، اور قاری کسی ثبوت کا مطالبہ نہ کر سکے اور نہ ہی ماخذ ومراجع پیش کرنے کی ضرورت پیش آئے۔اور اگر کوئی اس کی ناپاک تحریر پر اعتراض کرے تو یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لے کہ یہ میرا ناول ہے۔

سلمان رشدی کی کتاب اسلام کے خلاف انٹرنیشنل سازش کا حصہ: اس دل آزار کتاب کے خلاف جو عالمی ردِّ عمل ہو رہا ہے، یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے، اور نہ ہی رائٹر، پبلشر اور برطانوی اربابِ اقتدار اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمیں اس کتاب کے مندرجات یا اس کے ردِّ عمل کا احساس نہیں تھا۔پینگوئن پبلشرز نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے ہندوستان کی زمین منتخب کی تھی، اور اس سلسلے میں اس نے وہاں کے مشہور معمر صحافی اور پینگوئن کے ایجنٹ سے رابطہ قائم کیا کہ وہ اس کتاب کو شائع کریں، مگر انہوں نے کتاب کے مطالعہ کے بعد ''پینگوئن'' کو متنبہ کیا کہ اس کتاب کی اشاعت بڑی ہنگامہ خیز ہوگی، اور اس سے اس اشاعتی ادارے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔

پینگوئن نے ان سے اپنی رائے بدلنے کے لیے دوبارہ غور کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے دوبارہ پھر اسی رائے کا اظہار کیا کہ اس کتاب کی اشاعت کسی بھی اعتبار سے سود مند نہ ہوگی، اس لیے میں ذمے داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس ادارے کو آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اس کتاب کی اشاعت انتہائی تہلکہ خیز ثابت ہوگی اور پوری دُنیا میں آگ لگ جائے گی، تو پھر پینگوئن پبلشرز نے اس کتاب کی اشاعت کیوں کی؟

کیا اس کو اپنے نقصانات کا احساس نہیں تھا؟ یقیناً تھا مگر اسلام دُشمن قوتوں نے

اسے مطمئن کر دیا تھا کہ تمہارے نقصانات کے ہم ذمے دار ہیں، تم اس کتاب کی ضرور اشاعت کرو۔ پینگوئن پبلشرز کا جان بوجھ کر مسلمانوں کے خلاف یہ اقدام انتہائی بھیانک جرم ہے۔

دُنیا بھر کے ذرائع ابلاغ مسلمانوں کے پُر امن احتجاج کی مذمت کر رہے ہیں، مگر یہ اسلام دُشمن قوتیں اس پبلشر اور رائٹر سے باز پرس کیوں نہیں کرتیں، جنھوں نے یہ آگ لگائی ہے۔ جن کی وجہ سے متعدد بے قصور افراد کی جانیں جا چکی ہیں، اور اگر جلد از جلد کوئی مناسب اقدام نہ کیا گیا تو مزید جانیں جا سکتی ہیں۔

کیا آزادیِ اظہار کے نام پر کسی ایک فرد کو یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ارب افراد پر مشتمل پوری قوم کے قتل کا ارتکاب کرے۔

۲۲ رفروری کی صبح کو بی بی سی ٹیلی ویژن نے شاہ ایران کے آخری دور کے برطانوی ہائی کمشنر کا انٹرویو پیش کیا، جس میں انہوں نے یہ بات واضح کی کہ میں نے اس کتاب کو ان تمام ہنگاموں سے بہت پہلے پڑھ لیا تھا، اور اس کتاب کے مطالعے کے بعد مجھے یقین تھا کہ اس کتاب کی اشاعت بڑی تہلکہ خیز ثابت ہوگی۔ اس لیے کہ مسلم ملکوں میں برطانوی سفارت کے فرائض انجام دینے کی وجہ سے میں مسلمانوں کے احساسات سے بخوبی واقف ہوں۔ مجھے حیرت تو یہ ہے کہ یہ ہنگامے اس قدر تاخیر سے کیوں شروع ہوئے۔

ملاحظہ فرمائیں! یہ برطانیہ کے ایک ذمے دار نمائندے کے الفاظ ہیں۔ اس کے بعد بھی کوئی شبہہ رہ جاتا ہے کہ برطانیہ کے حکمرانوں کو اس کتاب کی اشاعت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عواقب ونتائج کا علم نہیں تھا؟ اگر تھا تو ہمیں یہ بات کہنے میں کوئی خوف نہیں ہے کہ مسلمانوں کی دل آزاری میں سلمان رشدی اور ادارۂ پینگوئن کے ساتھ ساتھ حکومتِ برطانیہ برابر کی شریک ہے۔ اور اب وہ اپنی نام نہاد آزادیِ اظہار کا سہارا لے کر مسلمانوں کے جذبات کو کچل دینا چاہتی ہے۔ آزادیِ اظہار اگر برطانیہ اور مغربی ممالک کا مسلّمہ قانون ہے تو پھر ''اسپائی کیچر'' پر پابندی کیوں عائد کی گئی۔ برطانیہ کے بیش تر شہروں

کی لائبریریوں میں نسلی امتیازات کو اُبھارنے والی کتابوں پر پابندی کیوں عائد کی گئی؟ چرچ آف انگلینڈ کی توہین کے مرتکب کو سزا کا مستحق قرار کیوں دیا گیا ہے؟ اور برطانوی قانون کے وقار کی ضمانت کیوں دی گئی ہے؟ کیا یہ ادارے یا افراد انسانوں سے ماورا کوئی مخلوق ہیں جہاں آزادیِ اظہار کی رسائی نہیں ہوسکتی؟ برطانیہ میں بسنے والی مختلف نسلوں کے تحفظ کے لیے نسلی اختلافات اُبھارنے والی کتابوں پر پابندی محض اس لیے ہے کہ یہاں نسلی اختلافات نمودار نہ ہوسکیں۔ تو پھر وہ جہاں سوز کتاب جس نے برطانیہ کے دوملین مسلمانوں کا سکون تباہ کر دیا ہے، اس پر پابندی عائد کیوں نہیں کی جا رہی ہے؟

فِکشن یا جھوٹ کا انبار؟ مغربی ذرائع ابلاغ اِس کتاب کو ادب کا شاہ کار قرار دے رہے ہیں، حالاں کہ یہ کتاب اس اعتبار سے فِکشن نہیں ہوسکتی کہ اس میں بدنام زمانہ مصنف نے پیغمبرِ اسلام اور آپ کی ازواجِ مطہرات کے نام لیے ہیں۔ فِکشن کے کردار فرضی ہوتے ہیں لیکن اس نے حقیقی ناموں کا تذکرہ کر کے فرضی الزامات عائد کیے ہیں۔

اس کتاب کو تاریخ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا اندازِ تحریر فِکشنل ہے، مگر اس کو فِکشن اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں ان عظیم تاریخی ناموں کا تذکرہ کر کے ان کی کردار کشی کی گئی ہے، جن کی عظمت کی گواہ پوری دُنیا ہے۔ کیا ایک ناول نگار کو یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی کی پرائیوٹ لائف کو موضوعِ بحث بنائے اور اس پر فرضی الزامات عائد کرے؟ اگر ناول کے کردار حقیقی ہیں تو ان سے منسوب باتوں کو بھی حقیقی ہونا چاہیے، جنھیں تاریخ اور تحقیق کے معیار پر پرکھا جا سکے، اور اگر کہانیاں فرضی ہیں تو پھر کرداروں کو حقیقی نام کیوں دیے گئے؟

اس کتاب میں حقوقِ انسانی کے عالمی منشور کی خلاف ورزی کی گئی ہے:

حقوقِ انسانی کے مسلّمہ منشور میں دُنیا کے تمام افراد کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کا تحفظ کریں، اور دُنیا کے کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی فرد کی ذاتی زندگی کو بلا وجہ تنقید کا نشانہ بنائے۔ ایک عام آدمی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی عزت و وقار کے منافی کوئی اقدام کرے تو وہ اس پر ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر کرے۔ پھر آپ خیال

فرمائیں! کہ وہ رُسوائے زمانہ انسان، جس نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے، اس نے بالواسطہ دُنیا کے ایک ارب مسلمانوں کی توہین کی ہے۔

کیا اس صورتِ حال میں مسلمان اس کتاب کے ضبط کرنے اور اس پر پابندی لگانے کے مطالبے میں حق بجانب نہیں ہیں؟

سلمان رشدی دُنیا کے ایک ارب مسلمانوں اور ۴۶ر مسلم ممالک کا مشترکہ مجرم ہے: سلمان رشدی کی کتاب نے جو آگ لگائی ہے اس میں متعدد بے گناہ جل چکے ہیں، اور اگر اس آگ کو فرو نہ کیا گیا تو ابھی سیکڑوں جانیں مزید ضائع ہوں گی۔

سلمان رشدی ایک ایسا مجرم ہے جس پر بالواسطہ قتل کے متعدد الزامات ہیں، اور آج جب کہ اُس نے اپنی ایک تحریر کے ذریعے تسلیم کرلیا ہے کہ ''میری تحریر سے دُنیا کے سنجیدہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچی ہے''......تو وہ اپنے جرم کا اقبالی مجرم ثابت ہو چکا ہے۔ کیا برطانیہ جیسے تہذیب کے دعوے دار ملک کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ ایک مجرم کی پشت پناہی کرے، اور نہ صرف یہ کہ اسے پناہ دے بلکہ اس کی حمایت کے لیے دوسرے ممالک کو بھی آمادہ کرے۔

ایران کے مذہبی رہ نما خمینی کا اعلان اور اس کے مضمرات: ایران کے مذہبی رہ نما نے گستاخِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا فیصلہ صادر کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ جو بھی اس گستاخِ رسول کو اپنے منطقی انجام تک پہنچائے گا وہ ۴۰ر لاکھ پاؤنڈ کا انعام حاصل کر سکے گا۔ اس اعلان کے شائع ہوتے ہی مغربی ممالک میں کھلبلی مچ گئی۔ سلمان رشدی انڈر گراؤنڈ کر دیا گیا۔ برطانوی لیڈروں نے اس اعلان کو جارحیت کا نام دیا اور خمینی پر غیر مہذب ہونے کا الزام لگایا۔ اخبارات اور نشریاتی ذرائع نے اس کو غیر انسانی عمل سے تعبیر کیا، اور وزیرِ داخلہ نے اعلان کیا کہ ہم کسی بھی ملک کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہماری زمین پر اس طرح کا کوئی اقدام کرے اور مغربی ممالک بشمول امریکہ نے ان کی تائید وحمایت کی۔

خمینی صاحب کے اِس اعلان سے اختلاف کا حق محفوظ رکھتے ہوئے کیا ہم برطانیہ کے اربابِ حل وعقد سے ایک سوال کر سکتے ہیں کہ آج سے کچھ دنوں پہلے جب امریکہ جیسے

سپر پاور نے کرنل قذافی کو قتل کرنے کے لیے لیبیا کی زمین پر اپنے طیارے بھیجے تھے اور اُس کے بم بار طیاروں نے ایک بے گناہ بچی کی جان لی تھی، تو اُس کا یہ عمل تہذیب اور شرافت کے کس معیار پر تولا گیا تھا؟ کیا یہ ایک دوسرے ملک میں مداخلت کے مرادف نہیں ہے، اور کیا امریکہ کے اس عمل کو ایک دوسرے ملک کی زمین پر منظّم دہشت گردی کا نام نہیں دیا جائے گا؟

اگر امریکہ جیسا طاقت ور ملک محض اپنی پالیسیوں سے اختلاف کی سزا دینے کے لیے یہ منظّم دہشت گردی کرسکتا ہے تو پھر دوسروں کو اس حق سے محروم کیوں کیا جا رہا ہے؟

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آج انسانیت، تہذیب اور شرافت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے برطانیہ نے امریکہ کو اس دہشت گردی کے لیے اپنے فضائی مستقر بھی فراہم کیے تھے۔ امریکہ اور برطانیہ دونوں کے ہاتھ لیبیا کی اپنی سرزمین پر ایک بے گناہ بچی کے قتل سے رنگین ہیں۔ ابھی تو اس بے گناہ کا لہو بھی ان کی آستینوں سے خشک نہ ہوسکا ہے، پھر یہ ممالک دوسروں کو غیر مہذب ہونے کا طعنہ کس طرح دے رہے ہیں؟

بہر کیف! یہ مغربی اقوام خمینی صاحب کے اس اعلان کو جو بھی چاہیں نام دے لیں مگر اس باغیرت ایرانی رہ نما کے اس اعلان نے اہلِ مغرب کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ مسلمان سب کچھ گوارا کرسکتا ہے مگر اپنے پیغمبر کے ناموس کے خلاف ایک جملہ بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ اس اعلان کے بعد ہی امریکہ کی تجارتی کمپنیوں نے کئی سو بک اسٹالوں سے اس کتاب کو ہٹالیا۔ جاپان اور بہت سے مغربی ممالک نے اس کتاب کی اشاعت کا پروگرام منسوخ کر دیا۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا حریف اسرائیل، اس کتاب کے عبرانی ترجمے کی اشاعت کا اعلان کر چکا تھا مگر اب مبتلائے تذبذب ہے اور سلمان رشدی، اب زندگی بھر اپنی بل سے باہر نہ آسکے گا۔

ایرانی رہ نما خمینی کو انقلابِ ایران کے روزِ اوّل ہی سے گالیاں دی جا رہی ہیں، یہاں تک کہ برطانیہ کے نام نہاد 'مہذب' اخبارات نے اپنی قوم کے اس عظیم لیڈر کو باریش

حرامی[Bearded Bastard] کا نام دیا، مگر اس نے کبھی بھی اپنی آبرُو اور ناموس پر کیے جانے والے حملوں کے جواب میں اس طرح کا اقدام نہیں کیا، لیکن جب اہلِ مغرب کی اسلام دُشمنی اس حد تک بڑھ گئی کہ ناموسِ رسالت کو نشانہ بنایا جانے لگا تو اس نے فطری غیض وغضب کے عالم میں وہ اعلان کیا جو آج پوری دُنیا کا سب سے حساس مسئلہ [Burning Issue] ہے۔

مغربی ممالک نے ایران کا بائی کاٹ کر دیا ہے، اپنے سفارت خانے مقفل کر دیے ہیں، جواباً ایران نے بھی یورپ اور امریکہ کے تمام ممالک سے اپنے سفیر بلا لیے ہیں، حالاں کہ ایران جنگ کے بعد تعمیرِ نو کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ اس کو ان ممالک کی امداد کی ضرورت ہے۔

پاکستان نے اپنے طور پر تمام اسلامی ممالک سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس کتاب کے سلسلے میں مشترکہ اقدام کے لیے مل بیٹھیں اور برطانیہ نیز دیگر ممالک پر دباؤ ڈالیں، وہ اس کتاب پر پابندی عائد کریں۔

اب دُنیا بھر کے مسلمانوں کی نگاہیں اُن عرب ملکوں اور ان کے سربراہوں پر لگی ہوئی ہیں، جنھوں نے اب تک کوئی مؤثر احتجاج کیا ہے اور نہ ہی اُن کی طرف سے کوئی واضح مطالبہ سامنے آیا ہے۔

صلیبی قوتوں کا عالمی اتحاد: مسلمانانِ برطانیہ نے جس شائستہ انداز سے اپنے احتجاج کا آغاز کیا تھا اگر برطانوی حکومت نے ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا ہوتا یا کم از کم ان کے مجروح دِلوں پر مرہم رکھنے کے لیے اتنا کہہ دیا ہوتا کہ وہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے گی، تو معاملہ اس حد تک آگے نہ بڑھتا۔ لیکن حکومتِ برطانیہ نے روزِ اوّل ہی سے اس کتاب کے معاملے میں خود کو فریقِ مخالف کی حیثیت سے پیش کیا اور مسلمانوں کے جذبات کو مزید مشتعل کرنے کے لیے ان پر جنون، جذباتیت، بنیاد پرستی، ملّائیت، نازی ازم وغیرہ کے الزامات عائد کیے، اور نام نہاد آزادیِ اظہار کا سہارا لے کر ان کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔

اب صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ ایک طرف یہ مسئلہ مسلمانوں کی موت وحیات کا مسئلہ بن گیا ہے اور دوسری طرف حکومتِ برطانیہ کی روایتی انا کو ایران کی طرف سے چیلنج بھی کر دیا گیا ہے۔ اس لیے برطانیہ اب وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کرے گا جو اس کی انا کی تسکین فراہم کر سکے اور اس کے احساسِ برتری کے موہوم قلعے کو منہدم ہونے سے بچا سکے۔ چنانچہ خمینی کے اعلان کے بعد ہی وزیرِ داخلہ نے یورپ کے ان تمام ممالک کو ایران کے خلاف اقدام کرنے پر مجبور کیا جو اس کے حلیف ہیں، اور پھر امریکہ جس نے برطانیہ کے کاندھے پر بندوق رکھ کر لیبیا کی ایک بے گناہ بچی کے قتل کا ارتکاب کیا تھا، وہ اپنی احسان شناسی کے پیشِ نظر اس حکومت کا مؤید ہوگیا۔ اور اب عالَم یہ ہے کہ صلاح الدین ایوبی کے مقابلے میں صلیبی اتحاد کے بعد پہلی مرتبہ پورا مغرب اسلام کے خلاف محاذ آرائی پر آمادہ ہوگیا ہے۔ اور برطانوی حکومت ایک مرتبہ پھر ''شیر دل رچرڈ'' کی حیثیت سے اپنے اتحادیوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صلیبی جنگوں میں براہِ راست مذہب کا نام لیا گیا تھا، مگر اب مذہب کے مقابلے میں اظہارِ رائے کی آزادی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

صرف مسلمان ہی کیوں؟ گذشتہ دنوں ایک مراسلہ نگار نے اخبارات میں یہ سوال اُٹھایا تھا کہ برطانیہ میں ہندو، یہودی، کیتھولک، بودھسٹ اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی بستے ہیں لیکن وہ اپنے حقوق کے مطالبے کرنے کے لیے کبھی اس طرح جمع نہیں ہوتے جس طرح مسلمان جمع ہوتے ہیں...... کبھی وہ ہنی فورڈ کے مقابلے میں تحریک چلاتے ہیں، کبھی علاحدہ اسکولوں کے لیے تحریک چلاتے ہیں، کبھی کسی گستاخی کے خلاف مشتعل ہوجاتے ہیں۔ مسلمان اس ملک میں رہنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے جذبات کو لگام لگائیں، ورنہ یہاں کی اکثریت کا پیمانۂ صبر لبریز ہوسکتا ہے۔

مراسلہ نگار کو اپنے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اس ملک کی اکثریت کے اس طرزِ عمل کا بھی جائزہ لینا ہوگا جو وہ مسلمانوں کے ساتھ برت رہی ہے۔ گذشتہ ۲۵ر

برسوں میں اس ملک میں اسلام کے خلاف جتنا پروپیگنڈہ کیا گیا ہے، کیا کسی اور مذہب کے خلاف اتنا پروپیگنڈہ کیا گیا؟...... مسلمانوں کے عظیم پیغمبر اور دیگر محترم اسلامی شخصیات کے خلاف جس قدر ناپاک زبان استعمال کی گئی ہے کیا کسی اور مذہب کے پیشوا یا قابلِ احترام شخصیتوں کے لیے ایسی زبان استعمال کی گئی؟ اسلام کو جس قدر خوف ناک شکل وصورت میں پیش کیا جارہا ہے اور کوئی مذہب اس طرح سے پیش کیا گیا؟ ہم مراسلہ نگار سے جواباً یہ سوال کرسکتے ہیں کہ آخر ہر بار اسلام اور پیغمبرِ اسلام ہی کو کیوں نشانہ بنایا جاتا ہے؟

مگر ہم یہ سوال نہ کریں گے کیوں کہ اس کا جواب ہمیں معلوم ہے، ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ دُنیا کے دوسرے مذاہب میں یہ دَم خم نہیں ہے کہ وہ ایک تیسری بڑی طاقت بن کر اُبھریں، مگر اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور ہمارے حریف یہ جانتے ہیں کہ ہم نے اس مذہب کو کچلنے کی کوشش نہ کی تو نہ صرف یہ کہ اسلام دُنیا کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بن جائے گا بلکہ عین ممکن ہے کہ مستقبل میں پوری دُنیا کا مذہب اسلام ہو۔

ابتداءً کم وبیش نصف صدی قبل یہی طرزِ عمل یہودیوں کے ساتھ بھی روا رکھا گیا تھا۔ انہیں طرح طرح کے گندے نام دیے گئے تھے، ان کے بچوں کو مہذب برطانیہ کی کھڑکیوں سے نیچے پھینکا گیا تھا، اور انہیں اِس ملک سے نکل جانے کی وارننگ دی گئی تھی۔ مگر انہوں نے اپنے دفاع کے لیے خود کو منظّم کیا، تعمیری اور تعلیمی میدانوں میں اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں زیادہ تیز رَوی کا مظاہرہ کیا، اور آج وہ اس ملک کی شہ رگ پر قابض ہوچکے ہیں...... وہ تعداد میں تھوڑے تھے، انہوں نے خود کو منظّم کیا اور آج ان کے خلاف کسی بھی قدیم برطانوی کو زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے خلاف اکثریت کی نفرت اور ان کا تشدد اور ان کا طرزِ عمل مسلمانوں کو بھی تنظیم، اتحاد اور عمل کا یہی راستہ دکھا رہا ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں مسلمان بھی یہاں کی ایک غالب قوم بن کر اُبھریں گے، ان شاء اللہ۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دباؤ گے

وزیر داخلہ ڈگلس ہرڈ کی مسلمانوں کو تلقین: جامع مسجد برمنگھم میں برطانیہ کے وزیر داخلہ ڈگلس ہرڈ نے مسلمانوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہیں اپنے مطالبات کے سلسلے میں شائستگی اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے اور یہ وارننگ دی ہے کہ حکومتِ برطانیہ مسلمانوں کے احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کے سلسلے میں کوئی ایسا اقدام برداشت نہ کرسکے گی جو برطانوی روایات سے اِنحراف کے مرادف ہو۔

''سیٹینک ورسیز'' کے معاملے میں برطانیہ کے حکم رانوں نے فرداً فرداً مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کی ہے۔ وزیرِ داخلہ کی یہ وارننگ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانانِ برطانیہ نے اب تک کے احتجاجوں میں وہ کون سا طریقہ اختیار کیا ہے جس کی بنا پر ڈگلس ہرڈ کو شبہہ ہوا کہ مسلمان غیر جمہوری طریقہ اختیار کرنے جا رہے ہیں؟ برطانیہ احتجاجوں اور مظاہروں کا ملک ہے۔ کیا وزیرِ داخلہ یہ بتانا پسند کریں گے کہ اس سے قبل کسی طبقے یا کسی مذہب کے احتجاجی جلوس یا جلسے سے قبل انہوں نے یہ وارننگ کیوں نہیں دی؟

یہاں کے مسلمانوں نے صبر وضبط کی انتہا کردی ہے۔ سیٹینک ورسیز برطانیہ میں شائع کی گئی ہے، اس کے مصنف اور پبلشر دونوں برطانوی ہیں۔ برطانوی حکومت نے اظہارِ رائے کی آزادی کے نام پر دونوں کو ہر ممکن تحفظ فراہم کررکھا ہے۔ یہ حکومت ان مجرموں کی حفاظت کررہی ہے جن کی وجہ سے پاکستان، کشمیر اور ہندوستان کے کم وبیش دو درجن آدمی شہید ہوچکے ہیں، لیکن اس کے باوجود مسلمانانِ برطانیہ نے کوئی جذباتی قدم نہیں اُٹھایا، وہ ہر کام قانون کے دائرے میں رہ کر کررہے ہیں۔ ماضی میں بھی مسلمانوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ ایک آئین پسند قوم کے افراد ہیں مگر ان تمام باتوں کے باوجود وزیرِ داخلہ کی وارننگ مسلمانوں کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ وہ یہاں کی نسل پرست قوتوں کو یہ

تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان اس ملک کے شہری بننے کے قابل نہیں، ان کی طرف سے کسی وقت بھی فتنہ وفساد بھڑک اُٹھنے کا امکان ہے۔ وزیرِ داخلہ کی یہ وارننگ پڑھنے کے بعد یہاں کا ہر مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ حکومت کے ذمے دار افراد بھی مسلمانوں کے سلسلے میں انتہائی عصبیت یا غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وزیر داخلہ نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کو تہذیب و شائستگی اختیار کرنے کا مشورہ دیا، وہیں یہ بھی واضح کر دیا کہ ہم اس کتاب پر کوئی پابندی عائد نہ کریں گے، اور نہ ہی یہاں کا قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے۔

وزیرِ داخلہ اس ملک کی حکم راں پارٹی کی نمائندہ ہیں، اور وزیرِ اعظم کے بعد ملک کی سب سے بااثر شخصیت ہیں، اگر وہ چاہیں تو اس طرح کا قانون بن سکتا ہے جس کی بنا پر اس کتاب پر پابندی عائد کی جا سکے...... اگر حکم راں پارٹی مسلمانوں کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے Law of Blasphemy کو وسیع کرنے کا فیصلہ کرے تو اس طرح کے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے، ورنہ خطرہ یہ ہے کہ کل کوئی دوسرا سلمان رشدی پھر مسلمانوں کے خرمنِ سکون میں آگ لگانے کے لیے کوئی کتاب لکھ بیٹھے۔ مسلمانوں کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اب اس سرزمین سے پھر کسی سلمان رشدی کو جنم لینے کا موقع نہیں دیں گے۔ اس لیے قانون کے دائرے میں رہ کر انہیں اپنی تحریک کو تیز تر کرنا ہوگا۔

کسی مثبت نتیجے کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانانِ برطانیہ کا متفق الرائے ہونا ضروری ہے: مسلمان اس وقت شدید جذباتی ہیجان کا شکار ہے، اس لیے مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی جانب سے مختلف تجاویز سامنے آ رہی ہیں، اور یہاں کے نشریاتی ذرائع ان تجاویز کو پیش کر کے مسلمانوں کے عدمِ اتفاق کو نمایاں کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ برطانیہ کی تمام چھوٹی بڑی تنظیموں کے نمائندے کسی ایک مقام پر مل بیٹھیں اور آئندہ کے لیے ایک متفقہ لائحۂ عمل طے کریں، اور انہیں میں سے کچھ ایسے لوگوں کو منتخب کر لیا جائے جو مسلمانوں کی حقیقی نمائندگی کر سکیں اور فرداً فرداً بیان دینے یا انٹرویو کے بجائے جب بھی کوئی سوال اُٹھایا جائے تو انہیں نمائندوں کو نمائندگی کا موقع دیا جائے۔ اس طرح نہ

صرف یہ کہ مسلمان متفق الرائے ہو سکیں گے، بلکہ آئندہ اقدامات بھی مؤثر اور مثبت نتائج کے حامل ہوں گے۔

ادارہ پینگوئن کے نمائندوں کی مسلمانوں سے گفت وشنید کی کوشش: اس خطرے کے پیشِ نظر کہ مسلم ممالک نے اگر پینگوئن کے خلاف مشترکہ اقدام کا فیصلہ کر لیا تو اس سے اس تجارتی ادارے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ اس ادارے کے بعض نمائندے مسلم رہ نماؤں سے بات چیت کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ ایک ایسی درمیانی راہ تلاش کرنا چاہتے ہیں جو دونوں فریق کو قابلِ قبول ہو۔

ایک اطلاع کے مطابق وہ کتاب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ چند ایسے صفحات کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کے اعتراض پر مشتمل ہو۔ حالاں کہ ان کا یہ اقدام - عذرِ گناہ بدتر از گناہ - کے مرادف ہوگا۔ مسلمانانِ برطانیہ کو چاہیے کہ وہ کتاب کی مکمل واپسی کے علاوہ کسی اور بات پر متفق نہ ہوں۔ اس وقت پوری دُنیا کے مسلمانوں کی نگاہیں برطانیہ کے بیس لاکھ مسلمانوں کی طرف لگی ہوئی ہیں، اگر خدانخواستہ انہوں نے کوئی ایسا فیصلہ کر لیا جو دُنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو تو یہ انتہائی تکلیف دہ اقدام ہوگا۔ پھر برطانوی مسلمانوں کو اُن شہدا کی قربانیوں کا بھی احترام کرنا ہے جنھوں نے اس راہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔

ہالینڈ کی سرزمین پر ورلڈ اسلامک مشن کا ایک مستحسن اقدام: مسلمانانِ ہالینڈ کو جب یہ اطلاع ملی کہ ستمبر ۱۹۸۹ء تک 'سیٹینک ورسیز' کا ڈچ ایڈیشن شائع ہوگا تو انہوں نے یہ طے کیا کہ اس اشاعت کو قبل از وقت رکوانے کے لیے ایک مشترکہ لائحۂ عمل اختیار کیا جائے۔ چنانچہ ورلڈ اسلامک مشن ہالینڈ نے وکلا اور بیرسٹروں کی ایک جماعت سے قانونی مشورے لیے اور یہ طے کیا کہ ہالینڈ کی عدلیہ میں اس کتاب کے خلاف مقدمہ دائر کر کے کتاب کے پبلشر کے خلاف ''اِسٹے آرڈر'' حاصل کر لیا جائے تا کہ فوری طور پر اس کتاب کی اشاعت رکوائی جا سکے۔ اس کے بعد بہترین قانونی ماہرین کے مشورے سے اس کتاب

کی اشاعت پر مکمل پابندی لگوائی جائے۔

اس سلسلے میں ایمسٹرڈم میں ۴؍اور ۵؍مارچ کو ورلڈ اسلامک مشن کے زیرِ اہتمام ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ہالینڈ اور بیلجئم کی تمام مسلم تنظیموں نے شرکت کی۔ کانفرنس کی صدارت قائدِ اہلِ سنت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی مدظلہ العالی نے فرمائی۔ برطانیہ سے ایڈیٹر حجاز کے علاوہ شاہد رضا نعیمی، مفتی محمد یونس کاشمیری اور جناب سیّد غلام السیدین کے علاوہ دوسرے رہنما بھی شریک ہوئے۔

☆☆☆

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضی تصویر

لندن کے مشہور اخبار ٹائمنز ہائر ایجوکیشن سپلیمنٹ نے اپنی ۲۷؍جنوری ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضی تصویر شائع کر کے مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کی ہے۔ اس نے نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضی تصویر شائع کی ہے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ بدنامِ زمانہ گستاخِ رسول؛ سلمان رشدی کی بھی تصویر شائع کی ہے، نیز اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف ناپسندیدہ باتیں لکھی ہیں۔ مسلمان ابھی رشدی کی کتاب پر احتجاج کر ہی رہے تھے کہ ٹائمنز سپلیمنٹ نے ایک اور گستاخی کا ارتکاب کر کے مسلمانوں کو مزید مشتعل کرنے کی کوشش کی ہے۔ رشدی کے مسئلے میں حکومت کی خاموشی نے پورے برطانوی پریس کو مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ حکومتِ برطانیہ کو شاید ابھی تک حالات کی نزاکت کا صحیح احساس نہیں ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اِس طرح کی گستاخیوں کے سدِ باب کے لیے فوری اقدام کرے، ورنہ نتائج کی ذمے دار خود حکومت ہوگی۔ ہم برملا اعلان کرتے ہیں کہ ہم پہلے مسلمان ہیں پھر برطانوی، ہندی، پاکستانی یا عرب ہیں۔ ہم کسی ملک میں قیام کی قیمت پر اپنے مذہب اور اپنے شعائر کی توہین برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ برطانیہ میں جس فتنے کو ہوا دی جا رہی ہے اُس کے اثرات صرف برطانیہ تک محدود نہیں رہیں گے۔ بلاشبہ ہم ان گستاخیوں کے جواب میں کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھا سکتے جو سیدنا عیسٰی علیہ السّلام یا سیدنا موسیٰ علیہ السّلام کی عظمت کے خلاف ہو۔ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اِس لیے کہ اُن کا احترام ہمارے ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ اِس لیے کہ وہ اسلام اور قرآن کے پیغمبر ہیں۔ لیکن یہاں اگر مسلمانوں کے دینی جذبات کا احترام نہ کیا گیا تو یہ دُنیا بھر کے لیے ایک انتہائی غلط مثال ہوگی جس کے نتیجے میں دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے چرچ اور مشنری اداروں کے لیے ہزاروں دُشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس طرح سے تو کسی کی بھی عزت کسی مقام پر

محفوظ نہ رہ سکے گی۔

کیا برطانیہ کا عیسائی معاشرہ دُنیا کی غیر عیسائی اکثریتوں کو یہ حق دیتا ہے کہ اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو یہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا جارہا ہے؟

سلمان رشدی کے ایک انگریز حامی نے اپنے ایک انٹرویو میں یہاں تک کہا کہ، بریڈفورڈ کی ۱۰ رفی صد مسلم آبادی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بریڈفورڈ کی ۹۰ رفی صد غیر مسلم عوام سے مطالبہ کرے کہ وہ رشدی کی کتاب نہ پڑھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں کی نام نہاد جمہوریت ایمان اور عقیدے کو بھی ووٹوں کے ترازو میں تولنے کی عادی ہوگئی ہے۔ ہم اس معترض سے سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا بریڈفورڈ کے ۹۰ رفی صد غیر مسلم عوام کو یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۰ رفی صد مسلم عوام کا قتل عام کریں؟ کیا قانون اس صورت میں خاموش تماشائی بن کر رہ سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پیغمبرِ اسلام کے وقار پر حملہ یہاں کے دو مِلین مسلمانوں کے قتل کے مترادف ہے۔ ہماری جانیں اور ہمارا سب کچھ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آب رُو پر قربان ہے۔

حکومتِ برطانیہ کیا کرسکتی ہے؟ برطانوی حکومت کے ذمے دار افراد یہ عذر پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ برطانوی قانون میں چرچ آف انگلینڈ کے علاوہ اور کسی کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی گئی ہے، اِس لیے ہم کوئی قانونی اقدام نہیں کرسکتے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ برطانیہ ہر روز نئی ضرورتوں کے مطابق اپنے قوانین میں تبدیلیاں کر رہا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں یہاں کی معاشی، ثقافتی اور تعلیمی ضروریات کو سامنے رکھ کر متعدد قوانین تبدیل کیے گئے ہیں۔ برطانیہ میں چرچ آف اِنگلینڈ کو اس وقت تحفظ فراہم کیا گیا تھا جب یہاں مذہبی اعتبار سے صرف چرچ آف اِنگلینڈ کی حکومت تھی۔ مگر اب یہاں اسلام دوسری بڑی طاقت ہے، اِس لیے برسرِ اقتدار جماعت ایک بِل کے ذریعے چرچ کو دیے گئے حقوق میں اسلام کو بھی شامل کرسکتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرسکتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کھلے بندوں اپنی نسلی عصبیتوں کا بھی اعتراف کر رہی ہے اور اس طرح وہ اس

برطانوی جمہوریت کا گلا گھونٹ رہی ہے جس نے دُنیا کے دوسرے ممالک کو جمہوریت اور احترامِ حقوقِ انسانی کا راستہ دکھایا ہے۔

☆☆☆

امین جمائل کا قُبولِ اسلام

عربی اخبارات کی اطلاع کے مطابق لبنان کے سابق مسیحی صدر امین جمائل نے اسلام قبول کرلیا ہے اور وہ ایک مسلم خاتون سے شادی کر رہے ہیں۔ عالمی ذرائع ابلاغ سے اِس خبر کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ امین جمائل وہی ہیں جن کے دورِ اقتدار میں صابرہ اور شطیلہ کے کیمپوں میں ۸ر ہزار مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تھا۔ اسلام ماقبل کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ اگر واقعۃً وہ اسلام قبول کرچکے ہیں تو ہم مسلم معاشرے میں ان کا استقبال کریں گے اور ہم یہ باور کریں گے کہ اسلام ایک بار پھر اپنی تاریخ کو دہرا رہا ہے۔ جس طرح بغداد میں مسلمانوں کا قتل عام کرنے والے چنگیزیوں نے بعد میں اسلام قبول کرکے اسلام کا تحفظ کیا تھا، اِسی طرح امین جمائل اقتدار سے محروم ہونے کے بعد بھی مظلوم فلسطینیوں کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہیں۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

☆☆☆

رشدی کی ضلالت: باعثِ عبرت

آج کل پورے برطانیہ میں اِس صدی کے سب سے بڑے گستاخِ رسول؛ سلمان رشدی کی رُسوائے زمانہ کتاب "سیٹینک ورسز" [Satanic Verses] کے خلاف احتجاج کا طوفان اُمڈا ہُوا ہے، برطانیہ کے چھوٹے بڑے تمام شہروں میں مسلم عوام بڑے بڑے جلوسوں کے ذریعے اپنے جذبات اور غم و غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار مُسلمانوں کی نیندیں حرام ہیں، ان بڑے بڑے اجتماعات میں مُسلمان رہ نما، دانش ور اور علما حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ "سیٹینک ورسز" پر پابندی عائد کرے، اور مُسلمانوں کے جذبات کا احترام کرے۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہاں کے مشہور اشاعتی ادارے پینگوئن سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اِس کتاب کی اشاعت اور فروخت بند کر دے، اور وہ تمام کُتب فروش ادارے جو اِس کتاب کو فروخت کر رہے ہیں، اِس کتاب کو اپنے بُک اسٹالوں سے اُٹھا لیں، لیکن اِن تمام جلسوں، جلوسوں اور پاس ہونے والی تجاویز کا نہ برطانوی حکومت پر کوئی اثر ہو رہا ہے اور نہ ہی پینگوئن کے اشاعتی ادارے پر۔ اس کے برعکس کتاب کی اشاعت میں اضافہ ہو گیا ہے اور اب وہ لوگ بھی اِس کتاب کی تلاش میں ہیں جو اس کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ اِس طرح سے لاشعوری طور پر مسلمانوں کا احتجاج اِس کتاب کی اشاعت کا سبب بن رہا ہے۔

لیکن مسلمان بھی مجبور ہیں، انہوں نے تاریخ کے کسی دور میں بھی اپنے عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نہ گستاخی برداشت کی ہے اور نہ برداشت کر سکیں گے، اِس دور میں چوں کہ احتجاج مجبوروں کا ہتھیار ہے، اِس لیے یہاں کے بے بس مسلمان احتجاج ہی کی زبان استعمال کر رہے ہیں۔

برطانیہ کے بڑے بڑے اخبارات جن کی اشاعت لاکھوں ہے، اُنہوں نے اِس کتاب پر اور اِس سے متعلق مسلمانوں کے احتجاج پر اداریے لکھے ہیں۔ سنڈے ٹائمز،

گارجین اور دوسرے قومی سطح کے اخبارات نے مسلمانوں کو -جیو اور جینے دو- کے اصول پر عمل کرنے کا مشورہ دیا ہے...... انہیں صبر و تحمل کی تلقین کی ہے۔ بعض اخبارات نے اس تحریک کو مُلّا ازم کا نام دے کر اسے محض ایک مذہبی گروہ کا مسئلہ قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ چند ایک نے کھلے بندوں اِس دل آزار تحریر کو اَدب کا شاہ کار اور فکشنل لٹریچر میں ایک معقول اضافہ قرار دیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ مسلم دُشمن عناصر بالخصوص یہودیوں کے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ مسلمان اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی برداشت نہ کر سکیں گے اور وہ احتجاج کے لیے سڑکوں پر نکل آئیں گے، اِس طرح سے اس کتاب کی اشاعت میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔

برطانوی ریڈیو اور ٹی وی نے اپنی بین الاقوامی خبروں میں مسلمانوں کے احتجاج کے تذکرے کیے اور سلمان رشدی کے انٹرویو کے ساتھ ساتھ ایسے مسلمانوں سے بھی انٹرویو لیے جو نہ کماحقہٗ دین سے آشنا ہیں اور نہ ہی اِس کتاب کے مندرجات اور اس کی قباحتوں کا حقیقی شعور رکھتے ہیں، اِس طرح سے برطانیہ کے تمام نشریاتی ذرائع اِس کتاب کی اشاعت کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ حکومتِ برطانیہ نے سلمان رشدی کو برطانوی شہری قرار دے کر اُسے بھر پور تحفظ فراہم کیا ہے۔ اِس طرح وہ اپنے چہیتے برطانوی شہری کی خواہشات کی تکمیل کے لیے کم و بیش دو مِلین مسلم شہریوں کی دل آزاری کر رہی ہے۔

مسلمانوں کے ایک وفد سے ملاقات کے دوران ایک برطانوی لیڈر نے مشورہ دیا کہ آپ لوگ اِس کتاب کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتے، اِس لیے کہ ہمارے قانون میں ایک برطانوی شہری کے لیے تحفظات تو ضرور فراہم کیے گئے ہیں مگر پیغمبرِ اسلام کی آبرُو اور ان کے وقار کے تحفظ کے لیے کوئی دفعہ موجود نہیں ہے۔ اِس طرح کی قانونی چارہ جوئی کا نتیجہ خود مسلمانوں کے حق میں مفید نہ ہوگا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کم و بیش دو مِلین مسلمان برطانوی شہری ہیں یا نہیں؟ اگر

یہاں بسنے والے مسلمان بھی برطانوی شہری ہیں تو پھر یہاں کے ایک شہری کو یہ حق کیسے دِیا جاسکتا ہے کہ وہ ۲۰ر لاکھ مسلمانوں کی عزت وآب رُو سے کھیلے؟ برطانوی اربابِ اقتدار کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ مسلمان اپنے پیغمبر کے ناموس پر اپنا سب کچھ قربان کرسکتا ہے، وہ اپنے نبی کی ذات پر حملہ براہِ راست پوری ملتِ اسلامیہ پر حملہ تصور کرتا ہے۔

ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اہلِ مغرب کے اندر مذہبی غیرت نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے، وہ خود اپنے پیغمبر کے خلاف The Last Temptation of Christ [فلم] کی نمائش کو کیسے گوارا کر لیتے ہیں، جس میں سیّدنا مسیح علیہ السّلام کی جنسی زندگی کے مناظر فلمائے گئے ہیں۔ اگر برطانیہ کا عیسائی معاشرہ سیّدنا مسیح علیہ السّلام کی آب رُو کا تحفظ نہیں کرسکتا تو پیغمبرِ اسلام کے سلسلے میں اس کی بے حِسی قابلِ فہم ہے۔

مگر ہم برطانیہ کے اربابِ حل وعقد کو مشورہ دیں گے کہ اب برطانوی معاشرہ کثیر الثقافتی اور کثیر المذاہبی معاشرہ بن چکا ہے۔ اب اِس معاشرہ پر ان کی اجارہ داری ختم ہوچکی ہے۔ مسلمان یہاں کی دوسری بڑی قوم ہیں، اِس لیے مسلمانوں کے مسائل کو اپنی مخصوص مغربی فکر کی عینک سے دیکھنا بند کردیں اور مسلمانوں کے محسوسات کو سمجھنے کے لیے مسلم روایات واَقدار کا مطالعہ کریں۔ اگر انہوں نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر اپنی فکر مسلط کرنے کی کوشش کی تو اس کے نتائج انتہائی خطرناک ہوں گے۔

برطانوی حکومت اور برطانیہ کے نشریاتی ذرائع مسلمانوں کے جذبات کو تھپکیاں دے کر سُلانا چاہتے ہیں، مگر ہم اُن سے اپیل کریں گے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کی شدت کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ وہ اِس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ احتجاج کا یہ طوفان رُک جائے گا اور مسلمان خاموش ہوجائیں گے اور برطانوی تاریخ کے میوزیم میں ایک ملحد کی عالَم آشوب تالیف، اِسلام دُشمنی کی جیتی جاگتی تصویر بن کر محفوظ ہوجائے گی۔ بلاشبہہ احتجاج اور ہنگاموں کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے مگر صرف وہ احتجاج جن کے پس منظر میں کوئی وقتی جذبہ یا کوئی ہنگامی ضرورت کارفرما ہو۔ پیغمبرِ اسلام کا احترام مسلم

معاشرے میں نہ کوئی وقتی جذبہ ہے اور نہ ہنگامی ضرورت، بلکہ یہ مدارِ ایمان ہے۔ اِس لیے برطانوی مسلمان اُس وقت تک خاموش نہ بیٹھے گا جب تک اِس کتاب کو ضبط نہ کرلیا جائے۔ خطرہ یہ ہے کہ حکومت نے اگر اِس سلسلے میں لیت ولعل سے کام لیا تو یہ احتجاج مزید شدت اختیار کرے گا اور نتائج کی ذمے داری حکومت پر ہوگی۔

بریڈفورڈ کے احتجاجی جلوس کے نتیجے میں صرف اِتنا ہوا کہ برطانیہ کے سب سے مشہور کتب فروش ڈبلیو ایچ اسمتھ نے اپنے اسٹالوں سے اِس کتاب کو اُٹھا لینے کا اعلان کیا مگر ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا، یہ کتاب آرڈر کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہم نے یہ اقدام محض پولیس کے مشورے پر کیا ہے، جب بھی پولیس ہمیں تحفظ فراہم کرے گی، ہم اِس کتاب کو دوبارہ بازار میں لائیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ مستقبل قریب میں اِس کی اشاعت میں نمایاں اضافہ ہوگا۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ ڈبلیو ایچ اسمتھ نے یہ اقدام مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے نہیں کیا ہے، بلکہ اِس خوف سے کیا ہے کہ اس کتاب کی برسرِ بازار فروخت کہیں مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل نہ کردے اور ساتھ ہی ساتھ برطانوی پولیس سے یہ اپیل بھی کی گئی ہے کہ وہ اس کو تحفظ فراہم کرے۔

اب مسلمانانِ برطانیہ اِس بات کا جائزہ لینے میں حق بجانب ہیں کہ برطانوی پولیس محض ایک کتاب سے حاصل ہونے والی منفعت کو تحفظ دینے کے لیے دو مِلین مسلمانوں کے جذبات کا خون کرتی ہے یا نہیں۔

بعض مراسلہ نگاروں نے برطانوی اخبارات کے ذریعے مسلمانوں سے سوال کیا ہے کہ قرآنِ عظیم میں عیسائیت اور دوسرے مذاہب کے خلاف مَواد موجود ہے، تو کیا مسلمان اس بات کی اجازت دیں گے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے قرآنِ عظیم کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں جو مسلمان سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف کررہے ہیں؟

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ مراسلہ نگار پڑھے لکھے ہونے کے باوجود قرآنِ عظیم

سے بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔قرآنِ عظیم نے بعض مذاہب کے اُن باطل نظریات کی تردید کی ہے جو خود ان مذاہب کے اُولوالعزم پیغمبروں کی تعلیمات کے خلاف ہیں، ورنہ قرآنِ عظیم نے تو مذاہبِ سابقہ کی تائید کی ہے، ان کی کتابوں پر ایمان لانا جُزوِ ایمان قرار دیا ہے اور ان کی عزت وحرمت کو لازمی قرار دیا ہے۔

آپ اگر قرآنِ عظیم کا مطالعہ کریں تو اس میں جناب ابراہیم علیہ السّلام، جناب موسیٰ علیہ السّلام اور جناب عیسٰی علیہ السّلام کے فضائل ومناقب پر مستقل اَبواب ملیں گے۔ بلکہ ہم یہ دعویٰ کریں تو غلط نہ ہوگا کہ قرآنِ عظیم نے ان اُولوالعزم پیغمبروں کی عظمت اور تاریخیت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے، ورنہ کتبِ سابقہ کی موجودہ ژولیدہ بیانی اور درمیانی کڑیوں کی گم شدگی سے تو یہ بھی ممکن نہ تھا کہ حضرت مسیح اور حضرت موسیٰ علیہما السّلام کی شخصیتوں کے وجود کو بھی ثابت کیا جاسکتا۔

پھر نظریات کی تردید دوسری شے ہے اور کسی پیغمبر کی کردار کشی اِس سے مختلف چیز ہے۔آج بھی اسلامی عقائد ونظریات کے خلاف ہزاروں باتیں کی جاتیں ہیں اور ہم اُس کا جواب انتہائی صبر وتحمل سے دیتے ہیں، مگر چوں کہ اس کتاب میں پیغمبرِ اسلام کی کردار کشی گئی ہے، اِس لیے یہ کتاب ناقابلِ برداشت ہے۔

مُسلم حکومتوں کا افسوس ناک کردار: اِس رُسوائے زمانہ کتاب کے سلسلے میں مسلم حکومتوں کا کردار انتہائی افسوس ناک ہے۔تاہنوز بعض سفرائے ممالک کی ایک میٹنگ اور قراردادِ مذّمت، چند ایک ممالک میں پینگوئن کی کتابوں پر پابندی کی دھمکی کے علاوہ اور کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا گیا، جس سے مسلمانانِ برطانیہ سخت کبیدہ خاطر ہیں۔

مسلم ممالک اپنے معمولی اختلافات کی بنا پر مغربی ممالک سے اپنے سفارتی تعلقات ختم کر لینے کی دھمکی دیتے ہیں، مگر پیغمبرِ اسلام کے خلاف لکھی جانے والی کتاب کے خلاف حکومتی سطح پر برطانیہ سے مؤثر اِحتجاج نہیں کیا گیا۔یہی وجہ ہے کہ برطانوی رائے عامہ مسلمانوں کے احتجاج کو کٹر مذہب پرستی اور مُلاّئیت کا نام دے رہی ہے۔

ابھی چند سال قبل سعودی عرب کے شاہی خاندان کے خلاف دِکھائی جانے والی ایک فلم The Death of a Princess سے مشتعل ہوکر سعودی عرب نے برطانیہ سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے تھے اور اپنے سفیر کو واپس بُلا لیا تھا۔دیکھنا یہ ہے کہ حرمین مقدس کی خدمت اور تولیت کے یہ دعوے دار شہنشاہِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و آبرو کے خلاف لکھی جانے والی اس کتاب کے سلسلے میں کس غیرتِ دینی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اگر سعودی عرب اور بعض مسلم ممالک برطانیہ سے کیے گئے چند تجارتی اور تعمیراتی معاہدے منسوخ کر دیں تو حکومتِ برطانیہ مسلمانوں کے مطالبات کے سامنے سرخمیدہ ہو جائے۔خلافتِ عثمانیہ کے باغیرت تاج دار سلطان عبدالحمید نے ایک یورپین ملک کو محض اِس لیے جنگ کی دھمکی دی تھی، کہ اُس نے سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی پر فلم بنانے کا اِرادہ کیا تھا۔مجبوراً اُسے اپنا یہ پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔

مسلم ممالک کو چاہیے کہ وہ برطانوی مسلمانوں کے احتجاج کی تائید میں اپنے سیاسی اثرات ورسوخ کا بھرپور استعمال کریں اور سفارتی دباؤ ڈال کر برطانیہ کو مجبور کریں کہ وہ اِس کتاب پر پابندی عائد کرے۔اگر برطانوی قانون میں اس طرح کی کتابوں پر پابندی کی کوئی شِق موجود نہیں ہے، تو برطانوی پارلی منٹ کے ارکان ایک بِل کے ذریعے مذاہب اور بانیانِ مذاہب کے احترام کی دفعہ منظور کرا کے اِس کتاب کو غیر قانونی قرار دیں۔

ووٹ کا مؤثر ہتھیار: مسلمانانِ برطانیہ اپنے اپنے علاقوں میں ایم پی اور کونسلر حضرات سے ملاقات کریں اور اُنھیں اِس بات پر آمادہ کریں کہ وہ پارلی منٹ میں اس کتاب کے خلاف پیش کیے جانے والے بِل کی حمایت کریں، ورنہ واشگاف لفظوں میں انھیں آگاہ کر دیا جائے کہ وہ آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کے ووٹوں سے محروم ہو جائیں گے۔

ایسا لگتا ہے کہ اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر دُنیا بھر کی غیر مسلم اور ملحد قوتوں نے یہ منصوبہ کر لیا ہے کہ وہ اِس سیلِ رواں کو روکنے کے لیے اسلام کے خلاف ہر ممکن

ذریعے کو استعمال کریں گی۔ چنانچہ اگر کوئی مسلم ملک ایٹمی توانائی حاصل کرنا چاہے تو دُنیا بھر کے میڈیا چیخ اُٹھتے ہیں کہ اِسلامی بم بنایا جارہا ہے، جب کہ اسرائیل کے ایٹم بم کو- یہودی بم- اور کرسچین ممالک کی ایٹمی توانائیوں کو- کرسچین بم- کا نام نہیں دیا جاتا۔

مسلم ممالک میں احیاے اِسلام کی تحریکوں کو بنیاد پرستی اور مُلّائیت کا نام دے کر لوگوں کے ذہنوں کو اسلام سے متنفر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ماضی میں بھی مستشرقینِ یورپ کی طرف سے انتہائی ناروا حملے کیے گئے ہیں، مگر چوں کہ وہ مستشرق تھے، اور اُن کی اسلام دُشمنی بہت نمایاں تھی، اِس لیے اُن کی تحریروں پر لوگوں نے توجہ نہیں دی، مگر اب اَدب، آرٹ، فن اور ثقافت کے نام پر اسلام کو رُسوا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اِسلام کے خلاف جو باتیں مستشرقین اور عیسائی مشنریاں اور یہودی صدیوں سے کہتے آئے ہیں اُن کی تردید ہر دور میں کی جاتی رہی ہے۔ اب انھیں باتوں کو ناول کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہوسکے اور انعام دے کر اس تحریر کا اعتبار قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چنانچہ سلمان رشدی کو اس کے پہلے ناول پر انعام دے کر عالمی شہرت دی گئی اور اب پیغمبرِ اسلام کے خلاف لکھی جانے والی کتاب کو انعام کے لیے منتخب کر کے ان اِداروں نے اپنی اسلام دُشمنی کو بہت زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔

حال ہی میں اَدب کے سب سے بڑے انعام نوبل پرائز کے لیے مصر کے ایک ایسے ہی ادیب نجیب محفوظ کو منتخب کیا گیا ہے جس کے خلاف علماے اسلام اور مسلم عوام بیس سال سے تحریک چلا رہے ہیں اور اس کی تحریروں کی اسلام دُشمنی کو نمایاں کر رہے ہیں، جب کہ اَدب اور علم سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ مصر میں اِس سے بڑے بڑے ادبا موجود ہیں، جو اِس انعام کا حقیقی استحقاق رکھتے ہیں، مگر چوں کہ وہ اسلام دُشمنی میں نمایاں نہیں ہیں اِس لیے انعام تقسیم کرنے والوں کی نگاہ میں وہ معتبر نہیں ہیں۔

گزشتہ دنوں سلمان رشدی نے اپنے ایک انٹرویو میں محفوظ کی بہت تعریف کی ہے اور اس کو بھی اپنی ہی طرح مسلمانوں کی ''شدت پسندی'' کا شکار قرار دیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان اسلام دُشمن قوتوں کا نہ صرف یہ کہ آپس میں رابطہ ہے، بلکہ یہ ایمان فروش ایمان کی قیمت پر قلم کا سودا کرنے والے ایک دوسرے کا دفاع بھی کرتے ہیں۔

آج سے چند سال قبل لیور پول کی ایک میڈیکل ٹیم [تنظیم] کی جانب سے ایک پوسٹر شائع کیا گیا تھا جس میں حضور سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ مِرگی کا مریض قرار دیا گیا تھا۔ اس پوسٹر کا عنوان تھا: What is Epilepsy?

اس پوسٹر میں دُنیا کے چند مشہور مِرگی کے مریضوں میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی دیا گیا تھا؛ مقصد یہ تھا کہ ان پوسٹروں کو ڈاکٹر اپنی سرجریوں میں آویزاں کریں گے۔ اِس طرح ہر روز ہزاروں انسان یہ بات ذہن نشین کرتے رہیں گے کہ پیغمبرِ اسلام معاذ اللہ مِرگی کے مریض تھے۔ حالاں کہ یہ بات ایک صدی قبل یو پی انڈیا کے برطانوی گورنر ڈاکٹر سر ولیم میور نے اپنی کتاب The Life of Muhammed میں کہی تھی اور اس نے وحی کی کیفیت کو مِرگی سے تعبیر کیا تھا۔ اُس وقت پوری دُنیا کے علما نے اس کی تردید کی تھی اور اس کے اِستدلال کی غلطیوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ اس کے عیارانہ اندازِ فکر کے تار و پود بکھیر دیے تھے۔ مگر اب سو سال بعد اسی الزام کو ایک طبّی پوسٹر کے ذریعے عام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے راستے سے اس الزام کو ذہنوں میں راسخ کر دیا جائے اور بعد میں جب- وحی پاک- کی کیفیت کو مِرگی سے تعبیر کیا جائے، تو کسی کو مجالِ انکار نہ رہے۔ اس زمانے میں- ورلڈ اسلامک مشن- اور برطانیہ کی دوسری تنظیموں نے احتجاج کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ: ہمیں تو یہی معلوم تھا۔

بشپس اور ربائی سے امداد کی اپیل: سلمان رشدی نے مسلمانوں کے اِحتجاج سے پریشان ہو کر اپنے آقایانِ کلیسا اور یہودیوں کے مذہبی لیڈر ربائی سے اپیل کی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو فرو کرنے کے سلسلے میں مؤثر کردار ادا کریں اور اس صورتِ

حال سے نمٹنے کے لیے ان کی مدد کریں۔ چنانچہ ''سنڈے ٹائمز'' میں شائع ہونے والے ایک انٹرویو میں اس نے اِس یقین کا اظہار کیا ہے کہ بشپس اور ربائی اس صورتِ حال کو ختم کرادیں گے۔

سلمان رشدی کا یہ یقین کہ اِس صورت حال سے بشپس اور ربائی نمٹ لیں گے، خود اِس بات کا ثبوت ہے کہ ع

کوئی معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں

سلمان رشدی کون ہے؟ سلمان رشدی بمبئی کے ایک مغرب زدہ گھرانے میں پیدا ہوا۔ اُس کے باپ انیس رشدی نے اس کو ۱۱؍سال کی عمر ہی میں برطانیہ کے ایک اسکول میں داخل کرادیا۔ انیس رشدی خود ایک دولت مند شرابی تھا، جس نے اپنی آدھی عمر حصولِ دولت اور آدھی عمر عیاشیوں کی نذر کردی۔

سلمان رشدی جب انگلینڈ آیا تو ایک نوعمر لڑکا تھا، جس نے اپنے باپ کو ہمیشہ شراب میں دُھت دیکھا تھا۔ عیاشیوں اور شراب نوشیوں کے ماحول میں پروان چڑھنے والا یہ لڑکا دین اور مشرقی اقدار سے قطعاً ناواقف تھا۔ انگلینڈ آکر اس نے اسلام کو اپنے طور پر پڑھنا شروع کیا تو اس کے سامنے مستشرقینِ یورپ کا زہر آلود لٹریچر تھا۔ چوں کہ اسے کسی عالم دین کی رہ نمائی حاصل نہیں تھی اِس لیے وہ اِسلام اور پیغمبرِ اسلام سے بدگمان ہوتا گیا۔ وہ انگلینڈ اِس خیال سے آیا کہ یہاں اس کی پذیرائی ہوگی مگر یہاں اُس کو شدید مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے گورے چٹے رنگ کے باوجود وہ یہاں کالا ہی کہلایا۔ اس کے ساتھی اس کو حقیر نظروں سے دیکھتے تھے، کھانے کی میز پر اُس کا مذاق اُڑایا جاتا تھا۔ نتیجتاً وہ شدید احساسِ کم تری کا شکار ہوگیا، جس کے ردِّعمل میں اس نے اِس بات کی کوشش کی کہ وہ کسی بھی انگریز سے بڑھ کر خود کو انگریز ثابت کرے۔ چنانچہ اس نے اُن تمام عادات و اطوار کو اختیار کیا جو مغربی معاشرے کا طرّۂ امتیاز ہیں۔ وہ شراب نوشی، حرام خوری اور عیاشیوں میں بھی نمایاں رہا لیکن یہ اُس کی بدقسمتی تھی کہ متعدد مغربی عورتوں نے اس سے

رابطہ قائم کیا اور پھر اُسے داغِ جدائی دے گئیں۔

یہاں سے مایوسیوں کا شکار ہوکر وہ پاکستان چلا گیا کہ شاید وہاں پناہ مل جائے اور وہاں وہ اپنے ملحدانہ افکار و نظریات کی آزادانہ اشاعت کرسکے، مگر وہاں کے باغیرت مسلمانوں سے خوف زدہ ہوکر پھر برطانیہ واپس آگیا اور دوبارہ قسمت آزمائی شروع کی۔ اس نے ایک کتاب ہندوستان کے متعلق لکھی اور نہرو خاندان پر جھوٹے الزامات عائد کیے جس کی بنا پر اُسے اِندرا گاندھی سے معافی مانگنی پڑی۔ پھر اُس نے پاکستان کے خلاف اپنے ناپاک عزائم کو تحریری شکل دینے کی کوشش کی، مگر اس میں بھی کوئی پذیرائی نہ مل سکی۔ وہ اِس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ نوبل پرائز کا مستحق ہے مگر وہاں تک پہنچنے کے لیے اُسے چند ابتدائی انعامات حاصل کرنے ضروری ہیں۔ چنانچہ اُس نے ایک ایسا عنوان منتخب کیا جو ایک طرف آج کی ملحد اور سوشلسٹ دُنیا کے لیے قابلِ قبول ہو اور دوسری طرف اسلام دُشمن عناصر اُس کو انعام کا مستحق قرار دیں اور حصولِ انعام کے سلسلے میں اُس کی بھرپور تائید کریں۔ پھر شاید وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اُس کی کامیابیوں کی راہ میں اس کا اسلامی نام سدِّ راہ ہے، چنانچہ اس کتاب کے ذریعے اُس نے اقوامِ مغرب کو یہ باور کرانا چاہا کہ ع

میرے اِسلام کو اِک قصّۂ ماضی سمجھو

اگر اُس نے کسی مسلم معاشرے میں زندگی گزاری ہوتی تو اُسے یقین ہوتا کہ اِس طرح کے اقدام کا کتنا شدید ردِّعمل ہوگا، مگر بچپن ہی سے مغربی ماحول میں پلنے کی وجہ سے وہ حالات کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہ کرسکا۔ سُنا ہے اس ایمان فروش نے پینگوئن سیریز سے ۸؍ لاکھ پونڈ بطور رائلٹی وصول کیے ہیں اور ممکن ہے دس بیس ہزار دوسرے اِداروں سے بھی حاصل ہوجائیں۔ کاش! یہ ضمیر فروش دُنیا کے ایک ارب مسلمانوں کے جذبات کا اِتنا سستا سودا نہ کرتا ع

قومے فروختی و چہ اَرزاں فروختی

مگر اَب اسے یقین ہوگیا ہوگا کہ وہ اس ۸؍لاکھ پونڈ سے اپنی عیاشیوں کی سیج نہ سجا سکے گا۔

اِس کا ثبوت یہ ہے کہ برمنگھم میں وہ ایک انٹرویو کے لیے آیا تھا، جب برمنگھم کے مسلمانوں کو اطلاع ملی تو اِس قدر شدید ہجوم ہُوا کہ پولیس اس کو کسی خفیہ راستے سے کسی خفیہ مقام پر لے گئی۔

وائٹ بریڈ لٹریری ایوارڈ: سیٹینک ورسز کو- وائٹ بریڈ لٹریری ایوارڈ- کے لیے بھی منتخب کیا گیا ہے، جس کا حتمی فیصلہ مشہور براڈ کاسٹر کیٹ ریڈی، سر کیلمنٹ فرائڈ اور برطانیہ کے وزیرِ داخلہ ڈگلس ہرڈ کریں گے۔

اگر وائٹ بریڈ اور اُس کے مقرر کیے ہوئے ججوں نے اِس کتاب کو ۲۰/ ہزار پونڈ کا انعام دیا تو ان کا یہ عمل مسلمانوں کے زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہوگا۔ برطانیہ کے مسلمانوں نے وائٹ بریڈ لٹریری ایوارڈ کے تقسیم کاروں کو شدید احتجاجی خطوط لکھے ہیں لیکن تاہنوز انہوں نے مسلم اُمّت کے جذبات کی پرواہ نہیں کی ہے اور وہ اپنے فیصلے پر قائم ہیں۔

سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس انعام کا فیصلہ وزیرِ داخلہ کے ذریعے ہوگا۔ اگر وزیرِ داخلہ نے اِس کتاب کے حق میں فیصلہ دیا تو مسلمانانِ برطانیہ شدید مایوسیوں کا شکار ہوں گے، اور وہ ایک بار پھر خود کو اِس ملک میں اجنبی محسوس کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔[۱]

مسلمانانِ برطانیہ کے لیے لمحۂ فکریہ: سلمان رشدی اِس لیے گم راہ ہوا کہ اس کے باپ نے اپنی مغرب زدگی کی تسکین کے لیے اپنے نوعمر بچے کو برطانوی معاشرے میں ازخود پروان چڑھنے کے لیے بھیج دیا اور اس کی دینی وفکری رہ نمائی کا کوئی معقول بندوبست نہ کر سکا، جس کے نتیجے میں ایک رشدی دُنیا کے ایک ارب مسلمانوں کے لیے شیطانِ لعین سے بھی زیادہ ملعون ثابت ہوا ہے۔ اس نے پیغمبرِ اسلام کی حُرمت پر حملہ کر کے ہر مسلمان کو بے قرار کر دیا ہے۔ اپنے بچے کی دینی تربیت کے سلسلے میں ایک باپ کی مجرمانہ غفلت نے کتنا خطرناک رُخ اختیار کر لیا ہے، اس کا اندازہ سلمان رشدی کے ناول سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن برطانیہ کے دو ملین مسلمانوں کی اکثریت اپنے بچوں کو ایسے ہی آزادانہ

معاشرے میں پروان چڑھا رہی ہے اور ان کی دینی وفکری رہ نمائی کے معقول انتظامات نہیں کیے گئے ہیں۔ برطانیہ میں پروان چڑھنے والی مُسلم نسل کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ دین سے آزاد ہو کر مغربی معاشرے میں مکمل طور پر ضم نہ ہو جائے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو خوف ہے کہ برطانیہ کی آغوش میں پروان چڑھنے والے بچوں میں کوئی دوسرا رشدی نہ پیدا ہو جائے جو مسلمانوں کے سکون کو غارت کر دے۔

ضرورت اِس بات کی ہے کہ مسلمانانِ برطانیہ اپنے بچوں کی دُنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا بھرپور انتظام کریں اور یہ دینی تعلیم اُس روایتی طریقے سے نہ دی جائے جو ہندو پاک میں رائج ہے، بلکہ بچوں کی ذہنی وفکری تربیت کے لیے ذہین ترین اساتذہ اور علما کا انتخاب کیا جائے، جن کا مطالعہ اِتنا وسیع ہو کہ وہ مستشرقینِ یورپ اور دشمنانِ اسلام کے جملہ اعتراضات کا جواب دے سکیں۔ خدا کرے مسلمانانِ برطانیہ رشدی سے عبرت حاصل کر سکیں۔

☆☆☆

[۱] نوٹ: (مجلّہ) حجاز کی اشاعت کے آخری مرحلے میں یہ اطلاع ملی کہ سلمان رشدی وائٹ بریڈ لٹریری ایوارڈ سے محروم کر دیا گیا ہے۔

انگریزی فلم پیغام [دی میسیج The Message]

اسلام کے خلاف ایک سازش

مسلم حکومتوں کے سربراہ اپنے ملکوں میں نمائش کی اجازت نہ دیں

مکرمی! آپ کے مؤقر جریدے کے ذریعے میں مسلمانانِ عالَم کو مصطفیٰ عقاد کی مشہور فلم ''دی میسیج'' [پیغام The Message] کی شرعی حیثیت اور اس کے مجموعی تاثر سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں، تاکہ فلم دیکھنے والے اس کے مضمرات اور نقصانات سے بچ سکیں اور شریعت کی اتباع کرنے والے اس فلم کو کارِثواب سمجھنے کے بجائے حرام و ناجائز سمجھ کر دیکھنے سے بچیں۔ جیسا کہ مسلمانانِ عالَم کو معلوم ہے کہ اس فلم کا پروپیگنڈہ کم و بیش چار سال سے زور و شور سے کیا جارہا تھا، اور اب وہ برطانیہ کے بہت سے سینما ہالوں میں دکھائی جارہی ہے۔ حالاں کہ مسلمانانِ عالَم نے اس فلم کی شدید مذمت کی ہے اور بعض مسلم مملکتوں نے تو اپنے سفارتی ذرائع سے رکوانے کی کوشش کی تھی، لیکن ان تمام مذمتوں اور کوششوں سے صرف اِتنا ہوا کہ اس فلم کا نام ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' کے بجائے ''دی میسیج'' رکھ دیا گیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مفروضہ شبیہ پیش کرنے سے اجتناب کیا گیا۔ حالاں کہ جن لوگوں نے اختلاف کیا تھا اُن کا اختلاف پوری فلم سے تھا، نہ کہ صرف نام سے۔ لیکن بار بار کی فریب خوردہ اور سادہ لوح قوم کو مزید فریب دینا آسان ہے۔ چنانچہ نام کی تبدیلی سے مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس طرح ناجائز فلم جائز ہوگئی۔

میں اس سے پہلے کہ اس فلم کی شرعی حیثیت پر گفتگو کروں، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مجموعی تاثر کو ناظرین کے سامنے پیش کردوں، تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہوسکے کہ اس فلم کو عقلاً بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، اور اس کی نمائش مسلمانانِ عالَم کو فریب دینے کے مترادف ہے۔

[۱] اِس فلم میں حضرت امیر حمزہ، حضرت ابوسفیان، حضرت زید، حضرت بلال رضوان اللہ علیہم اجمعین اور دیگر بہت سے صحابۂ کرام کی تصاویر اور ان کے تمثیلی کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ ان تصاویر کو دیکھنے کے بعد پردۂ خیال پر صحابۂ کرام کی غلط تصاویر مرتسم ہوجاتی ہیں اور فلم دیکھنے والے جب بھی اس عظیم و جلیل شخصیت کا نام پڑھیں گے یا سُنیں گے تو اُن کے ذہنوں میں ''دی میسیج'' کی پیش کردہ تصاویر موجود ہوں گی اور نفسیاتی اعتبار سے ان سے چھٹکارہ ناممکن ہوگا۔ اسی طرح ان کے عظیم و جلیل کردار کو بھی اسی معیار پر جانچا جائے گا جو فلم کے اندر پیش کیا گیا ہے، اور یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ صحابہ کے عظیم کردار کی عظمت کو فلم پیش کرنے سے قاصر ہے۔

[۲] مستشرقینِ یورپ جو اسلام کے بدترین دُشمن ہیں، دُنیا کو ہمیشہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اسلام کا یہ عظیم انقلاب حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر ہونے کی وجہ سے نہیں برپا ہوا تھا بلکہ اُن کی حکمتِ عملی اور اُن کے عسکری تدبر کی وجہ سے برپا ہوا تھا۔ چنانچہ اُن کے علاوہ اگر کوئی دوسرا انسان بھی اسی سمجھ بوجھ سے کام لیتا جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا تھا تو اُس کو بھی وہی کامیابی ملتی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تھی۔ اِس لیے وہ پیغمبر نہیں بلکہ مدبر، سیاست داں اور سپہ سالار تھے۔ اس پوری فلم سے یہ تاثر مجموعی طور پر قائم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بے دست و پا تھے، اِس لیے مظالم سہتے رہے، لیکن جب مدینہ میں اُن کو طاقت ملی تو اُنھوں نے قبائل کو منظّم کرلیا، اور کافر چوں کہ غیر منظّم تھے اِس لیے مسلمان بدر میں کامیاب ہوگئے۔ چنانچہ معرکۂ بدر میں کافروں کے لشکر کی بدنظمی اور مسلمانوں کے حسنِ انتظام کو ہی نمایاں کیا گیا ہے۔ مثلاً کافروں کے پاس جنگ سے پہلے ہی پانی موجود نہیں تھا، چنانچہ ایک مشکیزہ پانی کے استعمال پر کافر لڑتے جھگڑتے دکھائی دیتے ہیں اور مسلمانوں کی فوج میں اِتنا وافر مقدار میں پانی موجود ہے کہ صحابۂ کرام وضو کرتے ہیں اور نمازیں اَدا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی فوج حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں منظّم ہے، مگر کافروں کے حملے کا یہ عالَم ہے کہ

کافر خود ایک دوسرے کو کچلے دے رہے ہیں۔ اور جانوروں کی بھیڑ کی طرح حملہ آور ہیں۔ اِس طرح انہوں نے مسلمانوں سے زیادہ خود کو نقصان پہنچایا۔ حالاں کہ دُنیا کے تمام مسلمانوں کا قرآنی فیصلے کے مطابق یہ عقیدہ ہے کہ بدر اور تمام غزوات میں جو کامیابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی وہ حضور کا پیغمبرانہ اعجاز ہے اور عسکری تدبیر بھی پیغمبرانہ کاموں کا ہی ایک حصہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ قرآنِ پاک میں ملائکہ کی نصرت کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر کوئی سپہ سالار اس کام کو کرنا چاہتا تو یہ کامیابی نہ ملتی۔ یہ کامیابی سراسر اللہ کی تائید و نصرت پر موقوف ہے۔

[۳] اِس فلم میں مسلمانوں کو کفر کی زندگی میں جس معیارِ زندگی کا حامل بتایا گیا ہے، اسلام کے بعد بھی اسی لباس اور اسی طرزِ معاشرت میں پیش کیا گیا ہے حتیٰ کہ کفر کے لباس اور اسلام کے لباس میں بھی فرق نہیں کیا گیا۔ حضرت ابوسفیان چند صحابہ کے پاس جاتے ہیں وہ روٹیاں پورے ہاتھوں سے توڑ کر کھا رہے ہیں اور ابوسفیان کھڑے ہیں مگر وہ ان کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔ یہ بات اسلامی اخلاق کے بالکل منافی ہے۔ خواہ ابوسفیان کفر کی حالت ہی میں کیوں نہ آئے ہوں، وہ ان صحابۂ کرام کے پاس آئے تھے جن کا اخلاق، اخلاقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتو ہے۔ کیا اِس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اسلام صرف ایک مذہب ہے، تہذیب نہیں۔ مسلمان کفر کی تہذیب کو بھی قبول کر سکتا ہے...... حالاں کہ اسلام ایک مکمل مذہب بھی ہے اور ایک مکمل تہذیب بھی۔ فتح مکہ کے بعد کعبہ کے مطاف میں مسلمانوں کو مسرت اور خوشی میں اُچھلتے کودتے دکھایا گیا ہے۔ حالاں کہ مسلمانوں کی مسرت، تمکنت و وقار کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اور دل اللہ کے شکر سے لبریز تھا۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو اور پیشانیوں میں شکر کے سجدے تڑپ رہے تھے۔ بھلا اِس حالت کا اُس حالت سے کیا موازنہ جو فلم کے اندر پیش کی گئی ہے، جس میں اسلام کے بعد بھی وہی بدویت نمایاں ہے جو اسلام سے پہلے تھی۔ یہ منظر یہ تاثر دیتا ہے کہ سوائے نماز اور اذان کے عادات و اطوار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

[۴] حضرت بلال کے لیے جس چہرے کا انتخاب ہُوا ہے، وہ قطعاً غلط ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ دراز قد تھے، چوڑے چکلے جسم کے مالک تھے۔ چہرۂ اقدس پر گھنی داڑھی تھی اور حبشی الاصل ہونے کے باوجود پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ لباس پورے جسم کو ڈھکنے والا اور شریعت کے مطابق پہنتے تھے۔ مگر اس فلم میں اسلام کے بعد بھی اسی غلامانہ لباس کو دکھلایا گیا ہے، جس لباس میں اسلام سے پہلے رہا کرتے تھے۔ کیا وہ منظر جب کہ مسجد نبوی میں، خانۂ کعبہ اور دوسری جگہوں میں اذان دیتے ہیں، جنگوں میں شرکت کرتے ہیں اور کمر سے اوپر کوئی لباس نہیں ہے، اس بات کی نشان دہی نہیں کرتا کہ اسلام نے حضرت بلال کو مؤذن تو بنا دیا تھا، مگر معیارِ زندگی میں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ کیا فلم میں حضرت بلال کی شبیہ دیکھ کر اُس عظیم بلال کا تصور اُبھرتا ہے جس کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ؛ سیدنا بلال کہا کرتے تھے؟

[۵] حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حالتِ کفر میں جس شدت سے اسلام کی مخالفت کی تھی اسلام کے بعد اس سے زیادہ خلوص و ایثار کے ساتھ انہوں نے اسلام کو آگے بڑھایا، مگر اس کے بعد اس فلم میں صرف اِتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوسفیان نے اچانک فتح مکہ کے روز اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلام قبول کرتے وقت اُن کا چہرہ ہر طرح کے تاثر سے عاری تھا، حتیٰ کہ سابقہ زندگی پر ندامت وانفعال کا کوئی اثر نہیں تھا۔ حالاں کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا ذہن تدریجاً اسلام کی طرف مائل ہوا تھا۔ اس تدریجی عمل کو چہرے سے نمایاں ہونا چاہیے تھا۔ یوں ہی اگر اُن کے اسلام کے بعد ایک جملہ کہہ دیا گیا ہوتا کہ حضرت ابوسفیان نے اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کی بہت خدمت کی تو تاریخ سے ناواقف انسان بھی اپنے دل کو بے غبار لے کر سینما ہال سے نکلتا۔ مگر ابوسفیان کا یہ سرسری اسلام جو فلم کے اندر پیش کیا گیا ہے، غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کرے گا۔

[۶] ہندہ اور وحشی بعد میں مسلمان ہو گئے تھے حتیٰ کہ وحشی نے جھوٹے مدعیِ نبوت مسیلمہ کذّاب کو قتل کیا تھا اور بڑی حسرت سے کہا تھا کہ ایک وہ وقت تھا کہ میں نے اسلام کے بہترین

آدمی حضرت حمزہ کو قتل کیا تھا، اور ایک یہ وقت ہے کہ آج کے بدترین دشمنِ اسلام مسیلمہ کو قتل کیا ہے۔

مگر اس فلم سے ایک فلم بین ان کے متعلق نفرت وغضب کا ایک سمندر لیے ہوئے سینما ہال سے باہر نکلتا ہے، اور ہزاروں گالیاں دیتا ہے [معاذ اللہ] حالاں کہ اسلام کے بعد کفر کے بدترین گناہ بھی معاف ہوجاتے ہیں۔ اور ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ اگر اُن کی کفر کی زندگی کے بعد صرف دو جملے بڑھا دیے گئے ہوتے کہ بعد میں یہ لوگ مسلمان ہوگئے تھے، تو تاریخ سے ناواقف مسلمان بے غبار دل لے کر واپس لوٹتا۔

[۷] حضرت بلال کے علاوہ اور صحابۂ کرام کی صورتیں بھی انتہائی ناپسندیدہ انداز سے پیش کی گئی ہیں، بلکہ صحابہ کے مقابلے میں کافروں کے چہرے پُر شکوہ اور وجیہ بنا کر پیش کیے گئے ہیں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّٰی تھے، یعنی مُنھ بولے بیٹے تھے، اُن کو مایوس، لااُبالی اور ہِپّیوں جیسے بال رکھنے والے نوجوان کی صورت میں پیش کیا گیا۔ اور چہرے پر داڑھی ایسی ہے جیسے دو روز سے شیو نہ کیا ہو۔ معاذ اللہ کیا کوئی ایسی صورت دیکھ کر حضرت زید کے بارے میں اچھی رائے قائم کرسکتا ہے؟ آج بچے گلیوں میں چلاتے پھرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنھ بولے بیٹے بھی جدید فیشن کے لمبے لمبے بال رکھتے تھے۔

[۸] فلم میں جگہ جگہ صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کی ''مقدس صورتیں'' پیش کی گئی ہیں۔ کیا یہ اسلام کی غیرت کے منافی نہیں ہے؟ کیا مسلمان جس فلم کے پردے پر اپنی ماں بہن کی تصویر دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ صحابیہ خواتین کے چہرے دیکھنا گوارہ کرے گا، اگرچہ وہ فرضی کیوں نہ ہوں، منسوب تو دورِ رسالت سے ہیں!

[۹] کیا وجہ ہے کہ خلفاے اربعہ کی تصویریں نہیں پیش کی گئی ہیں اور بہت سے جلیل القدر صحابہ مثلاً حضرت امیر حمزہ جو سید الشہدا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، ان کی تصویر پیش کی گئی ہے! کیا یہ احتیاط اور بد احتیاطی دونوں اِس لیے نہیں ہے کہ خلفاے

راشدین کی تصویریں نہ پیش کر کے مسلمانوں کو فریبِ احتیاط دیں گے اور بعض صحابہ کی تصویریں پیش کر کے آئندہ خلفا کی تصویروں کے لیے جواز تلاش کریں گے؟

[۱۰] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ کو پیش کرنے میں اگر کامیابی ہوگئی تو اس بات کی ضمانت ہے کہ آئندہ کی فلموں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ پیش نہ کیا جائے گا؟ ہوسکتا ہے اِس فلم سے فریب خوردہ مسلمان ہی یہ مطالبہ کردیں کہ حضور کی شبیہ بھی پیش کی جائے۔ اِس کا امکان بھی ہے کہ مذاق بنی اپنی تسکین کے لیے پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں غیر پیغمبرانہ قسم کا رنگ بھرنے کی کوشش کرے۔

مثلاً ابتداءً حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی حیاتِ طیّبہ پر جو فلم بنی اُس میں اُن کے منصب کو خدا کے برابر پیش کیا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ عام انسان کی سطح پر لائے گئے، اور اب اُن کی جنسی زندگی پر فلم بن رہی ہے، جس کے لیے عیسائی دُنیا سراپا احتجاج نظر آرہی ہے لیکن بے اثر! ملحد دُنیا یہ فلم ضرور بنائے گی۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ عیسائیت نے اپنے مقدس نبی کو پردۂ فلم پر پیش کرنے کی اجازت دے کر سخت غلطی کی تھی، جس کی بنا پر آج حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے ''سیکس'' تک بات آن پہنچی ہے؟ جب کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے عقد بھی نہیں فرمایا تھا! پھر کیا بعید ہے کہ آج کے فلم بین کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اسی طرح کے مناظر پیش کیے جانے کی خبر سننی پڑے؟

[۱۱] ہم تاریخِ اسلام سے واقف ہیں اِس لیے فلم کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں لیکن ایک غیر تعلیم یافتہ انسان جس کو اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ بھی نہ معلوم ہو، کیا وہ اِس فلم کو آسانی سے سمجھ لے گا، جب کہ تاریخی واقعات کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے والی واقعاتی کڑیاں درمیان سے غائب ہیں۔ صرف چند بڑے واقعات کو ایمائی انداز سے پیش کیا گیا ہے؟ اور اگر کسی نے سمجھ بھی لیا تو آج کا انسان اُس دور کے بارے میں کیا راے پیش کرے گا جس کو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر القرون کے لقب سے نوازا ہے؟ اِس طرح سے یہ فلم دراصل اسلام کی تضحیک کا سبب بنے گی۔

[۱۲] مندرجہ بالا تصریحات تو فلم کے اُن مشاہداتی تاثرات سے متعلق ہیں جو ایک فلم دیکھنے والا قبول کرے گا، لیکن اگر بالکل ''دی میسیج'' ان تمام بدترین قباحتوں سے پاک ہوتی تب بھی شریعتِ اسلامیہ میں حرام قرار دی جاتی، اِس لیے کہ فلم؛ اسلام میں بلا استثنیٰ ہر طرح کی، حرام ہے، خواہ اس سے نتائج اچھے برآمد ہوں یا بُرے۔ اِس لیے کہ سنیما کے پردے پر جو تصویریں دِکھائی جاتی ہیں، وہ بذاتِ خود حرام ہیں۔ ایک درجن سے زیادہ احادیثِ مبارکہ میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر کشی کو حرام قرار دیا ہے، اور اس کی مذمّت فرمائی ہے، اور اِس فلم کو دیکھنا دراصل تصویر کشی کے بڑھتے ہوئے رُجحان کی ہمت افزائی ہوگی۔ ابھی تو پوری دُنیا کے فقہاے اسلام فلم کو بالِاجماع ناجائز قرار دیتے ہیں، لیکن اگر اس فلم کو جائز قرار دیا جائے تو ایک ممنوع اور ناجائز کو جائز قرار دینے کا پہلا اقدام ہوگا، اور قیامت تک اس سے جو مفسدہ پھیلے گا اُس کا ذمے دار وہ ہوگا جس نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ تصاویر اسلام میں اِس لیے-حرام- ہیں کہ ان سے-شرک- کی بنیاد پڑتی ہے۔ دُنیا کی غیر مسلم اقوام نے اپنے اکابرین کی غلط اور محض ظن وتخمین کی بِنا پر جو تمثیلیں بنائی تھیں آج اُن کو حقیقی صورتیں سمجھ کر پوجا جا رہا ہے۔ اور لوگ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ یہ ظن و تخمین کی پیداوار ہیں۔ یہی حال ان صورتوں کا ہوگا جو بنامِ صحابہ پیش کی جا رہی ہیں، اور بعد میں احترام حاصل کرلیں گی۔ چنانچہ میں نے بعض لوگوں کو اخبارات میں چھپی ہوئی حضرت امیر حمزہ کی تصویر کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اسلام کا بہت بڑا کمال ہے کہ اس نے اپنے عظیم افراد کو مرئی اور مجسم شکل میں نہ پیش کرکے ہمیشہ کے لیے ذلیل ہونے سے بچالیا ہے۔

[۱۳] اوّل تو اس فلم کے سلسلے میں تنہا کسی ایک فقیہ یا مفتی کی راے معتبر نہیں ہے لیکن اگر کوئی ایسی جرأت کرے اور علما کے اجماع کے خلاف فتویٰ دے دے کہ یہ جائز ہے، تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ اُس کے نزدیک فلموں کی حرمت وحلّت کا معیار کیا ہے؟ اگر وہ کہتا ہے کہ اچھی فلمیں جائز اور بُری فلمیں ناجائز ہیں، تو پھر فلموں کے اچھے اور برے ہونے کا معیار متعین کرنا ناممکن ہوگا۔ اِس لیے کہ انسانوں کے اندر حُسن وقبح کا مزاج ماحول سے

پیدا ہوتا ہے۔ ایک ماحول میں ایک شے بُری ہوتی ہے تو دوسرے ماحول میں وہی شے اچھی ہوتی ہے۔ پھر تو شاید ہی کوئی ایسی فلم ہو جس کے کچھ افادی پہلو نہ نکالے جاسکیں۔ اِس طرح تمام فلموں کو جائز قرار دینا ہوگا۔ رہا علماے ازہر کا جائز قرار دینا تو ابھی تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ علماے ازہر نے کِن شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ جواز کی تشہیر کی جارہی ہے مگر وجوہِ جواز کو چھپایا جارہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربی میں عالم صرف علومِ دینیہ کے ماہر کو نہیں کہتے بلکہ ہر صاحبِ علم کو کہتے ہیں۔ ازہر ایک یونی ورسٹی ہے جس میں تاریخ داں بھی ہوں گے، جغرافیہ کے عالم بھی ہوں گے۔ نفسیات اور عمرانیات کے ماہر بھی ہوں گے، نباتات اور حیوانات کے عالم بھی ہوں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح کے علما نے اس کو پسند کیا ہے؟ بفرضِ محال اگر مصر کے علماے شریعت نے جواز کا فتویٰ دے دیا ہے تو بھی ساری دُنیا کے مسلمانوں کے لیے یہ سندِ جواز نہیں ہے، اِس لیے کہ مصر کے بعض علماے شریعت نے تو ناصر کی قیادت کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل قرار دیا تھا، وطنیت کے فرعونی تصور کو مذہب کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی تھی، اور یہ ابھی کل ہی کی بات ہے۔

[۱۴] ابھی تو فلم کے ڈائریکٹر مصطفیٰ عقاد صاحب کا عالَم یہ ہے کہ وہ برطانیہ کے ہر شہر سے کچھ سربرآوردہ لوگوں سے ملاقات کرکے فلم کا مجموعی تاثر پوچھتے ہیں۔ مثلاً لندن اور بریڈفورڈ وغیرہ میں ایسے لوگوں کو مدعو کیا گیا جن کا علم شریعت کے بارے میں صفر ہے۔ ان لوگوں نے جو مجموعی تاثر دیا اُس کو وہ سندِ جواز بنا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مصر میں بھی ایسے ہی علما سے جواز لے لیا گیا ہوگا۔ خود مجھ سے گفتگو کے دوران انہوں نے یہ کہا کہ اچھائی یا برائی اُس عمل میں ہے جو لوگ کرتے ہیں، جب کہ دیکھنا گناہ نہیں ہے۔ حالاں کہ شریعت میں نگاہ بھی گنہ گار ہوتی ہے۔ اُنہوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ اِس فلم میں کچھ Lapses ہیں، جس کی وجہ وقت کی کمی ہے۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ اوّل تو اسلامی دُنیا اِس فلم کو کبھی برداشت نہیں کرے گی۔ اور اگر بعض عربی مملکتوں نے برداشت کرلیا تو ہندوستان

اور پاکستان کا مسلمان اِسے کبھی گوارا نہیں کرے گا، اِس لیے کہ ابھی برِ صغیر کے مسلمانوں کی دینی حِس بیدار ہے۔ میں -ورلڈ اسلامک مشن- کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے دُنیا کے تمام مسلمانوں سے اِستدعا کرتا ہوں کہ اِس فلم کا مکمل بائی کاٹ کریں اور مسلم حکومت کے سربراہوں سے اِستدعا کروں گا کہ اِس فلم کو اپنے اپنے ملک میں نمائش کی ہرگز اجازت نہ دیں۔

☆☆☆

سیٹینک ورسز کے سلسلے میں ووٹ کا مؤثر ہتھیار

قارئینِ حجاز کو یاد ہوگا کہ حجاز فروری ۱۹۸۹ء کے شمارے میں مسلمانانِ برطانیہ سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ سلمان رشدی کے سلسلے میں حکومت پر اثر انداز ہونے کے لیے اپنا ووٹ صرف اُس امیدوار کو دیں جو سلمان رشدی کی مذمّت کرے اور مسلمانوں کے مطالبات کی بھر پور حمایت کرے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا یہ اعلان صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوا، بلکہ برطانوی مسلمانوں کی تمام مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور ادبی تنظیموں نے اِس کی تائید کی، اور یہ طے کر لیا گیا کہ مسلمانوں کے ووٹ کا حق دار صرف وہی ہوگا جو مسلمانوں کے مطالبات کی حمایت کرے۔

چنانچہ کونسل کے حالیہ جزوی الیکشن میں ہارنے والے اُمیدواروں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ سلمان رشدی کی حمایت کی وجہ سے مسلمانوں کے ووٹوں سے محروم ہوکر ہار گئے ہیں۔ یہ الیکشن ضمنی تھے، مسلمان اگر متحد ہوکر آئندہ سال کونسلوں کے عام الیکشن، اور اس کے بعد جنرل الیکشن میں ووٹ کی طاقت کو استعمال کریں تو نہ صرف یہ کہ وہ سلمان رشدی کے سلسلے میں حکومت کو جھکنے پر مجبور کر سکتے ہیں بلکہ وہ اپنے تمام دیگر مطالبات کو بھی منوا سکتے ہیں۔

برطانیہ عملاً ایک سیکولر اسٹیٹ ہے، یہاں کی حکومت مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو سمجھنے سے عاری ہے۔ صدیاں گزر گئیں کہ برطانوی پارلی منٹ میں مذہب کے کسی خوش گوار جھونکے کا بھی گزر نہ ہو سکا ہے۔ یہاں کے اربابِ اقتدار تمام انسانی اقدار کو مادیت کی میزان پر تولنے کے عادی ہیں، اور صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔

شیطان رشدی کے اِس قضیے نے مسلمانوں کے اندر اِتحاد و اِتفاق کی اہمیت کا احساس بیدار کر دیا ہے، اور اب وہ یہ حقیقت تسلیم کر رہے ہیں کہ اگر چار لاکھ یہودی برطانیہ میں ایک مؤثر طاقت بن سکتے ہیں تو ۲۰ر لاکھ مسلمان یہاں ایک مؤثر طاقت کیوں نہیں بن سکتے۔

برطانیہ میں کم از کم پارلی منٹ کے ۵۰ر حلقے ایسے ضرور ہیں جہاں مسلمانوں کا ووٹ

توازن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر مسلمان اپنی اِس حیثیت کو محسوس کر لیں تو نہ صرف یہ کہ وہ برطانوی پارلیمنٹ میں اپنے پچاس نمائندے بھیج سکتے ہیں، بلکہ وہ موجودہ حکومت کو تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔ مستقبل میں مسلمانوں کے سیاسی شعور کی بیداری کے ساتھ ساتھ ان کی حیثیت اور بھی مستحکم ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود بادشاہ گر بن کر اُبھریں گے اور جس طرف جھکیں گے اقتدار کا آفتاب وہیں سے اُبھرے گا۔

حکومتِ برطانیہ کو اِس بات کا احساس نہیں تھا کہ قومِ مسلم اِس حد تک خوددار اور باغیرت ثابت ہوگی، چنانچہ ابتداءً اس نے اس سنگین معاملے کو انتہائی سَرسَری نظر سے دیکھا اور مسلمانوں کے جذبات کی پرواہ کیے بغیر سلمان رشدی کی حمایت کر ڈالی، مگر اب یہاں کے اربابِ اِقتدار کے لب و لہجے میں نمایاں تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ وزیرِ اعظم سمیت تمام بڑے بڑے لیڈروں نے اس کتاب کو توہین آمیز اور مسلمانوں کے لیے دل آزار قرار دیا ہے۔ وزیرِ خارجہ، وزیرِ داخلہ اور اپوزیشن کے نمایاں لیڈروں نے مسلمانوں سے ہم دردی کا اظہار کیا ہے، لیکن اِس تضادِ قول و عمل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ دُنیا کے ایک ارب مسلمانوں کے مجرم کو پناہ کیوں دے رہے ہیں؟ اگر شیطان رشدی کی کتاب دل آزار ہے تو اس کو پناہ دینے والے اور اس کی کتاب کو اشاعت و فروخت کے مواقع فراہم کرنے والے بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔

مسٹر میکس میڈن اور کیتھ واز نے اِس کتاب پر پابندی کا مطالبہ کر کے مسلمانوں کے موقف کی بھرپور حمایت کی ہے، یہ مسلمانوں کے جذباتی اِتحاد کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ اسلام دُشمن قوتیں اپنے جُرم کا اعتراف کر رہی ہیں۔ اگر یہاں کے مسلمان مستقل بنیادوں پر ایک شعوری اور پائے دار اتحاد کی بنیاد ڈالیں تو اس کے مستقبل میں انتہائی خوش گوار نتائج برآمد ہوں گے۔

ابتداءً حکومت کے اربابِ حل و عقد نے بنیاد پرست اور ترقی پسند مسلمان کی خود ساختہ اصطلاح کو رواج دینا چاہا، تاکہ ترقی پسندی کے شوق میں مسلمانوں کے دو گروپ ہو

جائیں، مگر مسلمانوں نے بنیاد پرستی کے مقابلے میں ترقی پسندی کی اِصطلاح کو رد کر دیا، اور کمیونسٹوں کے علاوہ تمام مسلمانوں نے خواہ وہ دینی تعلیم سے آشنا ہوں یا مغرب کی درس گاہوں میں پلے بڑھے ہوں خود کو Fundamentalist مسلمان کہلانا اپنے لیے باعثِ افتخار تصوّر کیا۔ مسلمان ڈاکٹروں، انجینئروں، سیاست دانوں اور ادیبوں نے متفقہ طور پر یہ اعلان کیا کہ بنیاد پرست اور ترقی پسند اصطلاح مغرب کی ایجاد ہے۔ اگر مغرب کی نظر میں بنیاد پرستی حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے تو ہم فخر یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم بنیاد پرست ہیں۔ اسلام اصولوں کا مذہب ہے۔ وہ اپنے معاشرے کی بنیاد نا قابلِ تغیر اُصولوں پر استوار کرتا ہے، اِس لیے ہم مسلمان ہیں اور اسلامی معاشرے کے افراد کی حیثیت سے ہم سب قرآن عظیم کے نا قابلِ تغیر فیصلوں کے پابند ہیں، ہنوز مغرب کے سیاسی بازی گر اس غلط فہمی میں ہیں کہ ہم مسلمانوں کو ہم دردی کے چند الفاظ کی رشوت دے کر ان کے فیصلوں پر اثر انداز ہو جائیں گے، لیکن اگر مسلمان اسی طرح متحد رہے تو جلد ہی ان کی خوش فہمیوں کا یہ محل بھی مسمار ہو جائے گا، اِس لیے کہ برطانوی مسلمان صرف زبانی ہم دردی کا قائل نہیں ہے، بلکہ وہ –سیٹینک ورسز– پر پابندی کے ساتھ ساتھ سلمان رشدی کو بھی اس کے منطقی انجام سے دوچار دیکھنا چاہتا ہے اور جب تک مسلمانانِ برطانیہ یہ مقاصد حاصل نہیں کر لیتے حکومت کے خلاف یہ تحریک جاری رہے گی۔

لیبر پارٹی کے رہ نماؤں نے اعلان کیا ہے کہ برسرِ اقتدار آ کر مسلمانوں کے تمام پرائیوٹ اسکولوں کو سرکاری گرانٹ دیں گے اور ان کو وہی حیثیت دی جائے گی جو کیتھولک اور یہودی اسکولوں کو حاصل ہے۔ لیبر پارٹی کا یہ اعلان بھی دراصل ایک سیاسی رشوت ہے۔ مسلمانوں کو متفقہ طور پر یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ ہماری اسکول، ہمارا لباس، ہماری تہذیب، ہماری زبان اور حلال غذا وغیرہ یہ سب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اوّلین حیثیت صرف اِس مطالبے کو حاصل ہے کہ برطانوی حکومت شیطان رشدی کی کتاب کو ضبط کرے اور ایک ایسا قانون منظور کرے جس کی موجودگی میں آئندہ کسی شیطان کو سلمان رشدی بننے کی جرأت نہ ہو سکے۔

باب پنجم

درسِ عمل

اخلاصِ عمل واحضارِ نیت

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالٰی: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ.[البیّنۃ: آیت ۵]

اللّٰہ تعالٰی نے ارشاد فرمایا: اور انہیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللّٰہ کی عبادت اخلاصِ عقیدہ کے ساتھ صرف اسی کے لیے کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سیدھا دین ہے۔

وقال اللّٰہ تعالٰی: لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَادِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ.[الحج: آیت ۳۷]

اللّٰہ ربّ العزت نے ارشاد فرمایا: اللّٰہ کی بارگاہ میں نہ قربانی کا گوشت پہنچے گا اور نہ خون پہنچے گا، البتہ اُس کی بارگاہ میں تمہارا تقویٰ [دِلوں کا اخلاص] باریاب ہوگا۔

وقال اللّٰہ تعالٰی: قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْہُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ.[آل عمران: آیت ۲۹]

اللّٰہ جل جلالہ نے ارشاد فرمایا: اے رسول آپ فرما دیجیے کہ خواہ تم اپنے دِلوں کی باتوں کو پوشیدہ رکھو یا ظاہر کردو اللّٰہ ان سے واقف ہے۔

اعمال کا دارومدار نیّت پر ہے: امیرالمومنین ابوحفص عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں کہ میَں نے رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کو یہ ارشاد فرماتے سُنا کہ اعمال کا دارومَدار نیّتوں پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اُس نے نیت کی، پس جس کی ہجرت اللّٰہ ورسول کے لیے ہو اُس کی ہجرت اللّٰہ ورسول ہی کے لیے ہے اور جس کی ہجرت حصولِ دنیا یا کسی عورت سے شادی کے لیے ہو پس اُس کی ہجرت اُسی کے لیے ہوگی جس کے لیے اُس نے ہجرت کی۔[۱]

لوگوں کا حشر نیّتوں کے مطابق ہوگا: امّ المومنین سیّدتنا عائشہ رضی اللّٰہ عنہا فرماتی ہیں

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ایک فوج کعبہ مقدسہ پر حملہ کرے گی تو جب وہ صحرا میں پہنچے گی تو اس کے پہلے اور بعد والے سب زمین میں دھنسا دیے جائیں گے۔ حضرت امّ المومنین نے سوال کیا کہ یارسول اللہ یہ کیسے ممکن ہے جب کہ ان میں ان کے بازار بھی ہوں گے اور وہ لوگ بھی ہوں گے جو اس حملہ آور فوج میں شامل نہ تھے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ان کے اوّل وآخر سب دھنسا دیے جائیں گے، پھر اُن کا حشر اُن کی نیّتوں کے مطابق ہوگا۔

ہجرت نہیں نیّت: امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں لیکن جہاد اور نیت ہمیشہ باقی رہیں گے، تو جب تمہیں جہاد کے لیے کھڑا کیا جائے تو فوراً چل پڑو۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت اِس لیے نہیں کہ وہ دارالاسلام ہو گیا ہے۔

بغیر عمل کے محض نیّت کا ثواب: حضرت سیّدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں شریک تھے۔ تو حضور نے فرمایا کہ مدینہ میں کچھ لوگ رہ گئے ہیں کہ تم کہیں بھی جاؤ گے اور کسی بھی وادی کو طے کرو گے مگر وہ تمہارے ساتھ ہوں گے۔ اُنہیں مرض نے روک لیا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ اجرِ جہاد میں شریک ہوں گے۔ یہ امام مسلم کی روایت ہے۔ حضرت امام بخاری نے سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جَب ہم غزوۂ تبوک سے لَوٹ رہے تھے تو حضور نے فرمایا کہ کچھ لوگوں کو ہم نے مدَینہ میں چھوڑ دیا ہے، مگر ہم کسی بھی گھاٹی یا وادی سے نہیں گذرے مگر وہ ہمارے ساتھ تھے، انہیں معذوری نے روک لیا تھا۔

[اخذ وترجمہ از ریاض الصالحین للعلامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ]

☆☆☆

[۱] حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: مکہ کے ایک شخص نے اُمّ قیس نامی ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا، تو اُس نے شرط لگائی کہ اگر تم مدینہ ہجرت کرلو تو مَیں تم سے نکاح کرلوں گی۔ چنانچہ انہوں نے ہجرت کی۔ لوگ ان کو مہاجر اُمّ قیس کہتے تھے۔ [طبرانی ومعجم کبیر]

نماز

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ. [العنکبوت: آیت ۴۵]

”بے شک نماز انسان کو تمام برائیوں اور بے شرمیوں سے منع کرتی ہے۔“

آج کے دَور کا سب سے بڑا مسئلہ انسانی معاشرے میں پھیلی ہوئی وہ برائیاں اور بے حیائیاں ہیں جنھوں نے پوری دُنیا کو جہنم میں تبدیل کر دیا ہے۔ دُنیا کی تمام متمدّن قومیں اس بات کی کوشش کر رہی ہیں کہ دُنیا سے برائیوں کا خاتمہ ہو جائے، مگر ہزاروں کوششوں کے باوجود برائیاں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں اور اب تو عالَم یہ ہے کہ برے انسانوں کی دست برد سے دُنیا کا کوئی فرد، کوئی سوسائٹی اور کوئی حکومت محفوظ نہیں ہے۔ حالاں کہ جرم وسزا کے موضوع پر لٹریچر کی بھرمار ہے۔ جاسوسی کا نظام؛ جرائم کو کنٹرول کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ حکومتوں کے کارندے برائیوں کے خلاف مصروفِ عمل ہیں۔ مجرموں کے لیے قید وبند کے علاوہ ان کی اصلاح کے لیے ہزاروں سائنٹیفک طریقے ایجاد کر لیے گئے ہیں۔ جرم کی دریافت کے لیے ہزاروں مسلّح آنکھیں ہر وقت مصروفِ عمل ہیں۔ عقلاے روزگار اور دانش ورانِ عالَم برائیوں کے خلاف کتابوں کے انبار لگا رہے ہیں، مگر ان تمام کوششوں کے باوجود برائیوں میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ شر کی قوتوں نے پورے عالَمِ انسانی کو اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ رکھا ہے، اور اس کی مضبوط گرفت کے نیچے ہر انسان کراہ رہا ہے۔ جرائم کی بڑھتی ہوئی تعداد اور انسانی دُنیا پر برائیوں کی یلغار آج کے دور کا سب سے بڑا چیلنج ہے، جس کا جواب دُنیا کے پاس نہیں ہے مگر قرآن عظیم اس چیلنج کا جواب دے رہا ہے:

”بے شک نماز انسان کو تمام برائیوں اور بے شرمیوں سے روک دیتی ہے۔“

خداے واحد کی کتابِ مقدس نے دُنیا کے تمام جرائم، برائیوں اور بدکرداریوں کو ختم کرنے

کے لیے-نماز-کانسخہ تجویز فرمایا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن برائیوں کو پوری دُنیا اپنے تمام وسائل اور ذرائع کو بروئے کار لاکر بھی دور نہیں کرسکتی ان کو نماز کس طرح دور کرسکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ: دُنیا کی تمام کوششیں انسان کے ظاہری جسم کی پابندیوں سے متعلق ہیں، قیدوبند کی صعوبتیں ہوں یا قوانین کی زنجیریں، یہ سب انسانی دست وپا کو پابندِ سلاسل کرتی ہیں، مگر نماز قلبِ انسانی کو آراستہ کرتی ہے اور اس کے اندر پوشیدہ-خیر-کی قوتوں کو بیدار کرکے-شر-کا خاتمہ کرتی ہے۔

قلبِ انسانی ہی جملہ اعضا اور جوارح کو حکم دیتا ہے۔قلبِ انسان حاکم ہے اور دیگر اعضاوجوارح محکوم ہیں۔ اگر اس کی اصلاح ہوجائے تو پورا جسم سنور جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ شیطان کا حملہ قلبِ انسانی پر سب سے پہلے ہوتا ہے۔طبعی اعتبار سے قلب کا کام جسمِ انسانی میں خون کی سپلائی ہے لیکن اگر اس پر شیطان کا قبضہ ہوجائے تو خون کے ساتھ شر بھی انسانی رگ وپے میں سرایت کرجاتا ہے۔حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الشیطان یجری فی الانسان مجری الدم.

''شیطان جسمِ انسانی میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔''

لیکن جب نماز قلبِ انسانی کو شیطانی اثرات سے پاک کردیتی ہے تو پھر شر کے بجائے خیر گردش کرتا ہے، اور انسان مجسمۂ خیروخوبی بن جاتا ہے۔حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جسمِ انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ سنور جائے تو پورا جسم سنور جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے آگاہ ہوجاؤ کہ وہ قلب ہے۔''

ایک دفعہ حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم؛ صحابۂ کرام کے ساتھ کہیں تشریف لے جارہے تھے، آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کچھ لوگ باری باری ایک پتھر کو دھکا دے رہے ہیں۔آپ نے ارشاد فرمایا کہ: تم لوگ اس پتھر کو کیوں دھکا دے رہے ہو، تو اُنہوں نے عرض کی: تاکہ ہم جان لیں کہ ہم میں سب سے زیادہ طاقت ور کون ہے۔حضور نے ارشاد فرمایا:

الشدید من غلب علٰی نفسہ.

''طاقت ور وہ ہے جو اپنے دل کو قابو میں کرلے۔''

دل قابو میں ہو تو جسم کی طاقت کم زوروں کو سہارا دینے اور گرے ہوئے لوگوں کو اُٹھانے میں صرف ہوگی اور اگر نفس قابو میں نہ ہو تو تمام توانائیاں غریبوں کے استحصال اور بےکسوں کو تباہ کرنے میں خرچ ہوں گی۔ پتا چلا کہ قلبِ انسانی خیروشر کا منبع ہے اور نماز قلبِ انسانی کو شر سے پاک وصاف کرکے خیر کی آماج گاہ بنادیتی ہے۔

نماز گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ ہے: **قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ارأیتم لو ان نھرًا بباب احدکم یغتسل فیہ کل یومٍ خمسًا ھل یبقٰی من درنہ شیٌٔ قال فذا لک مثل الصلوٰۃ الخمس یمحو اللّٰہ بھن الخطایا.** [بخاری ومسلم]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک دریا ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ غسل کرے تو کیا اُس کے بدن پر کوئی مَیل باقی رہ جائے گا؟ حضور نے فرمایا: یہی مثال پانچ وقت کی نمازوں کی ہے۔اللہ ان نمازوں کے ذریعے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

اسلام میں جزا اور سزا کا قانون نافذ ہے۔قرآنِ عظیم میں صراحۃً ارشاد فرمایا گیا:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ.

[الزلزال: آیت ۷۔۸]

''انسان اس دُنیا میں جو کچھ کرے گا آخرت میں اسی کا بدلہ دیا جائے گا۔''

اس سلسلے میں خدائے شہید وبصیر جو کائنات کے ذرّے ذرّے کا مشاہدہ کررہا ہے اور کائنات کی ہر شے اُس کی نگاہِ قدرت کے سامنے ہے۔اس نے اپنے بندے کو مطمئن فرمانے کے لیے یہ اہتمام فرمایا ہے کہ کراماً کاتبین نامۂ اعمال مرتب کررہے ہیں۔ اعضائے جسمِ انسانی اپنے کرتوتوں کی گواہی دیں گے، فرشتے، کتابِ الٰہی، اعمال اور زمینِ عمل یہ سب گواہ ہوں گے تاکہ بندہ کہیں یہ نہ محسوس کرے کہ اس کو سزا اس کے گناہوں کے تناسب سے زیادہ دی جارہی ہے۔ جزا اور سزا کے اسی قانون کے پیشِ نظر حضور سیّدِ عالم

صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید وبصیر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ مسیحی اپنے پیغمبر کو صرف بشیر مانتے ہیں اور یہودی صرف نذیر، مگر حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم بشیر ونذیر دونوں ہیں۔ قرآن عظیم میں کہیں ان کی مبشرانہ حیثیت کو پیش کیا گیا ہے اور کہیں وہ منصبِ انذار پر فائز نظر آتے ہیں، کہیں وہ اعمالِ حسنہ کی جزا کے طور پر جنت کی بشارت دیتے ہیں اور کبھی وہ بداعمالیوں کی سزا کے نتیجے میں دوزخ کے دردناک عذاب سے ڈراتے ہیں۔

حضور کا بشیر ونذیر ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اسلام میں جزا اور سزا کا قانون نافذ ہے، یہی اصل ہے اور اسی کے مطابق فیصلے ہوں گے۔

انسان بشارتوں کے نشے میں مدہوش ہو کر انجام سے بے خبر گناہوں میں ڈوبتا چلا جائے گا۔ وہ یہ یقین کر لے گا کہ خواہ ہم کچھ بھی کریں محض ایک بار صلیبِ مسیح کے سامنے اعترافِ گناہ ہمیں گناہوں سے بچا لے گا اور صرف انذار بھی جہنم سے نہیں بچا سکتا اس لیے کہ انذارِ محض کے بطن سے مایوسی جنم لیتی ہے، اور انسان یہ سوچ لے گا کہ گناہ تو ہو چکے اب اگر جنت سے محرومی مقدر بن چکی ہے تو دُنیاوی لذتوں سے کیوں دست کش ہوا جائے۔ اس طرح اللہ کی رحمت سے مایوسی اُس کو جہنم میں پہنچا دے گی۔ لیکن انسان جب مغفرت کی اُمید اور سزا کا خوف دونوں رکھے گا تو پھر اُس کے قدم صراطِ مستقیم پر گام زَن ہوں گے۔ یہی میزانِ عدل ہے اور اسی کے بارے میں حضور نے ارشاد فرمایا:

الایمان بین الخوف والرجا.

''ایمان امید وبیم کے درمیان ہے۔''

اگرچہ اسلام نے بداعمالیوں کی بڑی سخت سزائیں مقرر کی ہیں، مگر بے شمار ایسے مواقع عطا فرمائے گئے ہیں جہاں انسان اپنے رب کے حضور میں رحمت کا طلب گار ہو کر اپنے گناہوں کی مغفرت کرا سکتا ہے۔ انہیں منجیات میں سے نماز بھی ہے۔ مندرجہ بالا حدیث پاک میں نماز کو دریائے رحمتِ الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ایک انسان جب نماز پڑھتا ہے تو وہ دریائے رحمتِ الٰہی میں غوطہ زَن ہوتا ہے، اور جو رحمتِ الٰہی کے دریا میں غوطہ

زَن ہوا اُس کے جسم پر گناہوں کی کثافت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج مبارک یہ تھا کہ بعض وقت تکوینی حقائق کا مشاہدہ کرانے کے بعد اللہ کے انعام واکرام کو ذہنِ انسانی میں منتقل فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درخت کی خزاں رسیدہ شاخ کو اپنے دستِ کرم سے ہلایا تو اُس کے خزاں رسیدہ پتّے زمین پر بکھر گئے اور شاخ عُریاں ہوگئی۔ آپ نے صحابۂ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ: جس طرح اس شاخ کے ہلانے سے درخت کے پتّے جھڑ گئے ہیں اسی طرح نماز سے انسان کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔

حدیثِ پاک کا صحیح ذوق رکھنے والا یہ نتیجہ ضرور اَخذ کرے گا کہ جب تک خزاں رسیدہ پتّے جھڑ نہ جائیں درخت پر نئے برگ وبار نہیں آ سکتے جو بہار کی ضمانت ہیں۔ اسی طرح جب تک گناہوں کے خزاں رسیدہ پتّوں کو نماز کی تحریک سے جھاڑ نہ دیا جائے اُس وقت تک حیاتِ انسانی کے چمن میں بہار نہیں آ سکتی اور جب خزاں کے پتّے جھڑ جائیں گے تو اعمالِ حسنہ کے شاداب برگ وبار انسانی زندگی کو جنت کی بہاروں سے ہم کنار کر دیں گے، جہاں کبھی خزاں نہ آئے گی۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل بہار ہے؛ اصل خزاں نہیں ہے، یعنی اعمالِ حسنہ ہی اصل ہیں۔ انسان فطرتِ اسلامیہ پر پیدا کیا گیا ہے، ہاں کبھی کبھی گناہوں کی بادِ سموم چلتی ہے تو شجرِ حیات مُرجھا جاتا ہے مگر اس کو دوبارہ بہارِ جاوداں سے ہم کنار کرنے کے لیے نماز کا پابند بننا پڑے گا۔

تارکِ نماز اللہ کے ذمّۂ کرم سے دور ہو جاتا ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا تترکن صلوٰۃ مکتوبۃ متعمدًا فان من ترک صلوٰۃ مکتوبۃ فقد برءَ ت منه ذمة اللّٰہ.

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قصداً فرض نمازیں ہرگز مت چھوڑو اس لیے کہ جو جان بوجھ کر فرض نماز چھوڑتا ہے اُس کو اللہ اپنے ذمّۂ رحمت سے دور کر دیتا ہے۔''

اس حدیث کے راوی حضرت سیّدنا معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ یہ ایک طویل

حدیث کا ایک حصہ ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو چند اہم باتوں کی وصیت فرمائی ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ: خبردار نماز کو قصداً مت چھوڑنا ورنہ اللہ تم سے بری الذمہ ہوجائے گا۔ حدیث پاک میں یہ لب ولہجہ اس وقت اختیار فرمایا جاتا ہے جب اللہ رب العزت کی انتہائی ناراضی کو واضح کرنا مقصود ہو۔ انسان نماز کے ذریعے اپنے قلب کے اندر مخفی ایمان کی عملی تصدیق کرتا ہے کہ اگر وہ خدا پر یقین رکھتا ہے تو اُس کا سجدہ ضرور کرے گا۔ اگر وہ جنت ودوزخ پر یقین رکھتا ہے تو نماز کے ذریعے جنت کے حصول اور جہنم سے بچنے کی ضرور کوشش کرے گا۔ نماز پڑھنے سے اُن تمام عقائد کی عملی تصدیق ہوتی ہے جو قلبِ انسانی کے اندر پوشیدہ ہیں، گویا نماز ایمان کے صحت مند بیج کا حسین وجمیل پودا ہے۔

نماز کی ادائیگی اگر گناہوں سے مغفرت اور حصولِ جنت کا ذریعہ ہے تو ترکِ نماز عذابِ الٰہی اور جہنم کا موجب ہے۔ انسان کی آخری امید اللہ رب العزت کا کرم اور اُس کی بخشش ہے، مگر وہ انسان کتنا بدنصیب ہے جس کے بارے میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ خبر دیں کہ: وہ اللہ کی رحمت سے دور کردیا گیا ہے اور اب آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

نماز جہاں انسان کو قربِ خداوندی کے شرف سے نوازتی ہے، وہیں آخرت کی کامیابیوں کی ضمانت بھی ہے۔ نماز انسان کے اندر پوشیدہ خیر کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے والی ہے، اس لیے کہ انسان خیر پر پیدا کیا گیا ہے۔ کل مولود یولد علی الفطرة الاسلامية لیکن کبھی کبھی شر کی قوتیں غالب آجاتی ہیں اور انسان اپنی فطرتِ اولیٰ سے بغاوت کرکے فطرتِ ثانیہ پیدا کرلیتا ہے۔ انسان اگر نماز کا پابند ہوجائے تو وہ فطرتِ اصلیہ کی طرف لوٹ آتا ہے، لیکن جو بدنصیب اللہ کی تخلیق کردہ فطرت سے انحراف کرکے برائی کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ اس دُنیا میں بھی اللہ کے کرم، اس کی بخشش اور عطا سے محروم رہتا ہے اور آخرت میں بھی اُسے جہنم کے دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

[اخذ وترجمہ از: ریاض الصالحین للعلامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ]

☆☆☆

فضائل صیام

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ. اَیَّامًامَّعْدُوْدٰتٍ. فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَرِیْضًا اَوْعَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ. وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ ط فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌلَّہٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌلَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ ط وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْعَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوااللّٰہَ عَلٰی مَاھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ. [البقرۃ: آیت ۱۸۳۔۱۸۵]

اے اہلِ ایمان تم پر روزے اُسی طرح فرض کیے گئے ہیں جس طرح گذشتہ اُمتوں کے اوپر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ، یہ روزے چند گنتی کے دن ہیں ان دنوں میں اگر تم میں سے کوئی مریض ہوجائے یا سفر پر ہو تو وہ صحت یا قیام کے دنوں میں اس تعداد کو پوری کرلے، جو لوگ استطاعت نہ رکھتے ہوں اُن کے روزے کا فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے لیکن اگر تم میں سے کوئی نیکی کے شوق میں زیادہ کرے تو یہ اس کے حق میں بہت بہتر ہے، اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ اس سے بھی بہتر ہے اگر تمہیں علم ہو۔ رمضان کا مہینہ وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآنِ عظیم کے نزول کا آغاز ہوا، یہ قرآن لوگوں کا ہادی ہے اور ہدایت کی روشن دلیلیں لے کر جلوہ گر ہوا ہے، یہ حق وباطل کے درمیان واضح تفریق کرنے والا ہے۔ پس تم میں سے جو اس مہینے میں موجود ہو، وہ پورے ماہ کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا حالتِ سفر میں ہو تو وہ بعد میں اس کی گنتی پوری کرلے، اللہ تمہارے لیے سہولتوں کو

پسند فرماتا ہے دشواریوں کو نہیں، یہ حکم اس لیے ہے کہ تم روزوں کا شمار مکمل کرلو اور اس احسانِ عظیم کے بدلے میں کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے اُس کی بزرگی بیان کروتا کہ تم شکر گذار بن جاؤ۔

نگاہِ قدرت میں روزے کی حیثیت: سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا[حدیث قدسی]: انسان کے جملہ اعمال اس کے لیے ہیں مگر روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا [یہ میرا کرم اس کا بدلہ بن جائے گا] تم میں جو شخص روزہ دار ہو اُس کے لیے ضروری ہے کہ نہ وہ فحش کلام کرے، نہ ناپسندیدہ کلمات زبان سے ادا کرے، نہ کسی سے جھگڑا کرے اور اگر کوئی اُس کو گالی دے یا جھگڑے پر آمادہ کرنا چاہے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔ قسم ہے اُس ذاتِ پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے روزہ دار کے منھ کی خوش بو اللہ رب العزت کو مشک سے زیادہ محبوب ہے۔ روزہ دار کو دو مسرّتیں حاصل ہوتی ہیں: ایک افطار کے وقت اور ایک قیامت کے دن جب وہ اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے روزے کی جزا پائے گا۔

یہ الفاظ بخاری شریف کے ہیں۔ اسی کی ایک اور روایت میں ہے کہ وہ میری وجہ سے کھانا پینا اور دیگر خواہشات کو چھوڑتا ہے پس روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ہوتا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ آدمی کے تمام نیک اعمال کا بدلہ دس گنا سے سات سو گنا تک ہے، لیکن اللہ رب العزت فرماتا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ وہ اپنی خواہش اور خورد و نوش کو میرے لیے چھوڑتا ہے، اسے دو خوشیاں حاصل ہوں گی ایک افطار کے وقت اور ایک اپنے اللہ سے ملاقات کے وقت۔ روزہ دار کے منھ کی خوش بو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں مشک سے بہتر ہے۔

جنت کا دروازہ: حضرت سہل ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک دروازہ ہوگا جس کا نام ''ریان'' ہوگا۔ اس دروازے سے صرف روزہ دار ہی داخل ہوں گے، ان کے علاوہ اور کوئی داخل نہ ہوگا۔ ان سے کہا

جائے گا روزہ دار کہاں ہیں تو وہ کھڑے ہو جائیں گے۔ اُن کے علاوہ اور کوئی بھی اس دروازے سے داخل نہ ہوگا اور جب وہ داخل ہو جائیں گے تو دروازہ بند ہو جائے گا تاکہ کوئی اور داخل نہ ہو سکے۔

ستّر سال کی مسافت کی مقدار دوزخ سے دوری: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے راستے میں ایک روزہ رکھے گا اللہ رب العزت ایک دن کے بدلے ستّر سال کی مسافت کی مقدار اُس کو جہنم سے دور فرما دے گا۔

روزہ تمام گذشتہ گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ: سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: جو شخص ایمان واحتساب [طلبِ ثواب] کے لیے روزہ رکھے گا اللہ رب العزت اُس کے تمام گذشتہ گناہوں کو معاف کر دے گا۔

[اخذ و ترجمہ از: ریاض الصالحین للعلامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ]



استقبالِ رمضان

ماہِ صیام جلوہ گر ہو چکا ہے۔ مسلمانانِ عالَم نے رحمت ومغفرت سے معمور اس ماہِ رمضان مبارک کا انتظار پورے ایک سال تک کیا۔ سالِ گذشتہ وداعِ رمضان کے وقت انہوں نے بھیگی ہوئی پلکوں اورلرزتے ہوئے دلوں کے ساتھ خداے قدیر کی بارگاہ میں دُعا کی تھی کہ اے اللہ! ہمیں اس طرح کے بہت سے مبارک مہینوں کی زیارت نصیب فرما اور اس رمضان کو ہماری زندگی کا آخری رمضان نہ بنا، اوراگر یہ رمضان ہماری زندگی کا آخری رمضان ہو تو اس کو ہماری مغفرت اور نجات کا ذریعہ بنادے۔ اللہ نے ان کی دُعا قبول کرلی اوراب وہ ایک بار پھر اس مبارک مہینے کی زیارت اور اس کی برکتوں سے اپنے دامنِ مراد کو بھرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اہلِ طاعت اس ماہِ مبارک کے ایک ایک لمحے کو اپنی زندگی کا عظیم سرمایہ تصور کرتے ہوئے مصروفِ عبادت وریاضت ہیں۔ گناہ گار اس شہرِ مغفرت کو اپنی نجات کا ذریعہ خیال کرتے ہوئے مصروفِ توبہ واستغفار ہیں۔ اہلِ احسان اس شہرِ کریم کو رحمتِ الٰہی اور موہبتِ خداوندی کا موسمِ خاص تصور کرتے ہیں۔ اور خداے ذوالجلال کے حضور میں سجدہ ریز ہیں۔

اربابِ عزیمت اس ماہِ مبارک کو عزیمت کی دشوار گذار وادیوں میں استقامت کا ذریعہ مانتے ہوئے خداے عظیم کی بارگاہ میں دست بہ دُعا ہیں کہ اللہ رب العزت ان کے پاے استقامت کو لغزشوں سے محفوظ رکھے۔

اہلِ حاجت اس شہرِ رحمت کو عطاے الٰہی اور بخششِ خداوندی کا وسیلہ جان کر اس غنی اور بے نیاز کے حضور میں سجودِ نیاز پیش کررہے ہیں؛ تاکہ اللہ رب العزت انہیں استغنا کی لازوال دولت سے آسودہ فرمادے۔

اہلِ تقویٰ اس ماہِ مبارک کو زہد واتقا کی فصلِ بہار جانتے ہوئے اس منّانِ حقیقی کی بارگاہ میں دست بہ دُعا ہیں کہ اللہ رب العزت اُن کے لرزتے ہوئے دل کی نذر قبول فرما کر

انہیں ابدی سعادتوں سے نوازے۔

اہلِ معرفت یہ یقین کرتے ہوئے کہ یہ ماہِ مبارک انعامِ خداوندی کا وسیلہ ہے، اپنے آئینۂ قلب کو عبادت وطاعت سے مزید مجلّٰی کررہے ہیں کہ بارِ حجاب اُٹھے اور اس کے الطافِ کریمانہ کی ایک تجلّی اسے روشن ومنوّر کرجائے۔

قرآنِ عظیم کی تلاوت کا شغف رکھنے والے اس ماہِ مبارک کو نزولِ قرآن کا مہینہ جان کر شب وروز مصروفِ تلاوت ہیں تاکہ قرآنِ عظیم کو نازل فرمانے والا پروردگار اس ماہِ مبارک کے صدقے میں انہیں قرآنِ عظیم کی برکتوں سے نوازے اوران کی زندگی کو انوارِ قرآن سے منوّر فرمادے، ان کی قبر کی تاریکیاں ضیاے قرآن سے کافور ہوجائیں اور حشر کی ہولناکیاں اس کی تلاوت کے اُنس سے مٹ جائیں، اور اللہ کی کتاب خداے غفار کے حضور میں ان کی شفاعت کرے۔ وہ ہر شب تراویح کی مقدس ساعتوں میں قرآن پاک سننے کا اہتمام کرتے ہیں تاکہ وہ نزولِ قرآن کی اس مقدس سال گرہ کی خیرات سے محروم نہ رہ جائیں۔

اہلِ ایمان اس ماہِ مبارک کو روحانی تربیت کا زمانہ تسلیم کرتے ہوئے اپنی تربیت میں مصروف ہیں۔ وہ تمام نمازوں کو ان کے مستحب اوقات میں ادا کرتے ہیں۔ اپنی آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پیر اور جملہ اعضا وجوارح کو گناہوں کی آلودگی سے حتی الامکان محفوظ رکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں تاکہ اس شہرِ رحمت کی برکت سے ان کا پورا سال گناہوں سے محفوظ ومامون ہوجائے۔

اپنے نفس کو شیطان کے فریب سے محفوظ رکھنے کی خواہش رکھنے والے اس ماہِ مقدس کو اللہ کا انعام تصور کرتے ہوئے شب وروز مصروفِ طاعت ہیں، تاکہ رحمتِ الٰہی انہیں اپنے حصارِ حفاظت میں لے لے اوران پر شیطان کا داؤ نہ چل سکے۔ اس لیے کہ اس ماہِ مبارک میں شیطان پابندِ سلاسل کردیا جاتا ہے اور جن خوش نصیب مسلمانوں پر اللہ کا کرم ہوجاتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے شیطان اور نفس کے فریب سے مصئون ومامون ہوجاتے ہیں۔

طلب گارانِ رضاے الٰہی؛ حضور سیّد الانس والجان صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مقدس

پر ایمان لاتے ہوئے اس کے پہلے عشرے میں رحمتِ الٰہی، دوسرے عشرے میں مغفرتِ خداوندی اور تیسرے عشرے میں جہنم سے آزادی کی طلب میں مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں دستِ سوال پھیلائے ہوئے ہیں۔ مالکِ حقیقی کی خوش نودی طلب کرنے والے آخری عشرے میں تمام علائقِ دُنیوی سے علاحدہ ہوکر مسجد کے ایک گوشے میں معتکف ہیں تاکہ وہ رمضان شریف کی برکتوں سے بیش از بیش فیض یاب ہوسکیں اور اپنے رب کی بارگاہ میں اپنے شکستہ قلوب اور برستی ہوئی آنکھوں کی نذریں پیش کرسکیں۔ انہیں یقین ہے کہ علائقِ دُنیوی سے ان کا یہ قطعِ تعلق انہیں دُنیا کی گندگیوں سے پاک وصاف کردے گا اور ان کے اندر ایک ایسا ذوقِ خلوت نشینی پیدا ہوجائے گا کہ وہ رمضان کے بعد دُنیا کی مصروفیات میں مبتلا رہ کر بھی خلوت درجلوت کا کیف اُٹھاتے رہیں گے۔

قدر شناسانِ حیات اپنی زندگی کو انوارِ ربانی سے منوّر کرنے کے لیے رمضان شریف کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں اُس ساعتِ سعید کو تلاش کررہے ہیں، جس نے بے شمار انسانوں کے مقدر چمکا دیے، جس نے فرش نشینوں کو عرش کی رفعتیں بخشیں، جس نے مستحقینِ جہنم کو جنت سے ہم کنار کیا، جس نے انسانوں کے پیکرِ خاکی کو ملکوتی جمال سے نوازا اور جس نے فراق وہجر کے مارے ہوئے افراد کو وصال کی لذّتوں سے ہم کنار کیا، جس نے گناہ گاروں کو بخشش کا مژدہ سُنایا، جس نے اپنی زندگی کے اختصار پر افسوس کرنے والوں کو ایک ہزار مہینے کی مقدس راتوں کا ثواب عطا فرما کر انہیں عمرِ خضر پانے والے طاعت گذاروں کے ہم دوش کردیا۔ جس کی شان میں قرآنِ عظیم کی ایک پوری سورت نازل ہوئی، جس میں روح الامین آسمانی فرشتوں کے جلو میں انسانوں سے ملتے ہیں اور انہیں رحمت ومغفرت کا مژدہ سُناتے ہیں۔

جہاں ایک طرف مسلمانوں کی اکثریت رمضان پاک کی برکتوں کے حصول کے لیے رمضانِ پاک کا احترام کرتی ہے وہاں چند ایسے بدنصیب بھی نظر آتے ہیں جو رمضان

پاک کی سعادتوں سے کلیۃً محروم ہیں۔ وہ اس ماہِ مبارک میں گناہوں سے باز نہیں آتے، نہ خود روزہ رکھتے ہیں اور نہ ہی روزے کا احترام کرتے ہیں۔ ہم خدائے غفور کی بارگاہ میں دست بہ دُعا ہیں کہ رب العزت انہیں روزے کے احترام کی توفیق عطا فرمائے اور انہیں مرنے سے پہلے کم از کم ایک ایسا رمضان عطا فرمائے جب ان کے دل رمضان کے احترام سے لبریز ہوں۔

''ادارہ حجاز'' جملہ مسلمانانِ عالم کو رمضان پاک کی مبارک باد پیش کرتا ہے۔ اور اس کے اراکین خدائے پاک کی بارگاہ میں دست بہ دُعا ہیں کہ اللّٰہ رب العزت انہیں رحمت و مغفرت سے معمور؛ اس طرح کے بہت سے رمضان کے استقبال کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین بجاہِ حبیبہٖ سیّد المرسلین صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم.



حج

قَالَ اللّٰہ تعالٰی. وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ. [آل عمران: آیت ۹۷]

ترجمہ: اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ کا لوگوں پر یہ حق بصورتِ فرض ہے کہ وہ بیت اللہ شریف کا حج کریں اگر وہ سفر کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو اللہ رب العزت کے حکم سے رُوگردانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ جملہ اہلِ عالَم سے بے نیاز ہے۔

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: سیّدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ شریف کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔ [بہ روایت امام احمد، امام بخاری و مسلم و ترمذی]

اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال واجب ہو جاتا: سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے درمیان خطبہ ارشاد فرمایا کہ: اے لوگو! بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر حج فرض کر دیا ہے تو حج کرو۔ ایک آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا ہر سال؟ تو آپ خاموش رہے۔ اس شخص نے اسی طرح تین بار سوال کیا تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دوں تو تم پر واجب ہو جائے گا اور تم اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ مجھے چھوڑے رکھو جب تک کہ میں تمہیں چھوڑے رکھوں [یعنی جب تک میں تمہیں خود سوال کا موقع فراہم نہ کروں] اس لیے کہ تم سے قبل کچھ لوگ اپنے سوالوں کی کثرت اور اپنے انبیاے کرام سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ اس لیے جب تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق

اس پر عمل کرو اور جب کسی بات سے روک دوں تو رُک جاؤ۔ [بہ روایت امام مسلم]

ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے بعد حج مبرور سب سے افضل ہے: سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو حضور نے فرمایا: ایمان باللہ۔ پھر عرض کیا گیا اس کے بعد۔ تو پھر فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد۔ پھر عرض کیا گیا اس کے بعد۔ تو آپ نے فرمایا: حج مبرور۔ [بخاری و مسلم]

مبرور وہ حج ہے جس میں حج کرنے والا ہر طرح کی نافرمانی کے ارتکاب سے محفوظ رہے۔

نومولود کی طرح بے گناہ: سیّدنا ابو ہریرہ ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: جس نے حج کیا اور بے ہودہ گوئی اور فسق و فجور سے محفوظ رہا وہ حج کے بعد گناہوں سے اس طرح پاک وصاف لوٹے گا جیسے اُس کی ماں نے آج ہی اُس کو جنا ہو۔ [بخاری و مسلم]

حج مبرور کی جزا صرف جنت ہے: سیّدنا ابو ہریرہ ہی بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ درمیان کے تمام گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کی جزا صرف جنت ہے۔ [بخاری و مسلم]

تمہارے لیے بہترین جہاد حج مبرور ہے: امّ المومنین سیدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ: میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے خیال میں جہاد سب سے افضل عمل ہے تو کیا ہم بھی جہاد نہ کریں؟ تو حضور نے ارشاد فرمایا تمہارے لیے بہترین جہاد حج مبرور ہے۔ [بخاری شریف]

عرفہ جہنم سے آزادی کا دن: امّ المومنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: عرفہ کے دن سے زیادہ کسی دن بھی اللہ اپنے بندوں کو جہنم سے آزاد نہیں فرماتا۔ [مسلم شریف]

رمضان کا عمرہ رسول اللہ کے ساتھ حج کی طرح ہے: سیّدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے، یا یہ میرے ساتھ حج کے برابر ہے، [راوی کو شک ہے] [بخاری و مسلم]

بوڑھے باپ کی طرف سے حج بدل: سیّدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ: ایک عورت نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا: اللہ کی طرف سے بندوں پر فریضۂ حج نے میرے والد کو اس حالت میں پایا ہے کہ وہ بہت بوڑھے ہیں، اور سواری پر بیٹھنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے، کیا میں اُن کی جانب سے حج کرلوں؟ حضور نے ارشاد فرمایا: ہاں۔ [بخاری و مسلم]

ضعیف باپ کی طرف سے حج اور عمرہ: حضرت لقیط ابن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: میرے والد بہت بوڑھے ہیں اور حج اور عمرہ کی استطاعت رکھتے ہیں اور نہ ہی سفر کرسکتے ہیں۔ تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے والد کی طرف سے حج اور عمرہ کرو۔ [ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی اور فرمایا کہ حدیث حسن صحیح ہے۔]

رسول اللہ کے ساتھ حج کی سعادت: حضرت سائب ابن یزید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کرایا گیا جب کہ میں ابھی سات سال کا تھا۔ [بخاری شریف]

بچے کا حج اور ماں کو ثواب: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روحا کے مقام پر ایک قافلے سے ملاقات کی۔ آپ نے سوال فرمایا کون سے لوگ ہیں؟ اہلِ قافلہ نے جواب دیا ہم مسلمان ہیں۔ انہوں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ حضور نے فرمایا میں اللہ کا رسول ہوں، تو ایک عورت نے اپنے بچے کو اُٹھایا اور پوچھا کیا اس کا حج بھی قبول ہوگا؟ حضور نے فرمایا ہاں اور اس کا اجر تمہیں ملے گا۔ [مسلم شریف]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی سواری پر حج فرمایا جس پر آپ کا سامان بھی لدا ہوا تھا۔ [یعنی سامان رکھنے کے لیے کوئی دوسری سواری نہ تھی۔] [بخاری شریف]

حج کے ساتھ رزقِ حلال کا حصول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: عکاظ، مجنۃ اور ذوالمجاز ایّامِ جاہلیت کے بازار تھے۔ صحابہ نے یہ خیال فرمایا کہ ایّامِ حج میں ان بازاروں میں تجارت گناہ ہے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی **لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ** [البقرۃ:۱۹۸] **فی مواسم الحج.** [بخاری شریف] تمہارے لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ حج کے ایّام میں اللہ کا فضل [رزقِ حلال] حاصل کرو۔

[اخذ و ترجمہ از ریاض الصالحین للعلامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ]

☆☆☆

توبہ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالٰی :

وَتُوْبُوْآ اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّہَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ.

[النور: آیت ۳۱]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تم سب اجتماعی توبہ کرو تاکہ فلاح حاصل کرسکو۔

وقال تعالٰی :

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْآ اِلَیْہِ. [ھود: آیت ۵۲]

اللہ رب العزت نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

اپنے رب سے استغفار کرو پھر اس کے حضور میں توبہ کرو۔

وقال تعالٰی:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْآ اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا [التحریم: آیت ۸]

اللہ عزوجل نے ایک جگہ اور ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو اپنے اللہ کے حضور میں حقیقی اور سچی توبہ کرو۔

سیّد المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم دن میں ستّر بار سے زیادہ توبہ کرتے تھے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ ارشاد فرمارہے تھے کہ: اللہ رب العزت کی قسم میں اپنے اللہ کے حضور میں ایک دن میں ستّر مرتبہ سے زیادہ توبہ واستغفار کرتا ہوں۔

سیّدِ عالَم صلی اللہ علیہ وسلم دن میں سو بار توبہ فرماتے تھے: حضرت اعز بن یسار مزنی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ: اے لوگو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں توبہ واستغفار کرو اس لیے کہ میں خود دن میں سو بار توبہ کرتا ہوں۔

بندے کی توبہ سے اللہ تعالیٰ کی خوشی: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ: اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اُس انسان سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جس کی سواری اُس کے خورد ونوش کے جملہ سامان کے ساتھ ایک چٹیل میدان میں گم ہوجائے اور وہ تلاش کرتے کرتے مایوس ہوکر ایک درخت کے سائے میں سوجائے۔ مایوسی کے اس شدید عالَم میں جب اُس کی آنکھ کُھلے تو دیکھے کہ اُس کی سواری اُس کے پاس کھڑی ہے، وہ اُس کی لگام پکڑ لے اور شدتِ خوشی میں یہ پکار اُٹھے: ''اے اللہ میں تیرا رب اور تُو میرا بندہ ہے'' اُس کی یہ غلطی وفورِ فرح و مسرت کی وجہ سے ہوگی، [جو معاف کردی جائے گی]

جاں کنی کے اضطراب سے پہلے توبہ کی قبولیت: سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: حضور سرورِ عالَم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندے کی توبہ اُس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک وہ سکراتِ موت میں مبتلا نہ ہوجائے۔

[اخذ و ترجمہ از: ریاض الصالحین للعلامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ]

☆☆☆

جہاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالٰی: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ. [التوبۃ: آیت ۱۱۱]

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔ یہ لوگ جب خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں تو قتل بھی کرتے ہیں اور شہید بھی ہوتے ہیں۔ یہ تورات اور انجیل نیز قرآن میں اس کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ وعدے کا ایفا کرنے والا کون ہوسکتا ہے تو خوشیاں مناؤ اپنے اُس سودے کی جو تم نے اپنے اللہ سے کیا ہے اور یہی عظیم کامیابی ہے۔

سب سے اچھا عمل: سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: اللہ و رسول پر ایمان لانا۔ پھر سوال کیا گیا اس کے بعد کون سا عمل بہتر ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ پھر سوال کیا گیا اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: حج مبرور۔

افضل الاعمال: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کیا کہ کون سا عمل افضل ہے تو آپ نے فرمایا: اللہ پر ایمان اور اس کے راستے میں جہاد۔

دُنیا و مافیہا سے بہتر: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ: حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ کے راستے میں ایک صبح و شام گزارنا دُنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

سب سے بہتر انسان: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نے سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی کہ تمام انسانوں میں

کون سا انسان سب سے افضل ہے؟ فرمایا: وہ مومن جو اللہ کے راستے میں اپنے مال اور نفس کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔ عرض کیا پھر کون؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: وہ مومن جو گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں اللہ کی عبادت کرتا ہے اور لوگوں کو اپنے شر سے بچاتا ہے۔

اسلامی سرحدوں کی حفاظت: حضرت سہل ابن سعید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے راستے میں اس کے دین کی سرحدوں کی ایک دن حفاظت کرنا دُنیا اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس سے بہتر ہے۔

اسلامی سرحدوں کا محافظ: حضرت فضالہ ابن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ: ہر مسلمان کا عمل موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے مگر جو دین کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے اُس کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے اور وہ فتنۂ قبر سے محفوظ رہتا ہے۔

مجاہد کی جنت: سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ: جنت کے سو درجے ہیں، جن کو اللہ نے صرف مجاہدین کے لیے مخصوص فرمایا ہے اور ان کے دو درجوں کا درمیانی فاصلہ زمین و آسمان کی وسعت کے برابر ہے۔

دو عظیم آنکھیں: سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: دو آنکھیں ایسی ہیں جن کو آگ نہ چھو سکے گی۔ اللہ کے خوف سے رونے والی آنکھ اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرنے والی آنکھ۔

اسلام کے غازی: حضرت خالد بن زید رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ: جس نے کسی غازی کے سامان کی تیاری میں مدد کی وہ بھی غازی ہے اور جس نے کسی غازی کے گھر والوں کی خبر گیری کی وہ بھی غازی ہے۔

شہید کی تمنّا: سیّدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جنت میں داخل کیا جانے والا کوئی انسان یہ پسند نہیں کرے گا کہ اُس کو دُنیا میں واپس بھیج دیا جائے خواہ اُس کو دُنیا و مافیہا کا مالک کیوں نہ بنا دیا جائے، مگر شہید یہ تمنّا کرے گا کہ وہ دُنیا میں واپس جائے اور دس بار شہید کیا جائے کیوں کہ حصولِ شہادت کے سلسلے میں اس نے بے پناہ عزت و وجاہت دیکھی ہے۔ [اخذ و ترجمہ از: ریاض الصالحین للعلامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ]

صداقت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ. [التوبۃ: آیت ۱۱۹]

''اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''

وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ [الاحزاب: آیت ۳۵]

فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ. [سورہ محمد: آیت ۲۱]

''اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورت .... اگر وہ اپنے پروردگار سے سچائی کا معاملہ کریں تو یہ ان کے لیے بہتر ہوگا۔''

صدق جنت کی طرف اور کذب جہنم کی طرف لے جاتا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سچائی نیکی کی طرف رہ نمائی کرتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ جب انسان ہمیشہ سچ بولتا ہے تو اللہ کی بارگاہ میں -صدیق- کی حیثیت سے درج کرلیا جاتا ہے۔ اسی طرح جھوٹ برائی کی طرف رہ نمائی کرتا ہے اور برائی جہنم میں لے جاتی ہے، اور جب انسان مسلسل جھوٹ بولتا ہے تو اللہ کی بارگاہ میں کذاب کی حیثیت سے درج کرلیا جاتا ہے۔

سچائی اطمینان اور جھوٹ اضطراب ہے: حضرت سیّدنا ابو محمد حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات یاد کرلیے ہیں کہ: جو چیز تمہیں شک میں مبتلا کرنے والی ہو اُس کو چھوڑ دو اور ایسی چیز اختیار کرو جو شک وشبہہ سے بالاتر ہو، اس لیے کہ سچائی اطمینانِ قلب اور جھوٹ شک وشبہہ کے اضطراب میں مبتلا کرنے والا ہے۔

وہ ہمیں سچائی کا حکم دیتے ہیں: حضرت ابوسفیان صخر بن حرب اپنی ایک طویل

روایت میں ہرقل کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ہرقل نے مجھ سے سوال کیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تم کو کس بات کا حکم دیتے ہیں؟ تو میں نے جواب دیا کہ وہ ہمیں تعلیم دیتے ہیں کہ تم ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دو اور اپنے آباواجداد کے اقوال پر عمل کرنے سے باز آجاؤ، وہ ہمیں نماز، سچائی، پاک دامنی اور صلہ رحمی کی تاکید فرماتے ہیں۔

سچائی کا اجر شہادت ہے: سہل بن حنیف جو غزوۂ بدر میں شریک ہونے والے صحابی ہیں روایت فرماتے ہیں کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو سچے دل سے اپنے رب سے شہادت کا طلب گار رہتا ہے تو خواہ وہ اپنے بستر پر انتقال کرے پھر بھی اللہ اُس کو شہدا کے مراتب سے سرفراز فرماتا ہے۔

صداقت موجبِ برکت ہے: حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بائع اور مشتری جب تک جدا نہ ہوں اختیار باقی رہتا ہے۔ اگر دونوں سچ بولیں اور ہر بات کی وضاحت کریں تو اُن کے کاروبار میں برکت ہوگی اور اگر وہ کچھ چھپا رکھیں اور کذب بیانی سے کام لیں تو اُن کے کاروبار سے برکت اُٹھالی جاتی ہے۔

[اخذ وترجمہ از: ریاض الصالحین للعلامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ]

☆☆☆

باب ششم

اُجالوں کے سفیر

فاطمہ رضی اللہ عنہا کا لال میدانِ کربلا میں

حضرت امام حُسین کی وِلادت: حضرت اُم الفضل بنت الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمِ ناز کا ایک حصہ کٹ کر اُن کی گود میں آ گیا ہے۔ صبح ہوئی تو وہ بہت گھبرائی ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنا خواب بیان کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب سُن کر تبسّم فرمایا کہ اِس میں گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ جلد ہی میری لختِ جگر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ایک مبارک بچہ پیدا ہوگا، جس کی پرورش تمہارے ذمے ہوگی۔ یہ سُن کر حضرت اُم الفضل خوش ہوگئیں۔ اِس بشارت کے مطابق حضرت امام حسین کی ولادت ۴؍ شعبان المعظم ۴ھ کو ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو بے پناہ مسرور ہوئے اور آپ خود ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے اور ارشاد فرمایا: ''میرے بیٹے، میرے لختِ جگر کو میرے پاس لاؤ''......

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ایک ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر حضرت امام حُسین کو آپ کی گود میں دیا۔ آپ نے اُن کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں تکبیر فرمائی اور ان کا نام حُسین تجویز کیا اور ارشاد فرمایا کہ ساتویں روز حُسین کا عقیقہ ہوگا اور اُن کے بالوں کے برابر تَول کر چاندی خیرات کی جائے گی۔ چوں کہ حضرت امام حُسین کے بڑے بھائی حضرت اِمام حسن کی مدتِ رضاعت ختم نہیں ہوئی تھی اِس لیے دودھ پلانے اور ابتدائی تربیت کی سعادت حضرت اُم الفضل بنت حارث کے حصے میں آئی۔ حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم؛ حضرت فاطمہ کے دونوں شہزادوں حضرت امام حسن اور حضرت امام حُسین سے بہت زیادہ محبت فرماتے تھے۔ ہر نماز کے بعد آپ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر تشریف لے جاتے اور ارشاد فرماتے: ''اَلسَّلامُ عَلَیکُم یَا اَھلَ البَیْت السنوۃ'' یہ سُن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے دونوں صاحب زادوں کو لے کر حاضر ہوتیں، حضور انھیں اپنی گود میں لیتے، انھیں پیار فرماتے اور پھر اپنے حجرۂ اقدس میں تشریف لے جاتے۔

جب آپ کبھی سفر کا قصد فرماتے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر جاتے، حضرت امام حسن اور حضرت امام حُسین کو گود میں لیتے، دیر تک دُعائیں دیتے رہتے اور اس کے بعد سفر کے لیے تشریف لے جاتے۔ حضرت اُسامہ ابن زید فرماتے ہیں کہ: ایک رات میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درِ اقدس پر حاضر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اِس حالت میں نکلے کہ آپ کے ہاتھ میں ایک چادر تھی جس میں کچھ موجود تھا۔ میں نے پوچھا، حضور چادر میں کیا ہے؟ تو آپ نے چادر کھول دی۔ میں نے دیکھا کہ اُس میں حضرت حُسین لیٹے ہوئے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا، اے اللہ میں انھیں محبوب رکھتا ہوں تو بھی انھیں محبوب رکھ۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم؛ حضرت حُسین کو اپنے دائیں زانو اور حضرت ابراہیم کو اپنے بائیں زانو پر بٹھائے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السّلام تشریف لائے اور انھوں نے فرمایا: یارسول اللہ! آپ اِن دونوں شہزادوں میں سے کسی ایک کو انتخاب فرمالیجیے، اللہ اِن دونوں کو جمع نہ فرمائے گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں حُسین کا انتخاب کرتا ہوں، اِس لیے کہ حُسین کے انتقال پر میں اور میری لختِ جگر فاطمہ اور علی سب غم گین ہوں گے، اور ابراہیم کا غم تنہا میرا غم ہوگا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حُسین پر اپنے لختِ جگر ابراہیم کو قربان کر دیا۔

حضرت امام حُسین اِس قدر حَسین تھے کہ جب آپ اندھیرے میں بیٹھے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی پیشانی سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حُسین مجھ سے ہیں اور میں حُسین سے ہوں۔ جو حُسین کو دوست رکھتا ہے، اے اللہ تو بھی اُسے دوست رکھ! حُسین میرے بیٹوں میں سے ایک بیٹا ہے۔ حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حسن اور حُسین جنت کے دو پھول ہیں، حسن اور حُسین میرے دو پھول ہیں۔ حسن اور حُسین جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔ حضرت انس نے سوال فرمایا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اہلِ بیت میں سب سے زیادہ محبت کس سے

ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا حَسن اور حُسین سے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ نے حسن کو ہیبت اور سرداری اور حُسین کو سخاوت اور شجاعت عطا فرمائی ہے۔

ایک دفعہ سفر سے پہلے آپ حضرت فاطمہ کے دولت کدے پر تشریف لے گئے تو آپ نے گھر کے اندر حضرت حُسین کے رونے کی آواز سُنی۔ آپ بے قرار ہوگئے۔ آپ نے جناب فاطمہ کو آواز دی۔ آپ کے چہرۂ اقدس پر خفگی کے آثار تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ فاطمہ! کیا تمھیں معلوم نہیں کہ حُسین کے رونے سے مجھے بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ ایک دفعہ حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے کہ حضرت حُسین ننھے ننھے قدموں سے آپ کے جسمِ ناز پر چڑھنے لگے۔ آپ نے اُن کے ہاتھوں کو پکڑ لیا اور ارشاد فرمایا: ”اے چھوٹے چھوٹے قدموں والے اوپر آ۔“...... ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ آپ نے دیکھا، حضرت امام حُسین مسجد کے باہر ننگے قدموں تپتی ہوئی دھوپ میں چلے آرہے ہیں۔ آپ سے اُن کی یہ تکلیف دیکھی نہ گئی۔ آپ نے انھیں گود میں اُٹھا لیا اور خطبہ اِس حالت میں دیا کہ امام حُسین آپ کے سینۂ اطہر سے لپٹے ہوئے تھے۔

تعلیم و تربیت: اس کائنات میں چار اشخاص کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ معلّمِ کائنات حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تعلیم و تربیت خود فرمائی۔ وہ چار حضرات یہ ہیں:

حضرت امام حسن، حضرت امام حُسین، حضرت علی اور حضرت زید۔ رضی اللہ عنہم

حضرت امام حُسین کو جُملہ آدابِ حیات کے ساتھ ساتھ ارکانِ دین کی تعلیم خود حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ نماز کی عملی تربیت دینے کے لیے آپ انھیں اپنے ساتھ مسجد میں لے جاتے۔ حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی اور ۱۲/سال کی عمر شریف تک آپ تعلیم کے ساتھ فنونِ جنگ کے ماہر ہوگئے تھے۔ آپ اُن چند صحابہ میں سے ہیں جن کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُن کی کم سِنی کی روایتیں بھی سَند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ حضرت علی کی طرح انتہائی فصیح و بلیغ تھے۔ آپ کے خطبات اور آپ کے اشعار آپ کی عظمتِ علمی

کے شاہد ہیں۔

امام حسین جب جوان ہوئے تو اُن تمام خوبیوں کے حامل تھے جو ایک عظیم تر انسان کے لیے ضروری تھیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا، آپ کے مربی؛ مربیِ کائنات حضور صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے معلّم باب مدینۃ العلم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اس کے ساتھ آپ نے ایک ایسی ماں کی آغوش میں پرورش پائی جن کی آغوش سے بڑھ کر کسی ماں کی آغوش کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جن کے والد شیرِ خُدا، جن کے نانا رسولِ خدا، جن کی والدہ خاتونِ جنت ہوں اُن کا کیا عالَم ہوگا۔

حُسنِ اخلاق: آپ کا اخلاق؛ اخلاقِ رسول کا پرتَو تھا، چنانچہ آپ غریبوں پر رحم کرتے، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کرتے تھے۔ تمام انسانوں سے پیار اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ زندگی بھر آپ نے کسی کا دِل نہیں دُکھایا، بلکہ آپ ہر دُکھے ہوئے دِل پر پیار کا مرہم رکھتے تھے۔ امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اِرشاد فرماتے ہیں کہ: حضرت امام حُسین محتاجوں اور بیواؤں کے گھر خود کھانا پہنچاتے تھے اور اس سلسلے میں اِس قدر مشقّت اُٹھاتے تھے کہ آپ کی پشت پر نشانات پڑ گئے تھے۔ کبھی کبھی آپ محتاجوں کو اپنے گھر کا کُل اثاثہ دے دیتے اور معذرت کرتے کہ اِس وقت یہی ہے۔ اللہ آپ کو غنی کرے۔ ع

خود بھیک دیں اور خود کہیں منگتا کا بھلا ہو

حضرت امام حُسین نے فرمایا:

ان خير المال ماوقى به العرض.

بہترین مال وہ ہے جس سے کسی کی آب رُو بچائی جاسکے۔

ایک مرتبہ ایک کنیز گرم شوربے کا پیالہ لیے ہوئے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہُوئی۔ وہ پیالہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور آپ کی ران پر گر گیا۔ آپ نے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا، اُس نے قرآنِ کریم کی یہ آیتِ شریفہ تلاوت کی:

والکاظمين الغيظ...... متّقی لوگ غصہ پی جاتے ہیں۔

حضرت امام حُسین نے جواب دیا:

کظمت غيظي...... مَیں نے اپنا غصہ پی لیا۔

کنیز نے تلاوت کی:

والعافين عن النّاس...... اور اہلِ تقویٰ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

امام حُسین نے فرمایا:

عفوت عنک ...... میں نے تمہیں معاف کیا۔

کنیز نے تلاوت کی:

واللّٰه يحبّ المحسنين...... اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

آپ نے ارشاد فرمایا:

اِذهبی انت حرة...... جا، تو آزاد ہے۔

حضرت امام حُسین خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہ میں: یارِ غارِ رسول؛ خلیفۂ اوّل سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب سریرآرائے مسندِ خلافت ہوئے تو اُس وقت حضرت امام حُسین کی عُمر شریف صرف سات سال کی تھی، اِس لیے اس عہد کا کوئی واقعہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے، البتہ متعدد روایات سے یہ پتا چلتا ہے کہ جب آپ راہ میں اِمام حُسین کو مِل جاتے تو اُن کو پیار کرتے اور دیر تک اُن کے ساتھ رہتے یا کہیں آپ کو آتا ہوا دیکھتے تو ٹھہر جاتے تاوقتیکہ آ نہ جائیں، یا خود اُن کے پاس تشریف لے جاتے، اُن کی خیریت دریافت فرماتے اور پھر روانہ ہوتے۔

حضرت امام حُسین خلیفۂ دوم عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہ میں: خلیفۂ اوّل کی طرح خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی آپ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ایک دفعہ امام حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ؛ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحب زادے سیّدنا عبداللہ ابن عمر کے ساتھ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کے لیے ان کے دولت کدے پر گئے۔ مگر اندر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہ؛ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مصروفِ گفتگو تھے۔ آپ تھوڑی دیر تک باہر انتظار فرماتے رہے، پھر حضرت عبداللہ ابن عمر کے ساتھ واپس آگئے۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے اُن سے اپنے جانے کا واقعہ بیان فرمایا۔ سیّدنا عمر فاروق نے ارشاد فرمایا: ''شہزادے! واپس ہونے کی کیا ضرورت تھی، میرے پاس جو کچھ ہے وہ آپ کے نانا جان سیّدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا ہے۔''

جب مدائن فتح ہوا تو بہت سا مالِ غنیمت مسجدِ نبوی کے اندر آیا، آپ نے جب اُس کو مجاہدین میں تقسیم فرمانا شروع کیا تو آپ نے اپنے صاحب زادے سیّدنا عبداللہ ابن عمر کو ۵۰۰/ درہم اور حضرت سیّدنا امام حُسین کو ۱۰۰۰/ درہم عطا فرمایا۔ سیّدنا عبداللہ ابن عمر نے کہا: ''حضور میں امام حُسین سے عمر میں بڑا ہوں، جب وہ مدینے کی گلیوں میں کھیلتے تھے تو میں معرکوں میں جہاد کرتا تھا۔'' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: ''عبداللہ چلے جاؤ، پہلے ان کے باپ جیسا باپ، ان کی ماں جیسی ماں، ان کے نانا جیسے نانا اور ان کی نانی جیسی نانی لاؤ پھر کچھ کہو۔ عبداللہ تم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔'' جب ایران فتح ہوا تو نوشیرواں کی پوتی حضرت شہر بانو گرفتار ہوکر آئیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ:
''میں نے ایران کی شہزادی کا عقد دین کے شہزادے امام حُسین سے کرنا منظور کرلیا ہے۔''

مندرجہ بالا واقعات کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاے اسلام حضرت امام حُسین سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ہمیشہ اِس بات کا خیال رکھتے تھے کہ حضرت امام حُسین اُن سے راضی رہیں۔ اُنھیں اِس بات کا بھرپور احساس تھا کہ حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم؛ حضراتِ حسنین سے بے پناہ محبت فرماتے تھے اور ان کو اپنا جگر گوشہ اور نگاہوں کی ٹھنڈک قرار دیتے تھے۔

یزید کا کردار: یزید ۲۵ھ میں بہ عہدِ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ دمشق میں پیدا ہوا، اُس کی والدہ کا نام مسیون تھا، جو قبیلہ بنو کلب کے سردار بحدل ابن انیف کی بیٹی تھیں۔ یزید

نے اپنے نانہال میں پرورش پائی۔ چوں کہ وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابۂ کرام کی زندگیوں سے ہمیشہ دور رہا اِس لیے اُس کے اندر وہ اعلیٰ صفات پیدا نہ ہوسکیں جو اُس دور کے مسلمانوں کا طرّۂ امتیاز تھا۔ یزید کے اندر بہت سی خراب عادتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ اُس کی طبیعت باغیانہ تھی، مذہب کی اعلیٰ اقدار سے نفرت کرتا تھا، مذہبی مجالس اور مذہبی ماحول سے ہمیشہ دور رہتا تھا۔ اِس کے برعکس شراب اور رقص وسرود سے دل چسپی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''وہ شام کو شراب پینا شروع کردیتا ہے تو صبح کردیتا ہے اور صبح کو شراب پینا شروع کرتا ہے تو شام کردیتا ہے۔''

''**انساب الاشراف للبلاذری**'' البدایہ والنہایہ میں علامہ ابن کثیر نے فرمایا:
''یزید کی طبیعت شہوت کی طرف مائل رہتی تھی اور تارکُ الصلوٰۃ تھا۔ ایک دفعہ یزید اپنے ملازمین کو ڈانٹ پھٹکار رہا تھا کہ حضرت امیر معاویہ تشریف لائے اور انھوں نے یزید کو سخت سُست کہا، اور آخر میں ارشاد فرمایا: ''خدا تیرا بُرا کرے، تو اُس پر ظلم کرتا ہے جو تجھ سے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا۔''

مندرجہ بالا واقعات سے یزید کی طبیعت اور اس کے کردار کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت اِمام حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میدانِ کربلا میں جو خطبہ دیا تھا اُس کے ایک حصے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یزید اسلام کی حدود کو توڑتا تھا۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال جانتا تھا۔ چنانچہ امام حُسین نے فرمایا تھا:

''آگاہ ہوجاؤ! ان لوگوں نے اللہ کی اطاعت چھوڑ دی ہے۔ شیطان کی اِتباع کرنے لگے ہیں، فتنہ وفساد برپا کرتے ہیں، حدودِ شرعی سے دست کش ہیں، مالِ غنیمت کو اپنا مال تصور کرتے ہیں، حرام کو حلال اور حلال کو حرام تصور کرتے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا کردار کا آدمی جب امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین بن جاتا اور اُس کی بدکرداریوں کو دُنیا کے سامنے بے نقاب نہ کیا جاتا تو وہ اسلام کی صورت مسخ کر

دیتا، اسلامی قوانین بدل دیتا، معاشرے کو بُرائیوں سے بھر دیتا، شراب اور زِنا کو عام کر دیتا۔ **الناس علیٰ دین ملوکھم**......لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں...... جب مسلمانوں کا امیر یہ کرتا تو پھر مسلم معاشرے کا کیا حال ہوتا اِس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام حُسین نے یزید کی بیعت سے انکار فرمایا۔ جان دے دی مگر ہاتھ نہیں دیا، جس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

حضرت امیر مُعاویہ کا انتقال اور یزید کی تخت نشینی: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آخری وقت آیا تو اُنھوں نے یزید کو بُلایا اور کہا کہ اب میری زندگی کا آخری وقت ہے۔ اِس لیے میں تم کو وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو ہمیشہ کامیاب رہو گے۔ میرے بعد جب تم برسرِ اقتدار آنا تو قرآنِ عظیم کی ہدایات پر عمل کرنا، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی زندگی کو پیشِ نظر رکھنا، تمہارا مقابلہ عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن زبیر سے ہوسکتا ہے۔ حُسین سے درگزر کرنا اور ہمیشہ حسنِ سلوک سے کام لینا۔ عبداللہ ابن عمر گوشہ نشین آدمی ہیں، اُن سے مت اُلجھنا۔ البتہ عبداللہ ابن زبیر صاحبِ تدبیر اور طاقت ور ہیں اِس لیے اُن سے جنگ کرسکتے ہو۔

یزید نے اِس وصیت کے جواب میں صرف اِتنی بات کہی کہ میں قرآن پر عمل کروں گا، لیکن حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی سیرت سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ شکار پر روانہ ہوگیا، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی جان خدائے قدوس کے سپرد اِس حالت میں کی کہ یزید شکار پر تھا۔ حضرت امیر معاویہ کے انتقال کے بعد یزید نے اپنی تخت نشینی کا اِعلان کیا اور اپنی بیعت لینی شروع کی۔ اُس نے مدینہ کے گورنر ولید ابن عتبہ کو حکم بھیجا کہ حضرت امام حُسین، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی بکر، حضرت عبداللہ ابن زبیر سے میری بیعت لی جائے اور اگر یہ لوگ انکار کریں تو انھیں گرفتار کرلیا جائے اور آمادۂ جنگ ہوں تو شہید کردیا جائے۔

ولید ابن عتبہ گورنر مدینہ کے لیے یہ بڑا مشکل مقام تھا، وہ بیعت کا مطالبہ تو کرسکتا تھا

مگر ان بزرگ ترین شخصیتوں کے خلاف اعلانِ جنگ اُس کے بس کی بات نہیں تھی، چنانچہ اُس نے حضرت امام حُسین کو طلب کیا۔ حضرت امام حُسین کو معلوم ہوگیا تھا کہ یزید کی بیعت کا مطالبہ ہونے والا ہے، چنانچہ آپ نے اپنے ساتھ جاں نثاروں کا دستہ لیا اور اُن سے کہہ دیا کہ اگر میری واپسی میں زیادہ تاخیر ہوجائے تو دارُالامارت میں گھس کر مجھے رِہا کرانے کی کوشش کرنا۔ آپ اندر تشریف لے گئے تو ولید ابن عتبہ نے حضرت امیر معاویہ کے انتقال کی خبر دی۔ آپ نے اظہارِ افسوس فرمایا اور ”انا للّٰہ و انا الیہ راجعون“ پڑھا۔

اس کے بعد ولید ابن عتبہ نے عرض کیا کہ یزید کا حکم ہے کہ میں آپ سے بیعت لوں یا آپ کو گرفتار کرلوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یزید کی بدکرداریوں کے پیشِ نظر میں یزید کی بیعت نہیں کرسکتا۔ میں یزید کو اِس قابل نہیں سمجھتا کہ اُس کو امامتِ کبریٰ کا وہ مصلّٰی دے دیا جائے جس پر سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کھڑے ہوچکے ہیں۔ ولید ابن عتبہ نے کہا آپ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرلیں۔ یہ سُن کر آپ وہاں سے اُٹھے اور واپس چلے آئے۔ دولت کدے پر تشریف لاکر آپ نے اپنے احباب اور جاں نثاروں کو جمع فرمایا اور اُن سے مشورہ فرمایا کہ ہمارا آئندہ اِقدام کیا ہونا چاہیے۔

آپ کے برادرِ عزیز حضرت محمد ابن الحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشورہ دیا کہ مدینہ طیبہ میں اگر آپ نے قیام فرمایا تو جنگ ناگزیر ہوجائے گی اور اس صورت میں حرمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بےحُرمتی ہوگی، اِس لیے مناسب یہ ہوگا کہ آپ مکہ مکرمہ تشریف لے جائیں اور وہاں حالات کا مطالعہ فرمائیں۔ کم ازکم یزید وہاں یہ جرأت نہ کرے گا کہ آپ سے زبردستی بیعت لے۔ حضرت امام حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ مشورہ پسند فرمایا اور اپنے اہلِ خاندان کو اپنے عزم سے مطلع کیا۔

امام حُسین روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر: اس کے بعد حضرت امام حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ؛ حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے، سلام عرض کرنے کے بعد یوں عرضِ مدّعا کی:

''نانا جان! آپ کے پردہ فرما جانے کے بعد ہم پر جو مصیبتیں ٹوٹیں اُن میں سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ آج ہم آپ کا روضہ چھوڑ رہے ہیں۔ یارسول اللہ! ہمارا الوداعی سلام لیجیے اور دُعا کیجیے کہ خدا ہر مشکل میں ہمیں ثابت قدم رکھے۔''

حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کے بعد جنت البقیع میں حضرت سیّدہ فاطمہ زہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے روضے پر حاضری دی اور عرض کیا:

''آپ کی جُدائی کے بعد ظالموں کو یہ بھی گوارہ نہ ہوا کہ میں آپ کی قبرِ انور کے بھی قریب رہ سکوں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ مکہ والوں نے میرے آقا میرے نانا جان پر ظلم کیا تھا تو انہوں نے مدینہ میں قیام فرمایا تھا اور آج اُن کا کلمہ پڑھنے والے میرا قیام مدینہ میں ناممکن بنا رہے ہیں۔ اِس لیے میں مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگیا۔ محترم ماں اپنے حُسین کا آخری سلام لیجیے اور دُعا فرمایے کہ دُنیا کی کوئی تکلیف ہمیں صراطِ مستقیم سے نہ ہٹا سکے۔''

جب آپ مع اہل وعیال رفقا و جاں نثاروں کے مدینۂ طیّبہ سے نکلے تو آپ کے لبِ اقدس پر وہی دُعا تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے لبِ مبارک پر اُس وقت تھی جب وہ مصر چھوڑ رہے تھے یعنی فخرج منها خائفاً قال رب نجنی من القوم الظالمین.

اور جب آپ مکہ مکرمہ پہنچے تو آپ کے لبِ اقدس پر وہی دُعا تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے مدین پہنچ کر کی تھی فلما توجه تلقاء مدین قال عسی ربّی ان یهدینی الیٰ سواء السبیل. پس جب مکہ مکرمہ کے پاس پہنچے تو فرمایا: عن قریب اللہ مجھے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت فرمائے گا۔

آپ ۳؍شعبان ۶۰؍ہجری کو مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور وہاں پہنچ کر عبادت و ریاضت اور اصلاحِ مسلمین کے کام میں مصروف ہوگئے۔ آپ نے یزید کی تخت نشینی کو فراموش کر دیا اور گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا، مگر شُد نی وہ جو بے ہوئے نہ رہے، قدرت کو تو کچھ اور منظور تھا۔

جب اہلِ عراق خاص طور پر اہلِ کوفہ اور اہلِ بصرہ کو یہ اطلاح ملی کہ حضرت امام حُسین نے یزید کی بیعت سے انکار فرمادیا ہے اور مدینہ طیّبہ چھوڑ کر مکہ روانہ ہوگئے ہیں تو وہ لوگ کوفہ

کے ایک رئیس عبداللہ ابن مرو کے مکان پر جمع ہوئے اور انہوں نے یزید کی مخالفت اور امام حُسین کی موافقت میں تقریریں کیں اور اس بات پر زور دیا کہ خلیفۂ برحق حضرت امام حُسین ہیں، ہمیں یزید جیسے فاسق و فاجر کے ہاتھ بیعت کرنے کے بجائے حضرت امام حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہیے اور اُنھیں مجبور کرنا چاہیے کہ وہ کارِ خلافت کو انجام دیں۔ جب ایک صالح ترین قیادت موجود ہے تو پھر ہم یزید کی بیعت پر کیوں راضی ہوں۔ چنانچہ بہ اتفاق رائے، وہیں بیٹھ کر امام حُسین کو خط لکھا گیا جس کے بعض الفاظ یہ ہیں:

''یا امام! آپ تشریف لائیں تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے ہم کو حق پر جمع کر دے۔ جب آپ تشریف لائیں گے تو ہم یزید کے عامل کو کوفہ سے نکال دیں گے۔ آپ تشریف لائیں، آپ کی مدد کے لیے لشکر تیار ہے۔''

اِسی طرح اہلِ بصرہ ماریہ بنت سعد کے گھر پر جمع ہوئے اور وہاں حضرت امام کے حق میں شعلہ بار تقریریں کی گئیں اور بہت سے خطوط لکھے گئے جن میں زور دیا گیا کہ آپ جلد از جلد تشریف لائیں تاکہ ہم آپ کی بیعت کر کے سعادتِ دارین حاصل کریں۔ آخری خط میں یہاں تک تحریر کر دیا گیا کہ:

''اگر آپ نے ہماری دعوت قبول نہ فرمائی اور یزید امیر المومنین بن گیا تو پھر اُس کی ذات سے دین میں فتنہ پیدا ہوا تو ہم میدانِ قیامت میں خدا اور اُس کے رسول کے حضور میں آپ کی شکایت کریں گے کہ ہم نے اسلام میں اُٹھنے والے فتنوں کے سلسلے میں امام حُسین سے مدد مانگی تھی مگر انہوں نے انکار فرمادیا اور ہم ظلم کے ہاتھوں میں ہاتھ دینے پر مجبور ہوگئے۔''

مندرجہ بالا خط کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوسکتا ہے کہ امام حُسین نے کس عظیم ترذمے داری کو محسوس کرتے ہوئے کربلا کا قصد فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ نے سیکڑوں خطوط موصول ہونے کے بعد اپنے اہلِ خاندان کو جمع فرمایا اور اُن سے مشورہ کیا۔ سب نے بہ اتفاقِ رائے منع کیا اور کہا کہ کوفہ اور بصرہ کے لوگوں کی وفاداریاں آزمائی ہوئی ہیں۔ اُن لوگوں نے

آپ کے والدِ محترم کے ساتھ فریب کیا اور انھیں نقصان پہنچایا۔ یہ آپ کو ضرور نقصان پہنچائیں گے۔ منع کرنے والوں میں حضرت عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن عباس اور عبدالرحمٰن ابن ابی بکر نیز حضرت محمد ابن الحنیفہ اس وقت کی قابلِ قدر شخصیتیں تھیں۔ آپ نے سب کی بات سننے کے بعد ارشاد فرمایا کہ آپ لوگوں کی محبت اور اخلاص بجا مگر وہ لوگ مجھے خدا اور رسول کا واسطہ دے رہے ہیں۔ ایک ظالم اور غاصب کے خلاف دین کی امامت کی عظیم ذمے داری میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں، اگر میں نے اُن کی بات نہ مانی اور اُن کی دعوت قبول نہ کی تو عنداللّٰہ مجھ سے مواخذہ ہوگا۔ حضرت امام حُسین نے یہ بھی فرمایا کہ حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ: میری اُمّت کے ایک فرد کے ذریعے حرمِ مکہ میں خون بہے گا اور بیت اللہ کی حرمت تباہ ہوگی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ شخص میں بنوں۔

حضرت محمد ابن الحنیفہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ اگر آپ جانا ہی چاہتے ہیں اور آپ نے عزمِ محکم فرمالیا ہے تو صرف اِتنی بات مان لیجیے کہ پہلے آپ خود نہ جایے بلکہ اپنے بھائی مُسلم کو روانہ کر دیجیے۔ وہ وہاں جا کر آپ کو تفصیلی حالات سے آگاہ کریں۔ اگر وہاں کے حالات واقعی ویسے ہوں جیسے کہ خطوط اور قاصدوں کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں۔ تو آپ اللہ کا نام لے کر سفر کیجیے، خدا آپ کا حافظ و ناصر ہو۔ آپ نے اپنے بھائی حضرت مُسلم ابن عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طلب فرمایا اور کوفہ جانے کے سلسلے میں اُن سے کہا۔ انہوں نے بسر و چشم آپ کے فیصلے کو قبول فرمایا، اور کوفہ جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ حضرت امام حُسین نے کوفہ اور بصرہ کے ذمے دار افراد کو جو خط ارسال فرمایا تھا اُس کا آخری حصہ یہ ہے:

''جو کچھ تم نے لکھا تھا میں اُس سے مطلّع ہوا، فی الحال میں اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو بھیج رہا ہوں۔ اگر تمہارے اُمرا نے اپنے کیے ہوئے وعدوں کے مطابق عمل کیا تو میں بھی جلد ہی عازمِ سفر ہوں گا ان شاءاللہ! بلا شبہہ امام وہی شخص ہوسکتا ہے جو قرآن پر عمل کرے، عادِل ہو اور دینِ حق پر قائم ہو۔''

حضرت امام مسلم اپنے دو کم سِن صاحب زادگان کے ساتھ جب کوفہ پہنچے تو کثیر افراد نے آپ کا استقبال کیا، اور دو روز کے اندر ہی اندر ایک روایت کے مطابق ۱۸؍ ہزار اور ایک روایت کے مطابق ۳۰؍ ہزار افراد نے آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی۔ عوام کا یہ اشتیاق اور بیعت پر اِس قدر ہجوم دیکھ کر آپ نے حضرت حُسین کے نام ایک خط ارسال فرمایا جس میں تحریر فرمایا کہ: اہلِ کوفہ و بصرہ نے خطوط میں جو وعدے کیے تھے وہ انہوں نے پورے کیے، ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کے قیام اور نظامِ عدل کے نفاذ کے لیے راہ مکمل طور پر ہموار ہے۔ آپ جس قدر جلد ممکن ہو سکے تشریف لائیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کوفہ کوتاہیوں کا کفّارہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔

کوفہ میں جو لوگ یزید کے ہوا خواہ تھے اُنھوں نے امام مسلم کی تشریف آوری اور اہلِ کوفہ کی بیعت کا حال یزید کو لکھ بھیجا اور اُس سے درخواست کی کہ اگر فوراً کوئی جوابی اقدام نہ کیا گیا تو تمہارے اقتدار کی چولیں ہل جائیں گی۔ یزید کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اُس نے اپنے ایک مشیر سرجون کو بلایا جو یہودی تھا اور اُس سے مشورہ کیا کہ اِن حالات میں ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ سرجون نے مشورہ دیا کہ آپ نے اپنے قریبی عزیز عبیداللہ ابن زیاد کو ہمیشہ نظر انداز کیا، اور کبھی اِس قابل نہیں سمجھا کہ آپ اُس سے مصافحہ کریں، حالاں کہ ایسے موقع پر اُس سے زیادہ مناسب آدمی اور کوئی نہ ہوگا جو آپ کی مدد کر سکے۔ وہ سخت دل، طاقت ور اور ظلم و جبر کا رسیا ہے۔ نرم دلی اُس کے قریب سے بھی نہیں گذری ہے۔ وہ سخت سے سخت حالات پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ آپ اُسے بُلایے اور اقتدار میں حصہ دیجیے، اگر ممکن ہو تو کوفہ اور بصرہ کی گورنری پیش کیجیے۔ پھر وہ امام حُسین اور اُن کے اعوان و انصار سے نمٹ لے گا۔

یزید کو یہ مشورہ صائب معلوم ہُوا۔ اُس نے بِلا تاخیر عبیداللہ ابن زیاد کو بُلایا اور اُس سے پہلی بار رفق و ملاطفت کی باتیں کیں اور کوفہ و بصرہ کی گورنری پیش کی۔ عبیداللہ ابن زیاد کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یزید اُس کو اِس قابل سمجھے گا۔ اُس نے اِس

اعزاز پر انتہائی مسرت کا اظہار کیا، اور وعدہ کیا کہ ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔

یزید نے عبیداللہ ابن زیاد کو حکم دیا کہ وہ بلا تاخیر روانہ ہوجائے اور وہاں پہنچ کر حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ سے باہر نکال دے یا شہید کر دے۔

عبیداللہ ابن زیاد نشۂ اِقتدار میں جھومتا ہوا کوفہ کی طرف روانہ ہوا، مگر کوفہ کے قریب پہنچ کر اُسے معلوم ہوا حالات اُس کے قابو سے باہر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اُس نے اپنا منھ ڈھانک لیا اور حجازیوں جیسے لباس پہن لیے۔ جب وہ کوفہ میں داخل ہوا تو لوگوں نے سمجھا کہ حضرت امام حُسین تشریف لائے ہیں۔ پھر کیا تھا پورا کوفہ استقبال کے لیے ٹوٹ پڑا اور ''یا ابنِ رسول اللہ'' کا نعرہ لگنے لگا۔ عبیداللہ ابن زیاد دل ہی دل میں مُسکراتا ہوا دارالامارت کی طرف بڑھا اور جب وہ دارالامارت کے قریب پہنچا تو کوفہ کے موجودہ گورنر حضرت نعمان ابن بشیر نے بہ آوازِ بلند کہا: ''اے ابنِ رسول اللہ! آپ دارالامارت میں تشریف نہ لائیں، ہم آپ کو یہاں پناہ نہ دے سکیں گے، ہم یزید کے مامور ہیں۔'' یہ سُن کر عبیداللہ ابن زیاد آگ بگولہ ہوگیا، اُس نے اپنا چہرہ کھول دیا اور کہا: ''میں حُسین نہیں عبیداللہ ابن زیاد ہوں۔ افسوس کہ تمہاری نرمی نے یہ دن دکھایا ہے۔ تم بُزدل ہو۔''

حضرت نعمان ابن بشیر نے جواب دیا: ''اللہ کی اطاعت میں رہتے ہوئے کم زور کہلوانا میرے لیے اللہ تعالیٰ کا گنہ گار بن کر طاقت ور کہلانے سے زیادہ بہتر ہے۔''

عبیداللہ ابن زیاد نے اعلان کیا کہ آج سے میں گورنر ہوں۔ دارالامارت کے باہر مجمع اب بھی - یا ابنِ رسول اللہ - کا نعرہ لگا رہا تھا۔ اب عبیداللہ ابن زیاد کے اندر تابِ ضبط نہ رہی، وہ دارالامارت کی چھت پر چڑھ گیا اور اعلان کیا:

''اے لوگو! میں حُسین ابن علی نہیں ہوں، عبیداللہ ابن زیاد ہوں۔ پورا عرب میرے کارناموں سے واقف ہے۔ میرے دل میں حدود سے تجاوز کرنے والوں کے لیے رحم و کرم کا کوئی گوشہ نہیں۔ اگر تم میں سے کسی نے یزید کی مخالفت کی تو مخالفت کرنے والوں کا پورا کنبہ اور خاندان اور اُس کے جملہ اعوان و انصار کا خون ہمارے لیے جائز ہوگا، ہم اُنھیں

پھانسی پر چڑھا دیں گے اور اُن کے لیے حکومت کی جملہ مراعات چھین لیں گے۔ ہم انھیں آگ میں جھکوا دیں گے۔''

عبیداللہ ابن زیاد نے دھمکیوں کے ساتھ یہ جھوٹا اعلان بھی کیا کہ: یزید کی لاتعداد فوج جلد ہی کوفہ پہنچنے والی ہے۔ میں تنہا نہیں آیا ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ کوفیوں کے اوسان خطا ہوگئے اور - یا ابنِ رسول اللہ - کا نعرہ لگانے والے مجمع میں سے چھٹنا شروع ہوگئے، یہاں تک کہ چند لمحوں میں پورا دارالامارت خالی ہوگیا۔ اب اُس نے کوفہ کے رؤسا و اُمرا کی ایک میٹنگ طلب کی، اور اُس نے اس میٹنگ میں ہر ایک سے پوچھا کہ امام مسلم کہاں مقیم ہیں۔ جب سب نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اُس نے اعلان کیا کہ جو امام مسلم کو گرفتار کرے گا اُسے انعام دیا جائے گا اور جو اُن کو پناہ دے گا اُس کے پورے گھر کو قتل کر دیا جائے گا۔

حضرت امام مسلم حضرت ہانی کے گھر میں مقیم تھے، مگر حضرت ہانی کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اپنے معزز مہمان کی اطلاع دارالامارت میں کریں۔ انہوں نے یہ اعلان سُنا اور خاموش رہے۔ اس درمیان میں حضرت ہانی شدید بیمار ہوگئے۔ عبیداللہ ابن زیاد نے سُنا تو اُن کی عیادت کے لیے اُن کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ بعض لوگوں نے حضرت امام مسلم اور حضرت ہانی کو مشورہ دیا کہ جب عبیداللہ ابن زیاد ملاقات کے لیے آئے تو اُس کو قتل کر دیا جائے، مگر دھوکے سے اس قتل کو نہ حضرت ہانی نے پسند فرمایا اور نہ ہی حضرت مسلم نے گوارا کیا۔ عبیداللہ ابن زیاد عیادت کے لیے آیا۔ اس درمیان میں امام مسلم سامنے نہیں آئے مگر اُس نے کسی طرح یہ اندازہ کر لیا کہ حضرت مسلم یہیں مقیم ہیں۔ وہ واپس گیا اور اُس نے اپنے غلام معقل کو کچھ تحائف اور ایک جعلی خط دے کر حضرت ہانی کے ہاں بھیجا۔ اُس نے حضرت ہانی سے جا کر کہا: ''میں بصرہ سے آرہا ہوں، بصرہ والوں نے حضرت مسلم کو بیعت کے لیے دعوت دی ہے، خط بھیجا ہے اور نذر پیش کی ہے۔'' حضرت ہانی کو اعتبار آگیا، انہوں نے معقل کی ملاقات حضرت مسلم سے کرادی۔ فریب کار معقل وہاں سے واپس آیا اور عبیداللہ ابن زیاد کے اس شبہے کی تصدیق کر دی کہ امام مسلم حضرت ہانی کے گھر

مقیم ہیں۔

عبیداللہ ابن زیاد نے حضرت ہانی کو گرفتار کرا لیا اور اُن کو شہید کرا کے اُن کا سر دارالامارت سے نیچے پھنکوا دیا۔ حضرت امام مسلم نے جب یہ سُنا، خونِ ہاشمی جوش میں آ گیا، تابِ ضبط نہ رہی، تلوار لے کر باہر نکل پڑے۔ آپ کے نکلتے ہی ہزاروں مسلح افراد آپ کے ساتھ ہو گئے اور حضرت ہانی کے انتقام کا نعرہ لگاتے ہوئے دارالامارت کی طرف بڑھے۔ عبیداللہ ابن زیاد نے جب ایک پُر جوش مجمع کو دارالامارت کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو حضرت امام مسلم کے اُس قاصد کو جو موجودہ حالات کے بارے میں اطلاع دینے کے لیے مدینہ جا رہا تھا، اور جس کو عبیداللہ ابن زیاد نے گرفتار کرا لیا تھا، یہ کہہ کر کہ اگرچہ اسلام میں قاصد کا قتل جائز نہیں ہے، مگر تم لوگوں پر یہ واضح کرنے کے لیے کہ میرے دل میں رحم و کرم کا کوئی جذبہ نہیں ہے، میں اِس قاصد کو قتل کرتا ہوں۔ چنانچہ اس قاصد کو قتل کر کے لاش مجمع کی طرف پھینک دی۔ یہ دیکھ کر ہزاروں افراد کے دل بیٹھ گئے، اُن پر ہیبت طاری ہو گئی اور وہ لوگ امام مسلم کو تنہا چھوڑ کر منتشر ہو گئے۔ دارالامارت سے ایک فوجی دستہ حضرت امام مسلم کو گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھا، مگر امام مسلم اُس وقت تک جنگ فرماتے رہے جب تک آپ کے بازو شل نہ ہو گئے اور شدت سے آپ پر پیاس کا غلبہ نہ ہو گیا۔

حضرت امام مسلم کی شہادت: جب حضرت مسلم کے اندر مزید تابِ مقاومت نہ رہی تو آپ کوفہ کی ایک تنگ و تاریک گلی میں چلے گئے۔ فوجی دستے نے آپ کی ہیبت و شجاعت کے سبب آپ کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی اور دارالامارت میں اطلاع کر دی کہ امام مسلم کہیں غائب ہو گئے۔ حضرت امام مسلم ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ طوعہ نامی ایک خاتون گھر کے اندر سے نکلیں اور انہوں نے ایک پریشان حال مسافر کو دیکھ کر پوچھا، آپ کون ہیں اور یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ آپ نے اُن سے پانی مانگا، جب آپ نے پانی نوش فرما لیا تو ارشاد فرمایا: میری محسن خاتون! میرا نام مسلم ابن عقیل ہے۔ یہ سُن کر حضرت طوعہ بہت غم گین ہوئیں اور انہوں نے کہا: لعنت ہو عبیداللہ ابن زیاد پر کہ وہ رسول اللہ کے

قرابت داروں کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے۔ پھر انہوں نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ میرے گھر کو رونق بخشیے۔ میں آپ کی خدمت کروں گی۔ شاید میری یہ خدمت میدانِ قیامت میں میری نجات کا ذریعہ بن جائے۔ حضرت امام مسلم نے ان خاتون کا شکریہ ادا کیا۔ چوں کہ رات ہو چکی تھی اِس لیے نمازِ عشا کے بعد سو گئے۔ رات کو حضرت طوعہ کا بیٹا آیا، طوعہ نے ازراہِ ہمدردی اپنے بیٹے سے کہہ دیا کہ ہمارے کہاں نصیب کہ ہمارے گھر میں آلِ رسول آرام کریں، آج حضرت مسلم ابن عقیل ہمارے مہمان ہیں۔ لڑکا بہت خوش ہوا، ماں بھی بہت خوش تھی۔ ماں صبحِ محشر کی منتظر تھی جب اُس کی اِس خدمت کا صلہ جنت کی صورت میں ملے گا، اور لڑکا آنے والی صبح کا انتظار کر رہا تھا، جب وہ دارالامارت میں امام مسلم کی اطلاع کر کے اُس انعام کا مستحق ہو جائے گا جس کا اِعلان کیا گیا ہے۔

صبح ہوئی تو لڑکے نے انعام کی لالچ میں دارالامارت میں جا کر مطلع کر دیا کہ حضرت امام مسلم میرے گھر میں چھپے ہوئے ہیں۔ جب ایک فوجی دستہ حضرت مسلم کو گرفتار کرنے آیا تب طوعہ کو معلوم ہوا کہ بیٹے نے غدّاری کی ہے۔ بہت روئیں پیٹیں۔ اپنے بیٹے کو ہزاروں ملامتیں کیں، حضرت امام مسلم سے رو رو کے معافی مانگی، مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ حضرت امام مسلم دارالامارت میں لائے گئے اور شہید کر دیے گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.

امام مسلم کے بچوں کی شہادت: حضرت امام مسلم کے دونوں صاحب زادگان قاضی شریح کے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ جب قاضی شریح سے اُن کا چھپائے رکھنا ناممکن ہو گیا اور یقین ہو گیا کہ ابن زیاد کے گماشتے حریص اور دُنیا کے طلب گار فوجی، انعام کے لالچ میں ان شہزادوں کو بھی قتل کر دیں گے تو وہ رات کو شہزادوں کو لے کر نکلے اور ایک قافلے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ امام مسلم کے یتیم بچو! وہ ایک قافلہ مدینہ کی طرف جا رہا ہے، تم اُس قافلے میں شامل ہو جاؤ خدا تمہاری حفاظت کرے۔ بچے اپنے انجام کی خطرناکی کا احساس کر کے قافلے کے پیچھے روانہ ہو گئے، مگر اندازے کی غلطی نے اُنہیں قافلے سے جُدا کر دیا۔ رات بھر صحرا کی خاک چھانتے رہے اور صبح ہوئی تو کوفہ کے در و دیوار صاف نظر

آ رہے تھے۔ایک درخت کی آڑ میں چھپ گئے۔حارث نامی کوفی کی لونڈی اُدھر سے گذر رہی تھی، اُس نے صحرا میں دو پھول کھِلے ہوئے دیکھے تو رُک گئی اور اُس نے پوچھا پیارے بچو تم کون ہو؟ یتیموں نے اپنا ہم درد سمجھ کر سب کچھ بتا دیا۔لونڈی نے ان بچوں کو کلیجے سے لگا لیا اور اپنی مالکہ کے پاس لے گئی اور کہا بی بی! کل قیامت میں جن کے ہاتھوں سے لوگ کوثر سے سیراب ہو رہے ہوں گے، آج وہ خود بہت پیاسے ہیں۔ان پر رحم کرو، انھیں پناہ دو۔مالکہ نے دیکھا تو اُن کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا، اُنھیں کھانا کھِلایا اور ایک کوٹھری میں سونے کے لیے بھیج دیا۔رات کو حارث آیا تو اُس نے بتایا کہ آج دن بھر امام مسلم کے بچوں کو تلاش کرتا رہا ہوں۔کاش وہ مِل جاتے۔اگر وہ مِل جاتے تو میں مالا مال ہو جاتا۔ بیوی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلم کے یتیموں کو قتل کرا کے تمھیں کیا ملے گا؟ چند روز کے مال و دولت پر آخرت کو تباہ نہ کرو۔اُس نے جھڑک کے کہا بد بخت مجھے نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے، اُس دولت کی ضرورت ہے جو مجھے ایک پَل میں امیر بنا دے۔

اِدھر کوٹھری میں چھوٹے بچے نے خواب میں اپنے والدِ محترم حضرت امام مسلم کو دیکھا اور رونا شروع کر دیا۔بڑے بھائی نے تسلی دینا شروع کیا، رونے اور تسلی دینے کی آواز حارث نے سُنی تو کوٹھری کے اندر گھُس گیا، دونوں بے گناہ بچوں کو بالوں سے کھینچ کر باہر لایا۔سامنے بیوی آ گئی اور گِڑ گِڑا کر کہا: ’’خدارا اِن پر رحم کرو، میں نے اِن کو پناہ دی ہے۔‘‘ تو اُس نے دھکا دیا، لونڈی قدموں سی لپٹ گئی تو اُس نے ٹھوکر ماری اور دُنیا کی لالچ میں ڈوب کر اُس نے تلوار کو بے نیام کیا۔بڑے بچے نے کہا: ’’پہلے مجھے قتل کرو۔باپ کی شہادت کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کا محافظ میں ہی ہوں۔مجھ سے اِس کا قتل دیکھا نہ جائے گا۔‘‘ یہی خواہش دوسرے بھائی نے بھی ظاہر کی۔حارث نے کہا میرے بازو میں اِتنا کَس بَل ہے کہ میں تم دونوں کی خواہش ایک ساتھ پوری کر سکتا ہوں۔اُس نے تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ مارا اور دو سَر ایک ساتھ زمین پر آ رہے۔

حضرت امام حُسین کا سفرِ کوفہ: حضرت امام حُسین کو حضرت امام مسلم کا وہ خط مِل چکا

تھا جس میں اُنھوں نے اہلِ کوفہ کی وفاداری کا یقین دلایا تھا، اِس لیے حضرت امام حُسین ۸؍ ذی الحجہ ۶۱ ہجری کو مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔چوں کہ وہ ہر طرح سے مطمئن تھے اِس لیے اپنے پورے خاندان اور احباب و اعزا نیز وفاداروں کے ساتھ یہ سفر شروع فرمایا۔راہ میں مختلف قبائل کے لوگ شریکِ سفر ہو گئے۔اِس طرح یہ مختصر سا قافلہ ایک بڑے قافلے میں تبدیل ہو گیا۔جب آدھا راستہ طے ہو گیا تو راہ میں عرب کا ایک شاعر ملا جس نے امام حُسین کو اطلاع دی کہ ابتداءً کوفیوں کے دل بھی آپ کے ساتھ تھے، اور زبانیں بھی، اور جب عبیداللہ ابن زیاد کوفہ میں آیا اُن کی فطری بُزدلی غالب آ گئی اور اب کوفہ والوں کے دل، اُن کی زبانیں اور اُن کی تلواریں عبیداللہ ابن زیاد کے ساتھ ہیں۔امام مسلم شہید ہو چکے ہیں، امام مسلم کے بچے بھی شہید ہو گئے ہیں، اس لیے آپ للہ واپس ہو جایے۔

حضرت امام حُسین نے جب یہ سُنا تو بے پناہ غم گین ہوئے۔سامنے حضرت امام مسلم کی بچی آ گئی، آپ نے اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو اُس نے کہا: ’’چچا جان! میرے والد صاحب تو خیریت سے ہیں؟ آپ میرے سر پر یتیموں کی طرح کیوں ہاتھ پھیرتے ہیں؟‘‘ ...... یہ سُن کر امام حُسین کی آنکھیں چھلک پڑیں اور ارشاد فرمایا: ’’میری لختِ جگر! میرا بھائی میرے اوپر قربان ہو گیا، اب آج سے میں تمہارا باپ ہوں۔‘‘ ......

حضرت مُسلم اور اُن کے صاحب زادوں کی شہادت کی خبر پھیلتے ہی پورے قافلے میں کہرام برپا ہو گیا۔اپنے اہلِ قافلہ کو بُلا کر واپسی کے سلسلے میں مشورہ کرنا چاہا تو امام مسلم کے جملہ اقربا نے یہ کہا: ’’اب ہم واپس نہ جائیں گے، ہم یزید سے جنگ کریں گے، یا تو اللہ ہم کو فتح عطا فرمائے گا یا ہم بھی امام مسلم کی طرح شہید ہو جائیں گے، اُن کے بعد ہماری زندگی بے معنی ہے۔‘‘ ...... کچھ یہی جذبات آپ کے بھی تھے، اِس لیے آپ نے تمام اہلِ قافلہ کو جمع فرمایا اور اُن سے کہا:

’’اے اہلِ قافلہ! عراق کے لوگوں نے غداری کی ہے۔مُسلم ابن عقیل اور اُن کے بچے شہید ہو چکے ہیں، اِس لیے تم میں سے جو واپس ہونا چاہے، وہ واپس ہو جائے۔‘‘

یہ سُن کر وہ لوگ جو راہ میں شریک ہوئے تھے واپس ہوگئے، اب صرف وہ ۷۲ نفوسِ قدسیہ باقی رہ گئے جو مکہ سے ساتھ چلے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے واپس ہونے سے انکار کردیا، بالآخر حضرت امام حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا سفر جاری رکھا اور اُن کا مختصر سا قافلہ ۲؍محرم الحرام ۶۱ ہجری کو اُس مقام پر پہنچا جو کربلا کے نام سے مشہور ہے۔

عمرو ابن سعد جو عبیداللہ ابن زیاد کا کمانڈر انچیف تھا اُس نے حُر نامی طاقت ور اور بہادر سالار کو ایک فوجی دستہ دے کر حضرت امام حُسین کی پیش قدمی کے روکنے کے لیے روانہ کیا۔ حُر جب حضرت امام حُسین کے قافلے کے مدِمقابل ہوئے تو عرض کی کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے یزید کی بیعت لوں۔ اِس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ حضرت امام حُسین نے حُر اور اُس کے فوجیوں کو مخاطب کر کے ایک خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا:

''اے اہلِ کوفہ! میں خدا اور اس کے بعد تمہارے سامنے ایک معقول عُذر پیش کرتا ہوں کہ میں خود تمہارے پاس نہیں آیا ہوں، بلکہ تم نے جو خطوط روانہ کیے تھے اور اُن میں مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی اور سیکڑوں وعدے کیے تھے۔ اب اگر تم اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو مجھے واپس جانے دو۔''

یہ سُن کر حُر نے جواب دیا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اگر آپ بیعت نہ کریں تو میں آپ کو گرفتار کرلوں، مگر میں آپ کو گرفتار نہیں کرتا اور آپ کو مزید غور وفکر کی مہلت دیتا ہوں۔''

۳؍محرم الحرام ۶۱ ہجری کو عمرو ابن سعد خود ایک باقاعدہ فوج لے کر پہنچ گیا اور اُس نے حُر سے کہا کہ: ''تم کو امام حُسین کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ تم نے اپنا کام پورا کیوں نہیں کیا؟''...... حُر نے امام حُسین کی گفتگو کو دُہرا دیا۔ اُس نے جواب دیا: ''میں نے تم کو مصالحت کی گفتگو کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ اِس لیے بھیجا تھا کہ تم اُن سے بیعت لو اور یا اُنھیں گرفتار کرلو۔''...... یہ کہہ کر اُس نے نہرِ فرات پر پہرے بٹھا دیے تاکہ حضرت امام حُسین کے قافلے والے پانی نہ حاصل کرسکیں اور حضرت امام حُسین مجبور ہوکر بیعت کرلیں۔ اُس نے حضرت امام حُسین کے پاس پیغام بھیجا کہ اب آپ بیعت کرلیں۔

حضرت امام حُسین نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ''میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا البتہ میں خون ریزی بھی پسند نہیں کرتا، اِس لیے تم اِن تین تجاویز میں سے ایک تجویز مان لو:

[۱] میں جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس جانے کی اجازت دو،

[۲] مجھے سرحدی علاقوں میں جانے کی اجازت دو،

[۳] مجھے یزید کے پاس لے چلو میں خود اُس سے گفتگو کروں گا۔''

عمرو ابن سعد نے یہ تجاویز عبیداللہ ابن زیاد کے پاس بھجوا دیں۔ اُس نے جواباً کہلوا بھیجا کہ ہمیں یہ تجاویز منظور نہیں ہیں، انھیں گرفتار کرلو۔ عمرو ابن سعد نے حضرت عباس سے عبیداللہ ابن زیاد کے حکم کے بارے میں کہا کہ: ''اب یا تو آپ لوگ بیعت کرلیں یا جنگ کے لیے تیار ہوجائیں۔''...... حضرت عباس علم دار نے جواب دیا: ''ایک شب کی اور مہلت دو۔''...... آپ نے مہلت اِس لیے مانگی تھی کہ شہادت سے قبل کم از کم ایک پوری شب پورا قافلہ اللہ کی عبادت کرلے اور عمرو ابن سعد نے یہ مہلت اِس لیے دی تھی کہ اِس طرح بھوک اور پیاس میں اضافہ ہوجائے گا اور بوقتِ جنگ قابو پالینا آسان ہوگا۔

حضرت امام حُسین اور اہلِ خاندان نے ۹؍محرم الحرام کا دِن گذار کر پوری رات عبادتِ الٰہی میں گذاری۔ رات کے حصے میں چند لمحوں کے لیے آپ پر نیند کی سی کیفیت طاری ہوگئی تو آپ نے حضور سیّد عالَم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ وہ تشریف لائے ہیں اور اُن کے چہرۂ مبارک پر سفر کی سی علامتیں ہیں، اور آنکھوں میں آنسو ہیں۔ آتے ہی اُنھوں نے امام حُسین کو گلے سے لگالیا، اور دُعا کی:

اللّٰھمّ اٰت الحسین صبراً و اجراً۔

اے اللہ! حُسین کو صبر اور اَجر عطا فرما۔

حضرت امام حُسین نے آنکھ کھولی اور ارشاد فرمایا: ''آج کا دن میری زندگی کا آخری دن ہے۔''...... ۱۰؍محرم الحرام کی صبح کو امام حُسین امتحان گاہ میں اُترنے کے لیے تیار ہوگئے اور آپ نے اپنی بہن سیّدہ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''اے بہن! خدا پر بھروسہ رکھو، ایک دن سب کو مرنا ہے۔ موت برحق ہے اور ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ اِس کائنات میں خدائے وحدہٗ قدوس کے علاوہ کوئی بھی موجود نہ ہوگا۔ جملہ مسلمانوں کے لیے حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس نمونہ ہے۔ صرف اسی مقدس نمونے کی پیروی کرنا۔ میں تمھیں قسم دیتا ہوں کہ میری شہادت کے بعد نہ واویلا کرنا، نہ مُنھ نوچنا اور نہ گریبان چاک کرنا۔''

حضرت امام حُسین کی حضرت شہر بانو سے درخواست: صبح عاشورہ کو حضرت امام حُسین نے اپنی شریکِ حیات حضرت شہر بانو سے کہا: ''مجھے افسوس ہے کہ جب سے تم میری زندگی میں داخل ہوئی ہو تم کو غم و اندوہ ہی سے ساتھ پڑا ہے۔ تم ناز و نعمت کی پروردہ ہو، نوشیرواں شہنشاہِ ایران کی پوتی ہو، مگر میری زندگی میں تم کو آرام نہیں مِلا۔ اب جب کہ شہادت کا بازار گرم ہے، اور ہم چند لمحوں کے مہمان ہیں، میری درخواست تم سے یہ ہے کہ تم میرے بچوں کو لے کر ایران چلی جاؤ۔ شاید اس طرح تمہاری اور میرے بچوں کی زندگی محفوظ ہو جائے۔''

حضرت شہر بانو نے جب یہ سُنا تو قدموں سی لپٹ گئیں اور عرض کیا: ''میرے سرتاج! میں جب سے آپ کے قدموں میں آئی ہوئی ہوں، اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ مجھے شیرِ خدا جیسے باپ، حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جیسی ماں اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نانا ملے ہیں۔ میں میدانِ قیامت میں ان مقدس چہروں کی زیارت کرسکوں گی اور یہ میرا سب سے بڑا انعام ہوگا۔ میرے سرکار! مجھے اس نازک موقع پر اپنے قدموں سے جدا نہ کیجیے۔ اگر مجھ سے خاتونِ جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے شکایت فرمائی کہ تم نے بوقتِ شہادت میرے لختِ جگر کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، تو میرا جواب کیا ہوگا؟ رہے میرے بچے؛ فاطمہ کے لال پر قربان۔ اگر ان کی زندگی ہے تو انھیں کوئی مار نہیں سکتا، اور اگر ان کا مقدر شہادت ہے تو ایران کا سفر انھیں بچا نہیں سکتا۔''

حضرت امام حُسین اپنی بہن سیّدہ زینب اور اپنی شریک حیات سیّدہ شہر بانو رضی اللہ

تعالیٰ عنہا سے رُخصت ہو کر میدانِ جنگ میں تشریف لے گئے اور اپنے رفقا اور اپنے خاندان کے افراد نیز کوفہ کے چند وفاداروں کو جمع فرمایا اور ان کو ایک لشکر کی صورت میں ترتیب دیا اور اُن کی صفیں قائم کیں۔ میمنہ کی قیادت حضرت زبیر ابن القین اور میسرہ کی قیادت حضرت حبیب ابن مظاہر کے سپرد فرمائی اور علَم حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا فرمایا۔ پھر یزید کی قوم کی طرف رُخ کر کے ایک پُر تاثیر خُطبہ دیا کہ شاید یہ ظالم قوم اپنے ارادوں سے باز آجائے۔ چنانچہ آپ نے حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

''اے فوجِ یزید! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے رسول نے میرے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ حُسین جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔ آج تم میرے ساتھ جو سلوک کر رہے ہو اُس کی وجہ یہ ہے کہ میں یزید جیسے فاسق و فاجر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا۔ لیکن میں اُس کے ہاتھ پر بیعت کر کے دینِ مصطفیٰ کو فسق و فجور کے حوالے نہیں کرسکتا۔ اگر تم امن چاہتے ہو تو اب بھی موقع ہے، تم مجھے اجازت دو کہ میں واپس چلا جاؤں۔ ورنہ میں جنگ کے لیے تیار ہوں۔ مجھے میری اور بچوں کی شہادت اور اہلِ بیت کی خانہ ویرانی صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتی۔''

اس خطاب کے بعد اور کچھ تو نہیں ہوا، صرف اتنا ہوا کہ عمرو ابن سعد کے لشکر میں حرکت پیدا ہوئی اور حضرت حُر اپنے ساتھیوں کے ساتھ لشکرِ حُسین میں آملے اور امام حُسین سے معافی مانگی اور عرض کی کہ: ''اے ابنِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نادِم ہوں کہ میں نے عبیداللہ ابن زیاد کا حکم مان کر آپ کا راستہ روکا۔ مگر اب میں اپنے اِس جُرم کا کفارہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اجازت دیں کہ میں آپ کی طرف سے جہاد کر کے شہید ہو جاؤں تاکہ اللہ میری توبہ قبول فرمالے۔''...... یہ سُن کر امام حُسین بہت مسرور ہوئے اور ارشاد فرمایا:

انت حر فی الدنیا والاٰخرہ.

تم دُنیا اور آخرت دونوں میں آزاد ہو۔

جہاد کی ابتدا: حضرت حُر کے لشکرِ امام میں شامل ہو جانے کے بعد جنگ کا آغاز ہو گیا۔

پہلے عربوں کے عام دستور کے مطابق تنہا تنہا جنگ شروع ہوئی۔ چنانچہ یزیدی فوج سے ابن جوزہ نکلا اور اُس نے امام حُسین کو مقابلے کے لیے پُکارا، مگر اس سے پہلے کہ امام حُسین کی طرف سے کوئی جواب ملتا قضاے الٰہی سے اُس کا گھوڑا بِدک گیا اور ابنِ جوزہ اس کی پیٹھ سے لٹک گیا اور پالان کی رسّیوں سے پھنس کر گھسٹنے لگا۔ گھوڑا یزید کے لشکر کی طرف بھاگا مگر وہاں پہنچتے پہنچتے میدانِ کربلا کا پہلا گُستاخ دَم توڑ چکا تھا۔ یہ واقعہ اہلِ عبرت کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھا، مگر یزید کی فوج کی آنکھوں میں دُنیا ناچ رہی تھی اور وہ آخرت سے بالکل بے خبر تھے، اُن کی آنکھوں پر حوس و ہوس کی پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ ابن جوزہ کی موت کے بعد یزیدی لشکر سے یکے بعد دیگرے جنگجو آتے رہے اور لشکرِ حُسین کا ایک ایک مجاہد کئی کئی فوجیوں کو قتل کرتا رہا، یہاں تک کہ دو پہر سے پہلے پہلے امام حُسین کے تمام اعوان وانصار شہید ہوگئے۔ ان شہدا میں اِن حضرات کے نام لوحِ تاریخ پر ہمیشہ تابندہ رہیں گے: حضرت بریر، حضرت مُسلم ابن عوسجہ، عبداللہ ابن عمیر، حبیب ابن مظاہر، زہیر ابن القین، نافع ابن ہلال، عابس ابن ابی شبیب، حنظلہ ابن اسعد، عبداللہ ابن عروہ، عبدالرحمٰن ابن عزرۃ الغفاری، وغیر ہم۔

حضرت حُر رضی اللہ عنہ کی شہادت: جنگ، عاشورہ کا سورج طلوع ہوتے ہی شروع ہوئی تھی، اور آفتاب ڈھلتے ڈھلتے امام حُسین کے تمام رفقا شہید ہوگئے اور اب صرف امام حُسین کے اہلِ بیت رہ گئے۔ حضرت حُر پہلے بھی ایک بار دادِ شجاعت دے چکے تھے اور یزید کے کئی بہادروں کو جہنم رسید کیا تھا، مگر دوبارہ جب انہوں نے دیکھا کہ امام حُسین خود کربلا میں جانے کی تیاری کر رہے ہیں تو انہوں نے اجازت چاہی اور عرض کیا کہ حضور ہنوز تمناے شہادت پوری نہ ہوسکی، اجازت مرحمت فرمائیں کہ میں پہلے اپنی زندگی کا نذرانہ آپ کے قدموں میں پیش کرسکوں۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے امام حُسین کو الوداعی سلام کیا اور لشکرِ یزید پر ٹوٹ پڑے۔ تنہا اس ایک مجاہد نے محبتِ امام میں سرشار ہو کر سیکڑوں کوفیوں کو قتل کیا اور بالآخر زخمی ہو کر گرے تو امام حُسین نے خود بڑھ کر اُنھیں سہارا دیا، اور جب

حضرت حُر کی نگاہیں حضرت امام حُسین پر پڑی تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے: ''حُر تم نے اپنا وعدہ پورا کیا، تم سے خدا اور خدا کے رسول راضی ہوگئے۔''

حضرت عون رضی اللہ عنہ و محمد رضی اللہ عنہ کی شہادت: حضرت حُر کی شہادت کا حضرت امام حُسین کو بے پناہ رنج ہوا۔ اب مکہ مکرمہ سے ساتھ آنے والے اعوان وانصار میں سے کوئی ایسا نہیں رہ گیا تھا، جو امام حُسین کے نام پر جان دیتا، اِس لیے حضرت امام حُسین نے عمامۂ رسول سر پر باندھا، ذوالفقارِ حیدری ہاتھ میں لی اور میدانِ جہاد میں جانے کا قصد ہی فرما رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ حضرت زینب اپنے دونوں کم سن بچوں کے ساتھ حاضر ہیں اور عرض کر رہی ہیں کہ: ''پیارے حُسین! آج تک آپ نے اپنی بہن زینب کی کوئی بات نہیں ٹالی ہے، اُمید ہے کہ میری آخری التجا بھی ضرور قبول فرمائیں گے۔ میرے یہ دونوں بچے عون و محمد صبح ہی سے اصرار کر رہے ہیں کہ ماموں جان سے میدانِ کربلا میں جانے کی اجازت دِلوا دیجیے، مگر اب تک ٹالتی رہی، اب ان کا اصرار اپنی حد کو پہنچ گیا ہے، اور میں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ اب آپ تنہا ہیں، اِس لیے اجازت دیجیے کہ زینب اپنے دِل کے ٹکڑوں کو فاطمہ کے لختِ جگر پر قربان کر دے۔''

حضرت امام حُسین نے فرمایا: ''زینب! اب تک جو لوگ شہید ہوئے ہیں وہ جوان یا بوڑھے تھے، مگر اِن بچوں نے زندگی کی کوئی بہار نہیں دیکھی، یہ کھل کر مسکرا بھی نہ سکے ہیں، ماموں کا دل کیسے گوارا کرے گا کہ وہ اپنی بہن کے گلشنِ حیات کے غنچے اپنی آنکھوں سے اُجڑتے ہوئے دیکھے۔ میں نے صبح سے اب تک بہت سِتم برداشت کیے ہیں، مگر یہ سِتم ناقابلِ برداشت ہوگا۔ بہن! اپنے بھائی پر آخری وقت میں اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ وہ اُٹھا نہ سکے۔''

حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ سُنا تو رونے لگیں اور عرض کی: ''حُسین! آپ نے یہ نہیں سوچا زینب اپنی ماں فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سامنے کیا جواب دے گی؟ کاش میری ماں زندہ ہوتیں اور وہ میری سفارش کرسکتیں۔''

حضرت زینب نے یہ جملے کچھ اِس انداز سے کہے کہ حضرت امام حُسین خاموش

ہوگئے۔ حضرت زینب نے امام کی خاموشی کو رضا مندی پر محمول کرتے ہوئے اپنے بچوں کے سروں پر اپنے ہاتھوں سے عمامہ باندھا، تلوار ہاتھوں میں دی اور کہا کہ: ''ہر ماں اپنے بچوں کے لیے سلامتی سے واپسی کی دُعا کرتی ہے، مگر میری دُعا یہ ہے کہ میرے بچے گلشنِ مصطفیٰ کی آبیاری کریں اور درجۂ شہادت پر فائز ہوں، تاکہ میں اپنی ماں سے کہہ سکوں کہ کربلا میں گئی تھی بھری ہوئی گود لے کر اور آئی ہوں خالی دامن لے کر۔ ماں! میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔''

حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دونوں شہزادے میدانِ کربلا میں داخل ہوئے تو زمین لرز گئی، شیرِ خدا کے نواسے جس طرف بڑھتے شانِ حیدری دکھا جاتے۔ یزیدی فوج پوری قوت سے حملہ آور تھی، مگر دو بچوں نے میدان کا نقشہ بدل دیا۔ اب صورت یہ ہوگئی تھی کہ لوگ سامنے آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ جب جنگ کرتے ہوئے دو گھنٹے گذر گئے، بازو شل ہوگئے، جسم زخموں سے چُور چُور ہوگئے۔ توانائی جواب دے گئی تو افواجِ یزید نے محسوس کر لیا اور یک بارگی حملہ کیا، بچے زخمی ہو کر گرے اور ''ماموں جان اُٹھایئے'' کی آواز آئی۔ امام حُسین میدان کی طرف دوڑے اور حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شہید بچوں کی لاشیں لا کر خیمہ کے سامنے رکھ دیں۔ خیمے میں کہرام مچ گیا۔ زینب کبریٰ نے بچوں کی لاشیں دیکھ کر تبسّم فرمایا اور سجدۂ شکر ادا فرمایا اور نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھا کر عرض کیا: ''اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے زینب کی قربانی قبول کر لی۔''

حضرت عباس علَم دار رضی اللہ عنہ کی شہادت: امام حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بھانجوں کی لاشیں میدانِ کربلا میں دفن فرما دیں، اور روتے ہوئے آپ نے حضرت زینب سے ارشاد فرمایا: ''بہن زینب! تم نے اپنے بھائی کے لیے جس عظیم ایثار کا مظاہرہ کیا ہے، قیامت تک مسلم بہنیں تمہارے اِس ایثار کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں گی اور جب اُن کا کوئی بچہ شہید ہوگا تو تمہاری یاد اُن کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرے گی۔''

ابھی خیمہ میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت مسلم ابن عقیل کی صاحب زادی نے

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دامن تھام کر اپنے خشک ہونٹ اُنھیں دِکھائے اور عرض کی: ''چچا جان! اَب پیاس نا قابلِ برداشت ہوگئی ہے۔'' حضرت عباس نے مشکیزہ اُٹھایا اور نہرِ فرات کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت امام حُسین نے سمجھایا کہ نہرِ فرات پر پہرہ ہے، پانی لانا ناممکن ہے۔ حضرت عباس نے جواب دیا: ''شہادت ہمارا مقدر ہے، یہ کتنا اچھا ہوگا کہ میں اپنے شہید بھائی حضرت مسلم کی یتیم بچیوں کی خواہش پوری کرنے کی خاطر جان دوں۔'' یہ کہہ کر آپ نہرِ فرات کی طرف روانہ ہوگئے۔ آپ عرب کے بہادر ترین لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے اور بے پناہ خوب صورت تھے۔ آپ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیروں کی بارش میں نہرِ فرات پر پہنچ گئے۔ سامنے جو بھی آیا وہ قتل ہوگیا۔ ہاتھ جب پانی کے قریب پہنچ گیا تو خیال آیا کہ پانی پی لیں۔ لیکن دوسرا خیال آیا کہ امام حُسین اور مُسلم ابن عقیل کے بچے پیاسے ہیں اور میں پانی پی لوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ سوچ کر مشکیزہ اُٹھایا اور روانہ ہوئے۔ عمرو ابن سعد نے للکار کر کہا: ''اے لوگو! اگر خیمۂ حُسین میں پانی پہنچ گیا تو ان کو شکست دینا مشکل ہو جائے گا، اِس لیے آگے بڑھو اور عباس کو شہید کر دو۔'' بیک وقت بے شمار تیروں کی بارش ہوئی اور چاروں طرف سے یزید کے فوجیوں نے نیزوں اور تلواروں سے حملہ کر دیا۔ آپ پر زرارہ نامی نے حملہ کیا، آپ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور اُس کا ہاتھ شانوں سے اُکھڑ گیا۔ یہ دیکھ کر ظالموں نے پوری قوت سے حملہ کیا، ایک تلوار اُس بازو پر پڑی جس میں مشکیزہ تھا، آپ نے مشکیزہ دانتوں میں دبا لیا اور دوسرے ہاتھ سے تلوار چلانے لگے۔ چند ظالموں نے مشکیزے کو تیروں سے چھلنی کر دیا، یہاں تک کہ اُس میں ایک قطرہ پانی نہ بچا۔ یہ دیکھ کر آپ نے مشکیزہ پھینک دیا، مگر ایک بازو کے کٹ جانے کے بعد ایک ہاتھ سے بہت دیر تک مدافعت ناممکن تھی اِس لیے زخمی ہو کر گرے اور شہید ہوگئے۔

حضرت امام حُسین حضرت عباس کی لاش اُٹھا کر لائے اور حضرت مسلم کی شہزادی سے فرمایا: ''لختِ جگر! تمہاری خواہش کے احترام میں تمہارے چچا عباس؛ بھائی مسلم کے پاس پہنچ گئے۔''

حضرت قاسم ابن امام حسن کی شہادت: حضرت عباس کی شہادت کے بعد حضرت قاسم جو ابھی نوجوان اور انتہائی خوب صورت تھے۔ حضرت امام حُسین کے پاس آئے اور میدان میں جانے کی اجازت طلب کی۔ حضرت امام حُسین نے فرمایا: ''بھائی کی شہادت کے بعد تمہیں دیکھ کر حضرت امام حسن کو یاد کرلیا کرتا ہوں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہاری صورت میں میرے بھائی میرے سامنے موجود ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو کہ بھائی کی شہادت کے بعد اُس کی نشانی کو بھی گنوادوں۔'' اِس انکار کے بعد حضرت قاسم نے دوبارہ التجا کی۔ اِس بار التجا کے الفاظ اِس قدر اثر انگیز تھے کہ امام حُسین اِنکار نہ کرسکے اور حضرت قاسم کو جنگ کی اجازت مرحمت فرمادی۔ آپ نے میدانِ جہاد میں پہنچ کر عمر ابن سعد کو مخاطب کرکے ایک خطبہ دیا، جس میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ''میں دیکھ رہا ہوں ایک طرف جنت ہے اور ایک طرف جہنم۔ میں تم کو امام حُسین سے محاربت کرکے جہنم کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم حُسین کی جنت کو یزید کی جہنم پر ترجیح دو اور جنگ سے باز آجاؤ۔'' لیکن اِس کے جواب میں عمر ابن سعد نے فوج کو یک بارگی حملے کی تاکید کی۔ کئی ظالموں کو قتل کرنے کے بعد امام حسن کا لختِ جگر اپنے چچا کے وقار و ناموس پر قربان ہوگیا۔

حضرت قاسم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد ابوبکر ابن حسن اور حضرت علی کے دو صاحب زادے محمد الاوسا [جو امامہ بنت ابی العاص کے بطن سے تھے] اور عبداللہ [جو حضرت ام البنین کے بطن سے تھے] یکے بعد دیگرے میدان میں آئے اور جامِ شہادت نوش فرمایا۔

حضرت علی اکبر رضی اللہ عنہ کی شہادت: حضرت قاسم، حضرت ابوبکر ابن حسن اور حضرت محمد الاوسا نیز حضرت عبداللہ کی شہادت کے بعد اب خیمۂ حُسین میں حضرت امام حُسین کے دو صاحب زادوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا، جن میں حضرت امام زین العابدین شدید بیمار تھے اور اُن کے اندر اُٹھنے کی بھی تاب نہیں تھی۔ اِس لیے امام حُسین نے ایک مرتبہ پھر رَن میں جانے کا قصد فرمایا، مگر اِس بار نظر اُٹھائی تو حضرت علی اکبر ہتھیار لگائے میدان میں جانے کے لیے تیار تھے۔ امام حُسین نے دیکھا تو کلیجہ تھام لیا اور ارشاد فرمایا: ''میرے

لختِ جگر! کیا گلشنِ مصطفیٰ میں ایک پھول بھی باقی نہ بچے گا؟'' حضرت علی اکبر نے عرض کی کہ ''ابا جان! یہ میری غیرت کے منافی ہے کہ میں میدانِ جہاد میں نہ جاؤں۔ پھوپھی جان کے دو بچے شہید ہوچکے ہیں، بھائی قاسم نے جان کا نذرانہ پیش کردیا ہے۔ یہ لوگ دادا جان حضرت علی شیرِ خدا کے حضور اور آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور سُرخ رُو ہوچکے ہیں۔ اب مجھ کو بھی سُرخ رُو ہونے کا موقع عطا فرمایے۔''...... امام حُسین خاموش ہوگئے تو حضرت علی اکبر کی والدۂ محترمہ حضرت شہر بانو نے التجا کی: ''میرے سرکار! میرے لختِ جگر کی التجا پوری کردیجیے۔''

حضرت امام کے لب پر مُہرِ سکوت تھی اور خیمۂ حُسین میں ایک کُہرام بپا تھا۔ علی اکبر نے ماں اور پھوپھی کو سلام عرض کیا، اور باپ سے استقامت کی دُعا لی اور میدان کی طرف بڑھے۔ عمرو ابن سعد نے آواز دی: ''علی اکبر! ابھی ابھی حسن کی نشانی خاک و خون میں تڑپ چکی ہے، اب تم اپنی زندگی سے کیوں بیزار ہوگئے ہو؟'' علی اکبر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور ارشاد فرمایا: ''موت و حیات دستِ قدرت میں ہے، عزت و ذلّت دینے والا وہی ہے، کچھ لوگ زندگی بچا کر ذلّت کا طوق گلے میں پہنتے ہیں، اور کچھ زندگی اللہ کی راہ میں دے کر حیاتِ ابدی کا لباس پہن لیتے ہیں۔ تُو ہمیں موت سے ڈراتا ہے، موت ہمارے لیے زندگی کا پیغام ہے۔'' اِس تقریر کے جواب میں عمرو ابن سعد نے ایک تیر پھینکا، اب ذوالفقارِ حیدری بے نیام ہوئی اور پے درپے پانچ آدمی فنا کے گھاٹ اُتر گئے۔ اس کے بعد جو بھی آیا وہ قتل ہوا۔ تنہا علی اکبر نے یزیدیوں کے دلوں پر اس قدر خوف بٹھا دیا کہ اب پوری فوج بھیڑ اور بکریوں کی طرح بھاگ رہی تھی، دُشمن دور دور سے تیر برسا رہا تھا، نیزے پھینک رہا تھا، مگر قریب آنے کی کسی میں جرأت نہیں تھی۔ اِدھر حضرت علی اکبر زخموں سے چُور چُور ہوچکے تھے۔ عمرو ابن سعد نے یہ حالت دیکھی تو ایک بار پھر اپنی فوج کو للکارا اور کہا کہ: ''تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تنہا ایک جوان پوری فوج پر بھاری ہے، جب کہ وہ دو روز کا بھوکا اور پیاسا ہے!'' کسی نے جواب دیا تھا: ''عمرو ابن سعد! تُو مقابلے میں کیوں نہیں

جاتا؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ علی اکبر کی تلوار قضا بن کر سروں پر کوندتی ہے اور سروتن کے فیصلے کر دیتی ہے۔ ظالم! تُو اپنے اقتدار کی عمارت ہماری لاشوں پر کھڑی کرنا چاہتا ہے!'' مگر یزیدیوں کے شور میں احتجاج کرنے والوں کی آواز دَب گئی۔ اِدھر حضرت علی اکبر اِس قدر زخمی ہوگئے کہ گھوڑے پر بیٹھا رہنا بھی دُشوار ہوگیا۔ یزید کے فوجیوں نے اِس کیفیت کو بھانپ لیا اور یک بارگی پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ حضرت علی اکبر شہید ہوکر گرے تو عمرو ابن سعد نے آواز دی ''حُسین! اپنے لختِ جگر کی لاش لے جاؤ۔''

حضرت اصغر رضی اللہ عنہ کی دردناک شہادت: حضرت علی اکبر کی لاش کو ریگ زارِ کربلا کے حوالے کرنے کے بعد جب امام حُسین خیمے میں تشریف لائے تو حضرت شہر بانو نے شیر خوار بچے حضرت اصغر کا لب امام حُسین کو دکھایا اور درخواست کی کہ: ''میرا بچہ چند لمحوں کا مہمان ہے۔ آپ انھیں یزیدیوں کے پاس لے جائیں، اور عمرو ابن سعد سے کہیں، تُو بھی صاحبِ اولاد ہے، تجھے اولاد کا درد تو ہوگا، میرے بچے پہ رحم کھا اور اسے چند گھونٹ پانی کے دے دے۔''......حضرت امام حُسین نے جواب دیا: ''شہر بانو! میں تمہاری خواہش پوری کروں گا، مگر مجھے اُمید نہیں ہے کہ یزیدی میرے بچے پر رحم کھائیں گے۔''......کربلا کا میدان لؤ سے جُھلس رہا تھا۔ امام حُسین نے اصغرِ بے شیر کو اپنی چادر میں چھپایا اور میدان کی طرف بڑھے۔ عمرو ابن سعد نے للکارا: ''حُسین مشکیزہ چادر میں چھپا کر لے جارہے ہیں، مشکیزہ چھلنی کردو۔'' سنسناتے ہوئے تیروں کی ایک باڑھ امام حُسین کی طرف آئی، امام حُسین نے گھبرا کر علی اصغر کو دِکھایا اور کہا: ''ظالمو! میں پانی لینے نہیں جارہا ہوں، میری پیاس تو اب نانا جان کے دستِ کرم سے بجھے گی، البتہ یہ ننھا بچہ تمہارے سامنے ہے۔ اگر تم اِسے پانی پلا دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ قیامت میں تمہیں کوثر سے ضرور سیراب کروں گا۔'' اِس درخواست کے جواب میں ایک سنسناتا ہوا تیر حلقومِ علی اصغر میں پیوست ہوگیا، اور امام حُسین کا ہاتھ خون سے بھر گیا۔ اِمام نے خون فضا کی طرف اُچھالا اور خدا کی بارگاہ میں عرض کی: ''مولا! تُو دیکھ رہا ہے ظالموں نے ظلم کی انتہا کر دی۔'' پھر آپ علی اصغر کا بے گناہ جسم

لے کر خیمہ میں واپس آئے اور جناب شہر بانو سے کہا۔

''شہر بانو! تمہاری ننھی قربانی بھی اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوگئی۔''

عابد بیمار کا عزمِ شہادت: حضرت اصغر کی شہادت کے بعد حضرت امام حُسین نے خیمے کے اندر ایک انتہائی دردناک منظر ملاحظہ فرمایا، حضرت عابد بیمار تلوار کے سہارے اُٹھنے کی کوشش فرمارہے ہیں، پھر انہوں نے دیکھا کہ وہ اُٹھ گئے ہیں مگر ضعف اور نقاہت سے بیٹھ گئے ہیں۔ آپ اُن کے پاس تشریف لے گئے، اور اِرشاد فرمایا ''جانِ پدر! تمھیں کس چیز نے اُٹھنے پر مجبور کیا؟'' انہوں نے عرض کی: ''حضور میرے بھائی، میرے اعزّا سب شہید ہوگئے ہیں، میں اپنی کم زوری اور بیماری کی وجہ سے میدانِ جنگ میں نہ جاسکا، مجھے میرا ضمیر ملامت کر رہا ہے کہ آخر میں آج ہی کیوں بیمار ہوگیا، مجھے بھی شہادت سے سرفراز کریں۔'' حضرت امام حُسین نے ارشاد فرمایا: ''میرے لختِ جگر! خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ اُس نے تم کو بیمار فرمایا ہے تو اِس میں اُس کی کوئی مصلحت ہوگی۔ تم میدانِ جہاد میں نہ جاؤ۔ شاید تمہارے ہی ذریعے سے رسول اللہ کی نسل قیامت تک رہے۔

فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لال کی شہادت: اب چشمِ فلک وہ دردناک منظر دیکھنے والی تھی جس سے زیادہ دردناک منظر نہ اُس نے کبھی دیکھا ہوگا اور نہ آئندہ دیکھ سکے گی۔ حضرت امام حُسین نے اہلِ خیمہ کو آخری بار الوداع فرمایا اور آسمان کی طرف رُخ کر کے عرض کی:

''مولا! تیرے رسول کے نواسے کے ساتھ تیرے رسول کی اُمّت جو کچھ کر رہی ہے اُس کا شکوہ تیرے علاوہ کسی سے نہیں کیا جاسکتا۔ مولا! میری مجبوری اور مظلومی تُو دیکھ رہا ہے، تُو مجھے حق پر قائم رکھ۔''

یہ کہہ کر آپ نے مدِ مقابل طلب کیا۔ پہلے یکے بعد دیگرے کئی آدمی آپ نے قتل کر دیے اور پھر پوری فوج نے تنہا آپ پر حملہ کر دیا، مگر شیرِ خدا کے شیر حُسین ابنِ علی جس طرف بڑھتے لوگ بھیڑ کی طرح چھٹ جاتے۔ آخر عمرو ابن سعد نے للکار کر کہا: ''اے لوگو! تمہیں

کیا ہو گیا؟ حُسین ابن علی تنہا اور تین روز کا بھوکا پیاسا ہے۔ اگر تم کنکریاں پھینکو تو وہ دَب جائے مگر اس کے باوجود تم اب تک اسے شہید نہ کر سکے۔''

دُشمنوں کی فوج یک بارگی آپ پر ٹوٹ پڑی، ایک تیر آپ کے ہونٹوں میں لگا، اور خون بہنے لگا۔ دوسرا تیر آپ کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ بالآخر آپ کی قوتِ مدافعت جواب دے گئی، آپ قبلہ رُخ ہو گئے، گویا خدا کے حضور میں آخری سجدہ فرمانا چاہتے ہیں۔ ذرعہ ابن شریک نے تلوار کا وار کیا جس سے آپ کا بازو کٹ گیا۔ سنان ابن انس نے آپ پر نیزے سے حملہ کیا اور جب آپ زمینِ کربلا پر سر بہ سجدہ ہوئے تو سنان ابن انس نے آپ کا سرِ اقدس تنِ مبارک سے جُدا کر دیا، خولی ابن یزید نے آپ کا سر نیزے پر بلند کیا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون. اب رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دوشِ اطہر کا سر دُشمنوں کے نیزے پر سوار تھا۔

کربلا کے بعد: شہادت کے بعد اہلِ بیتِ حُسین کے خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ خواتین اور بچوں کو گرفتار کر لیا گیا اور امام حُسین کے سر سمیت اس مظلوم قافلے کو عبید اللہ ابن زیاد کے دربار میں پیش کیا گیا۔ ابن زیاد نے حضرت امام حُسین کے مقدس ہونٹوں کو اپنی چھڑی سے چھیڑا تو ایک صحابیِ رسول تڑپ اُٹھے اور فرمایا:

''ظالم اپنی چھڑی ہٹالے، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ بوسہ دیتے تھے۔''

پھر یہ لُٹا ہُوا شکستہ حال قافلہ دمشق پہنچا دیا گیا۔ یزید کو اطلاع مِل چکی تھی، کہ شہادتِ امام حُسین کا شدید ردِ عمل ہو رہا ہے اور جن علاقوں سے امام حُسین کا مظلوم قافلہ گذرتا ہے، لوگ اپنے دروازے بند کر لیتے ہیں، اِس لیے اُس نے ازراہِ مصلحت کہا:

''خدا لعنت کرے عبید اللہ ابن مرجانہ پر، اگر میں ہوتا تو حُسین کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا''...... مگر اُس کے یہ جملے مگر مچھ کے آنسو کی طرح ہیں۔ آخر عبید اللہ ابن زیاد کو بھیجا کس نے تھا؟

کی مِرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

چند روز اپنے محل میں مہمان رکھ کر یزید نے شہدائے کربلا کے رشتے داروں کو مدینہ پہنچا دیا۔ یہ لُٹا ہوا قافلہ جب مدینے میں پہنچا تو ہر طرف کُہرام مچ گیا اور ہر طرف سے انتقام، انتقام کی صدا بلند ہونے لگی۔ چنانچہ جب عبداللہ ابن زبیر نے سُنا تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انھوں نے طے کر لیا، میں خونِ حُسین کا انتقام ضرور لوں گا۔ مکہ میں آپ نے یزید کے خلاف جنگ پر لوگوں سے بیعت لی اور یزید کی فوج سے ایک زبردست جنگ ہوئی۔ اسی درمیان اطلاع ملی کہ یزید مر گیا۔ اس سلسلے میں یہ بات باعثِ عبرت ہے کہ یزید صرف دو سال برسرِ اقتدار رہا اور شہادتِ حُسین کے بعد اُس کو ایک لمحہ بھی سکون نہ مِل سکا۔

قاتلانِ حُسین کا انجام: سب سے زیادہ خطرناک انتقام مختار ابن ابو عبید ثقفی نے لیا۔ اُس نے ایک فوج اکٹھا کی۔ لوگ اس قدر مشتعل تھے کہ رضا کارانہ طور پر چند دنوں میں ایک عظیم الشان فوج اکٹھا ہو گئی۔ اُس نے کوفہ پر حملہ کر دیا اور قاتلانِ حُسین کو عبرت ناک شکست دی۔ جب قاتلانِ حسین شکست پا گئے تو مختار کے خوف سے اپنے گھروں میں چھپ گئے اور اُس نے ایک ایک کو گرفتار کرایا۔ جس میں عبید اللہ ابن زیاد، شمر ذی الجوشن، خولی سبھی شامل تھے۔ اُس نے ان تمام لوگوں کو تڑپا تڑپا کر قتل کروایا۔ اس طرح جس دُنیاوی اقتدار کی خواہش میں امام حُسین کو شہید کیا گیا تھا وہ بھی ان کو نہ مل سکا اور امام حُسین ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہو گئے۔

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

میدانِ کربلا کا پیغام مسلمانانِ عالم کے نام:

[۱] حضرت امام حُسین نے میدانِ کربلا میں شہید ہو کر دُنیا کو یہ پیغام دیا کہ حق کی خاطر جان دی جا سکتی ہے، مگر باطل کے سامنے گردن نہیں جھکائی جا سکتی۔

[۲] حق شہید ہو کر بھی زندہ رہتا ہے اور باطل کامیاب ہو کر بھی مٹ جاتا ہے۔

[۳] مسلمانانِ عالَم کو چاہیے کہ وہ با اُصول زندگی گذاریں اور اُصولوں کے خلاف کبھی سمجھوتہ نہ کریں۔

[۴] باطل کبھی مصلحت کے بھیس میں آتا ہے اور کبھی اقتدار کی لالچ دیتا ہے، مگر حق پرست کو چاہیے کہ وہ مصلحت کے شیطان اور اقتدار کے عفریت کا سر کچل دے، اور حق کا بول بالا کرے۔

[۵] اسلام کی راہ میں حق کو بلند کرنے کے لیے اگر خاندان، اعزا و اقربا اور اولاد کی قربانی بھی دینی پڑے تو دریغ نہ کریں، کیوں کہ ع

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

[۶] امام حُسین نے اپنی اور اپنی اولاد کی قربانی پیش کر کے اُن اُصولوں کو بچا لیا جنھیں یزید پامال کرنا چاہتا تھا اور جن کو رائج کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ امام حُسین نے حدودِ شرعیہ کا تحفّظ کیا، اسلام کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی اور کلمہ **لا الہ الا اللّٰہ** کا تقاضہ پورا کیا ع

حقّا کہ بنائے لا الہ است حُسین

امام حُسین نے اپنے اس عمل سے دُنیاے اسلام کو یہ سبق دیا کہ کربلا ہر دور میں ہوگا۔ سیکڑوں یزید اسلام کو مٹانے کے لیے اُبھریں گے، مگر مسلمانانِ عالَم کو سُنّتِ حُسینی کو اپناتے ہوئے، اپنا سب کچھ قربان کرنا ہوگا، اور اگر وہ کامیاب ہوگئے تو فبہا ورنہ ان کی شہادت باطل کا چہرہ بے نقاب کر دے گی اور پھر ظلم ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔

گرتے ہوئے نصیب کے ماروں کو تھام لے
اے دشتِ کربلا کے مجاہد سلام لے

[اشرف القادری مبارک پوری]

☆☆☆

حضور مفتی اعظم ایک عظیم فقیہ ایک عظیم مجاہد

ہندوستان کی سرزمین جو اپنے رقبے اور آبادی کے اعتبار سے دُنیا کے درجنوں ممالک سے زیادہ وسیع و عریض ہے اور برصغیر کے نام سے متعارف ہونے کے باوجود نو دریافت براعظموں سے زیادہ آبادی کی حامل ہے۔ ہندوستان ان قدیم ترین ملکوں میں شامل ہے جس کی تاریخ ہزاروں سال پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کثیر آبادی والے ملک میں داعیانِ اسلام اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں جلوہ گر ہوئے۔ ان داعیانِ اسلام کی کوششوں سے پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اسلام اس سرزمین پر ایک عظیم مذہب اور نظامِ حیات کی حیثیت سے متعارف ہو چکا تھا۔ اس دور میں داعیانِ اسلام اور مسلم تاجروں کے ہاتھوں پر لاکھوں افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ بت کدۂ ہند میں اسلام کے فروغ کے ساتھ ساتھ توحید اور اصنام پرستی کی کشمکش کا آغاز ہوا اور اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ردِعمل کے طور پر باطل قوتیں اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ اس عظیم دین سے برسرِ پیکار ہوگئیں۔ ہزاروں باطل خداؤں، سیکڑوں تہذیبوں اور لاتعداد رسوم و رواج کی حامل ہندو قوم کی ایک معتدبہ تعداد نے اسلام قبول کیا؛ تو اکثریت نے اسلام دُشمنی کی انتہا کر دی اور اہلِ حق کو ہر دور میں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ مگر جامِ توحید پینے والے دیوانگانِ عشق نے ہر ستم گوارا کر لیا مگر دینِ حق سے انحراف گوارا نہ کیا۔

اس کی یہ خوبی عہدِ رسالت سے لے کر آج تک نمایاں ہے کہ جس نے ایک بار سچے دل سے اسلام قبول کر لیا وہ اس دینِ حق سے واپس باطل کی طرف لوٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

چنانچہ داعیانِ دین اور اولیاے کرام کے ایک طبقے نے اسلام کی دعوت دی اور غیر مسلموں کو اسلام میں داخل فرمایا تو دوسری طرف علماے ملتِ اسلامیہ اور مجددینِ اُمّت

نے دین پناہی کا فریضہ انجام دیا، اور ہر دور میں اُٹھنے والے فتنوں کا پوری قوت اور استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا۔

کبھی اس ملک کے راجاؤں نے اپنے اپنے دورِ اقتدار میں مسلمانوں کو بت پرستی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی اور کبھی ان کی متحدہ قوت نے موحدین کے خلاف ہر طرح کے ظلم و ستم کو روا رکھا۔ ابتداءً مال و دولت کی لالچ دی گئی، اقتدار پیش کیا گیا مختلف علاقوں کی صوبہ داری کی تحریص و ترغیب دی گئی، لیکن مسلمانوں نے جب مال و دولت اور دُنیاوی اقتدار کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تو پھر ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے، ان کا معاشرتی بائی کاٹ کیا گیا۔ مگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ اللہ رب العزت نے اپنے دین کی اشاعت اور حفاظت کے لیے داعیانِ اسلام علما اور اولیا کو اس سرزمین پر بھیجا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی روحانی قوت سے باطل کو شکست دی بلکہ ان کے مذہبی ''فلسفۂ ویدانت'' کا جواب بھی اسلام کے ''عملی تصوف'' سے دیا۔ صوفیاے کرام کا تصوف ''خالص اسلامی تصوف'' تھا اور ''احسان'' کی اعلیٰ ترین شکل تھی۔

پنجاب کی سرزمین پر کفر کے شدید غلبے اور ظلم و ستم کے دور میں حضور داتا گنج بخش سیدنا مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نفسِ گرم اور روحانی تاثیر سے لاکھوں غیر مسلموں کو اسلام کے دائرے میں داخل فرمایا اور تصوف کی پہلی کتاب ''کشف المحجوب'' کی تالیف کے ذریعہ اس ملک میں تصوف کی راہ پر چلنے والوں کے لیے ایک نصابِ عمل بھی ترتیب دیا۔ ''کشف المحجوب'' اس محبوبِ حقیقی کے جلووں سے آشنائی اور اسی مستورِ ازل کی صفات کے مشاہدے کے لیے ایک اہم کتاب ہے۔

حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمہ کی روحانی عظمت کا یہ حال تھا کہ وصال کے بعد بھی ان کا مزارِ مقدس، طالبانِ حقیقت کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہا، چنانچہ سلطان الہند خواجہ غریب نواز علیہ الرحمۃ والرضوان مدینۃ الرسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بغداد مقدس کے سفر سے واپسی کے بعد ہندوستان کے خطۂ اجمیر میں قیام سے پہلے لاہور میں مزارِ داتا گنج

بخش پر معتکف اور چلہ کش رہے، اور چالیس روز تک کسبِ فیض کے بعد یہ اعتراف کرتے ہوئے عازمِ اجمیر ہوئے کہ ؎

گنج بخش فیضِ عالَم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہ نما

شہاب الدین غوری کی شکست کے بعد عطاے رسول خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ ہندوستان میں وارد ہوئے۔ ان کا ورودِ مسعود ایک ایسے دور میں ہوا جب مسلمان شکست خوردہ ہو چکے تھے اور پورے ملک بالخصوص راج پوتانہ کی سرزمین ان کے لیے مقتل بن چکی تھی۔ نفرتوں کا یہ عالَم تھا کہ وہ کنوؤں سے پانی بھی نہ بھر سکتے تھے اور نہ ہی ان تالابوں میں غسل کر سکتے تھے جہاں غیر مسلم آباد تھے، ایسے نازک وقت میں حضور غریب نواز علیہ الرحمہ نے اپنی روحانی قوت سے باطل قوتوں کا مقابلہ کیا اور ان کی مساعیِ جمیلہ نیز ان کے روحانی تصرف سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو راجاؤں کے ظلم و ستم سے نجات ملی بلکہ لاکھوں ہندو مسلمان ہوئے اور شہاب الدین غوری کو فتح و نصرت ملی۔

ہندوستان کی سرزمین چوں کہ پنڈتوں، جوگیوں، پروہتوں اور پجاریوں کی آماج گاہ تھی، ان کا اپنا ایک فلسفۂ مذہب تھا، جس کو ''ویدانت'' کے نام سے جانا جاتا ہے، جس میں روحانی ارتقا کے مختلف اسالیب کی وضاحت کی گئی ہے، اس لیے خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ نے اس سرزمین پر اسلام کی اشاعت کے لیے کثرتِ عبادت، ریاضت، چلہ کشی، دُنیا سے بے رغبتی وغیرہ کو شاملِ نصابِ دعوت فرمایا تا کہ داعیانِ اسلام روحانی اعتبار سے اس مقامِ بلند پر فائز ہوں جہاں دوسرے مذاہب کے لوگ نہ پہنچ سکیں۔ چنانچہ ان کا مقابلہ ہندو جوگیوں سے ہوا، مگر خواجہ اپنے روحانی تصرفات کی بنا پر غالب رہے۔ اس طرح انھوں نے غیر مسلموں پر واضح فرما دیا کہ روحانیت کی اعلیٰ ترین منزلیں صرف اسلام اور عقیدۂ توحید کے ذریعہ طے کی جا سکتی ہیں۔

روحانی اعتبار سے اصنام پرستوں کو شکست فاش دینے کے بعد آپ نے خواب کے ذریعہ سلطان شہاب الدین غوری کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ اس نے راجاؤں کی متحدہ فوج کو شکست فاش دی۔ بعد میں سیکڑوں سال تک مسلمانوں کا سیاسی غلبہ اور اقتدار انھیں کے فتوحات کا تسلسل تھا۔

خواجۂ خواجگاں نے نہ صرف اپنے دور میں اسلام کی اشاعت کے لیے جد وجہد فرمائی بلکہ آپ کی خانقاہ تصوف کی ایک ایسی تربیت گاہ تھی جس سے بے شمار لوگ تربیت یافتہ ہوکر کشورِ ہند کے تمام علاقوں میں پھیل گئے، اور انھیں کی روایات پر عمل کرتے ہوئے اشاعتِ اسلام کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔

غریب نواز علیہ الرحمہ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مستقبل میں ایک طویل زمانے تک دہلی مسلم فرماں رواؤں کا دارالسلطنت رہے گا، اور ایک مدت تک مسلم فرماں روا وہاں تخت نشین رہ کر پورے ملک میں حکم رانی کا فریضہ انجام دیں گے، اس لیے سلاطین کی روحانی اور اخلاقی تربیت اور مسلمانوں کو دینِ حق پر استقامت بخشنے کے لیے آپ نے اپنے روحانی فرزند اور جانشین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو دہلی کا قطب الارشاد بنا کر متعین فرمادیا۔ انھوں نے اپنے دور کے حکم راں شمس الدین التمش کی دینی تربیت فرمائی۔

جب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے یہ ملاحظہ فرمایا کہ پنجاب کی سرزمین باب الہند ہے اور افغانستان نیز وسطِ ایشیا بالخصوص سمرقند و بخارا، ازبکستان، تاجکستان وغیرہ کے مسلم فاتحین اور صوفیہ اسی راستے سے ہندوستان میں وارد ہوتے ہیں تو انھوں نے خواجہ فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمۃ والرضوان کو پورے پنجاب کا منصبِ خواجگی عطا فرما کر پاک پٹن شریف روانہ فرمایا اور خواجہ فرید الدین گنج شکر نے پورے پنجاب کو سیراب فرمایا۔ آج بھی خطۂ پنجاب میں مشائخِ چشت کی درجنوں خانقاہیں انھیں کی مرہونِ منت ہیں۔ اور جب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد دلی کا روحانی تخت خالی ہوگیا تو خواجہ فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمہ نے حضرت نظام الدین اولیا علیہ الرحمہ کو وہاں متمکن

فرمایا، اور اس طرح دلی کی امانت دلی کو واپس فرمادی۔ خواجہ نظام الدین اولیا کے دور میں متعدد مسلم حکم راں دلی کے تاج وتخت پر قابض ہوئے۔ ان میں کچھ آپ کے معتقد تھے اور کچھ آپ کی شہرت سے حسد کرتے تھے، جو معتقد تھے وہ بارگاہِ نظام سے نوازے گئے اور جو حسد کرتے تھے اور ان کے قتل کے درپے تھے انھیں- ہنوز دلی دور است- کا مشہور جملہ ارشاد فرما کر زندگی اور اقتدار دونوں سے محروم فرمادیا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے اپنی خانقاہ میں روحانی تربیت دے کر درجنوں اولیاے کرام کو منصبِ دعوت وتبلیغ پر فائز فرمایا اور پھر ان اولیاے کرام نے دلی کو بائیس خواجگان کی سرزمین بنادیا۔

حضرت نظام الدین اولیا علیہ الرحمہ کی بارگاہ کے تربیت یافتہ اولیاے کرام نے صرف دہلی ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کو نوازا۔ ہندوستان میں جہاں جہاں کفر و اسلام کی کشمکش تھی اور جو خطے اس دور میں سیاست میں نمایاں مقام رکھتے تھے، وہاں سلسلۂ چشتیہ کے فیض یافتہ بزرگوں نے پہنچ کر اسلام کا پرچم بلند فرمایا اور لوگوں کو دائرۂ اسلام میں داخل فرمایا۔ چنانچہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کو دکن کی روحانی سلطنت سپرد کی گئی۔ حضرت علاء الحق پنڈوی علیہ الرحمہ کو بنگال کا روحانی اقتدار بخشا گیا، اور اس طرح اس طویل وعریض ملک کے طول وعرض میں تبلیغ ودعوت کا ایک منظّم نظام نافذ کیا گیا۔

جب تک مسلمانوں کا اقتدار رہا، اور مسلم بادشاہوں میں جو لوگ دین دار اور خدا ترس تھے انھوں نے مسلمان علما اور صوفیہ کی اعانت کی اور ان کی تعلیم وتربیت سے فیض یاب رہے، وہ کامیاب وکامراں رہے، مگر چند مسلم سلاطین ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کی غرض سے دین کو پسِ پشت ڈال دیا، اور اس بات کی کوشش کی کہ ایک ایسا مذہب رائج کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے قابلِ قبول ہو، یہ ان کی ایک سیاسی ضرورت تھی۔ چنانچہ مغل بادشاہ اکبر اعظم نے اپنے دور میں چند دین فروش دانش وروں کو جمع کر کے ایک نئے مذہب ''دینِ الٰہی'' کی بنیاد رکھی۔ اسلام اور ہندومت اور دیگر مذاہب کا ایک معجون مرکب تیار کیا اور خود کو اس نئے دین کا بانی قرار دیا اور

بادشاہت کے زور سے اس نے باشندگانِ ہند کو اس نئے دھرم کی طرف مائل کرنا چاہا، مگر اس دور کے علماے حق نے اکبر کے اس باطل دھرم کی شدت سے مخالفت کی۔ اس دور میں علما کی گرفت مسلم عوام پر بہت مضبوط تھی، اس لیے اکبر اپنے اس منصوبے میں کامیاب نہ ہو سکا، البتہ اس کے کچھ اثرات جہاں گیر کے دورِ اقتدار تک باقی رہے۔ اس دور میں بہت سی دوسری بدعات کو رواج دیا گیا۔ بہت سی ہندوانہ رسموں اور تیوہاروں کو حکومت کی سرپرستی میں عام کیا گیا۔ بادشاہ کے لیے ''سجدۂ تعظیمی'' ضروری قرار دیا گیا۔ ایسے دور میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ نے دینِ الٰہی اور دیگر بدعات وخرافات کے استیصال کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔

حضرت شیخ مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کے ذریعے سلسلۂ نقشبندیہ کو بہت فروغ حاصل ہوا اور ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ترکی نیز وسطِ ایشیا کی تمام مسلم ریاستوں میں یہ سلسلۂ بیعت وارشاد پھیلا اور تاہنوز اس کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

سلسلۂ چشتیہ اور نقشبندیہ کے علاوہ سلسلۂ قادریہ کے علما اور مشائخ اور اولیا نے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دُنیا میں اشاعتِ اسلام کا فریضہ انجام دیا۔ سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ اور ان کے دامن سے وابستہ اولیاے کرام نے برِ اعظم ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تمام ملکوں میں اشاعت اور تجدیدِ دین کا اہم ترین فریضہ انجام دیا۔

چنانچہ آج بھی پوری دُنیا میں حضور غوث الاعظم کے دامنِ کرم سے وابستہ مشائخ کے سلسلے – قادری، تیجانی، بداوی اور شاذلی – کے نام سے متعارف ہیں، اور آج پوری دُنیا میں انھیں کی اکثریت ہے۔ ہندوستان میں مسلم حکومتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ باطل قوتوں نے زور پکڑا اور اسلام کو بیخ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ہر چہار جانب سے حملے ہونے لگے تو علما اور مشائخ نے ؏

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر ''رسمِ شبیری''

کا فریضہ انجام دیا اور برِ صغیر کے طول وعرض میں علماے اہلِ سنت نے مدارسِ اسلامیہ کا

جال پھیلا دیا۔ افغانستان کی سرزمین سے لے کر بنگال کی سرزمین تک ہزاروں درس گاہیں قائم کی گئیں اور ان درس گاہوں کی علمی اور فکری سرپرستی اُس دور کے اکابر علما نے فرمائی۔ چنانچہ ہندوستان میں علمِ حدیث کو متعارف کرانے والی شخصیتوں میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کے خانوادے نے علم کی اشاعت میں نمایاں کارنامے انجام دیے، اور ان علما نے ایسے وقت میں ملتِ اسلامیہ کی متزلزل دیواروں کو سنبھالا جب ہندوستان میں مسلم اقتدار اپنی آخری سانس لے رہا تھا۔

حکومتِ مغلیہ کے زوال کے بعد مسلم ہندوستان کے طول وعرض پر انگریز قابض ہو گئے اور صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دُنیا کے بیش تر مسلم ممالک یورپین اقوام کے زیرِ نگیں آ گئے، اور کالونیوں میں تبدیل ہو گئے اور پھر ۱۸۵۷ء کا وہ المیہ پیش آیا جس میں بیش تر علماے اہلِ سنت کو جہادِ حق کی پاداش میں سولیوں پر لٹکایا گیا، یا انڈمان اور دوسرے جزائر میں قیدِ تنہائی کی حالت میں جامِ شہادت نوش فرمایا، ان مجاہدینِ آزادی میں حضرت علامہ فضلِ حق خیر آبادی علیہ الرحمہ کی ذات سب سے نمایاں ہے۔ علماے اہلِ سُنّت کی شہادت یا ان کے ملک بدر ہونے کے بعد میدان، دُشمنانِ اسلام کے ہاتھ آ گیا اور مسلمانوں کا دفاعی مورچہ کم زور پڑ گیا اور اسلام پر ہر طرف سے یلغار ہونے لگی۔

انگریزوں نے غیر مسلموں کو یہ تاثر دیا کہ ہم نے اس ملک کی اکثریت کو مسلم اقلیت کے اقتدار اور مسلم سلاطین کے مظالم سے نجات دلائی ہے اور اس جھوٹ کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے مسلم حکم رانوں پر مندر شکنی اور غیر مسلموں کو بہ زورِ شمشیر اسلام میں داخل کرنے کے الزامات عائد کیے۔ اس طرح یہاں کی ہندو اکثریت کو مسلم دُشمنی پر اُبھارا، جس کے اثرات آج بھی بہت نمایاں ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کے عقیدے اور – **تعلق باللّٰہ والرسول** – کو کم زور کرنے کے لیے ایسی درس گاہیں قائم کی گئیں جن میں انگریزوں کے وفادار پیدا ہوں اور ان سے ایسی تحریریں لکھوائی گئیں جو ایک طرف نام

نہاد مسلمانوں میں اہانتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رُجحانات کی حوصلہ افزائی کریں، تو دوسری طرف مسلمانوں کی متحدہ قوت کو اختلاف و انفاق کا شکار بنا دیں، تاکہ دوبارہ علماے حق جہادِ آزادی کا نعرہ لگا کر انگریزوں کو اس ملک سے نکلنے پر مجبور نہ کر سکیں۔

ایسے پُرفتن دور میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان کو پیدا فرمایا، جن کے تجدیدی کارناموں نے دُشمنانِ اسلام کے ناپاک عزائم کو شکست دی ، انھوں نے اسلام اور عظمتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع کے لیے چومکھی جنگ لڑی اور- جہاد بالقلم- کے ذریعہ باطل فتنوں کی سرکوبی کی، اور کم و بیش ایک ہزار کتابیں تالیف فرما کر ملتِ اسلامیہ کے اہلِ علم اور ان کی لائبریریوں کے حوالے فرما دیا، ان کتابوں میں دلائل کے وہ انبار لگا دیے جو صبحِ قیامت تک اُٹھنے والے تمام فتنوں کا جواب بن سکیں۔ انھوں نے صرف کتابیں ہی نہیں لکھیں بلکہ حضور غوث الاعظم و خواجۂ خواجگاں علیہما الرحمۃ والرضوان کی سنتِ طیّبہ پر عمل کرتے ہوئے اپنے تلامذہ کی ایک عظیم جماعت تیار کی، جس کا ہر فرد اس دور کے علوم و فنونِ متداولہ کے ہر علم و فن کا امام تھا۔ ان شخصیات میں امام العارفین رئیس الاتقیاء مفتی اعظم حضرت مولانا محمد مصطفیٰ رضا علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذات سب سے نمایاں اور ممتاز ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے فرزند تھے بلکہ حقیقی طور پر ان کے علم، تقویٰ، ان کی غیرتِ دینی، جلالتِ شان اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ و سلم کے مظہرِ کامل تھے۔ وہ ایک عظیم فقیہ، عظیم محدث، عظیم متکلم، عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، ولی کامل اور عظیم مرشدِ طریقت تھے۔ امامِ اہلِ سُنّت امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ نے اپنے منصبِ ولایت کو اپنے تفقہ کی چادر میں پوشیدہ رکھا تھا، ورنہ حقیقتاً وہ ایک مجددِ وقت کے ساتھ ایک فنافی الرسول، صاحبِ جذب و شوق، ولی کامل تھے، انھوں نے اپنی وارداتِ قلبی اور اپنے مشاہداتِ باطنی کو اپنے اشعار میں نمایاں فرمایا ہے۔ مثلاً ؎

پیشِ نظر وہ نو بہار سجدے کو دل ہے بے قرار
روکیے سر کو روکیے ہاں یہی امتحان ہے

یا

اے شوقِ دل یہ سجدہ گر ان کو روا نہیں
اچھا وہ سجدہ کیجیے کہ سر کو خبر نہ ہو

لیکن امامِ اہلِ سُنّت کی شخصیت کا یہ پہلو- حضور مفتی اعظم- کی ذات میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ حضور مفتی اعظم کے نزدیک توحید محض ایک لفظ نہیں جس کو صرف زبان سے ادا کیا جائے بلکہ ایک کیفیت ہے جو انسان کو جملہ موجودات اور ممکنات کے تعین سے بیگانہ کر دیتی، چنانچہ جب وہ نماز پڑھنے کے لیے خدا کی بارگاہ میں کھڑے ہوتے تھے تو ایک خاص کیفیت ان پر طاری ہوتی تھی، جس کا مشاہدہ ان سیکڑوں حاضر باش افراد نے کیا ہے جنھوں نے انھیں نماز ادا فرماتے ہوئے دیکھا ہے۔ وضو اس طرح فرماتے کہ گویا وہ اپنے محبوبِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لیے طہارتِ کاملہ کے ذریعہ خود کو نکھار رہے ہوں۔ سنن و مستحبات اور تمام جزئیات کا کامل اہتمام فرماتے تھے۔ عمامہ شریف سر پر رکھتے اور عبا زیبِ تن فرماتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ اس مسجودِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لیے خود کو آراستہ کر رہے ہیں، کہ کہیں کوئی بٹن کھلا نہ رہ جائے، کہیں کوئی آستین مُڑی نہ رہ جائے اور کہیں گریباں چاک حاضری کا الزام نہ عائد ہو جائے، کہیں لااُبالی پن اور کسل نہ نمایاں ہو، اس لیے کہ یہ سب ایمان اور محبت کے تقاضے کے خلاف ہے۔ نماز کی کیفیت کا یہ عالَم تھا کہ محسوس ہوتا تھا کہ کانک تراہ کے کیفِ سرمدی میں ڈوبے ہوئے ہیں ؎

دو عالَم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

خادم نے شدید گرمی کے موسم میں جب وہ حالتِ نماز میں تھے پنکھا جھلنا شروع کر دیا تو سلام پھیرنے کے بعد سخت ناراض ہوئے کہ ایک بندۂ عاجز اپنے خدا کی بارگاہ میں حاضر تھا اور تم میری خدمت کر رہے تھے۔ کیا ایک غلام اپنے آقا کے حضور میں کسی خدمت گار کو لے کر حاضر ہو سکتا ہے؟

لوگ خدا کو شہید و بصیر مانتے ہیں مگر مفتی اعظم کی ذات پر خدا کے شہید و بصیر ہونے کا احساس اس قدر غالب تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے حضور میں حاضری کے احساس سے غافل نہیں تھے۔ کسی نے سوال کیا کہ حضرت آج کے ماڈرن دور میں بعض مقامات پر سنت کے مطابق کھانا کھانے سے ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے، جواب عطا ہوتا ہے کہ: تم کو لوگوں کا احساس ہے مگر یہ احساس نہیں کہ تم رزاقِ مطلق کا رزق کھا رہے ہو اور تم اس کے بندے ہو۔ کیا ایک بندہ اپنے آقا کے حضور میں کبر و نخوت کے انداز سے کھانا کھا سکتا ہے؟

کسی نے ضعف کی وجہ سے آپ کے ہاتھ میں لرزش محسوس کی اور وضو کے لیے لوٹے سے آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈالنا چاہا تو منع فرما دیا اور فرمایا کہ: وضو نماز کے اہتمام کا ایک حصہ ہے، یہ بھی عبادت ہے اور عبادت غیر مقصودہ میں بھی حتی الامکان کسی غیر سے مدد نہیں لینا چاہیے۔

سرکار مفتی اعظم علیہ الرحمہ سفر و حضر میں، اوقاتِ مستحبہ میں نماز کی ادائیگی کا اہتمام خود بھی فرماتے اور رفقاے سفر نیز خدام حاضر باش کو بھی حکم دیتے تھے۔ حاضر باشوں میں اگر کسی کی نماز گھر پر بھی قضا ہوتی تو سرکار مفتی اعظم محسوس فرما لیتے اور بوقتِ ملاقات چہرۂ اقدس پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوتے اور خادم محسوس کر لیتے کہ نماز قضا ہو گئی ہے اس لیے حضرت ناراض ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص نماز کی پابندی کرتا ہے اسے خداے پاک کی بارگاہ سے یہ توفیق ملتی ہے کہ اس کی نماز کبھی قضا نہ ہو۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ سرکار مفتی اعظم اگر پلیٹ فارم پر نماز ادا فرما رہے ہیں اور ٹرین روانہ ہو گئی؛ مگر آپ نماز میں اسی محویت کے عالم میں مصروف رہے، لیکن ٹرین اسٹیشن کے حدود سے باہر نہیں نکل سکی بلکہ بعض تکنیکی خرابی کی وجہ سے روک دی گئی۔ آپ نے نماز کمالِ اطمینان و خشوع و خضوع کے ساتھ ادا فرمائی اور ٹرین پر بیٹھ گئے تو ٹرین روانہ ہوئی۔ وصال سے قبل کم و بیش دو سال تک صاحبِ فراش رہے اور کیفیتِ خاص سے دوچار رہے جو بہت سے اولیاے کرام کو وصالِ محبوبِ حقیقی سے

پہلے حاصل ہوتی ہے، یہ مشاہدۂ انوارِ الٰہی کی کیفیت ہے، اس حالت میں سالکانِ راہِ طریقت کو دُنیا سے بے نیاز کر دیتی ہے، حضور مفتی اعظم علیہ الرحمہ کا یہ حال تھا کہ لوگ آپ سے ملنے کے لیے آتے مگر آپ انھیں پہچانتے نہیں۔ کبھی کبھی ایک ہی فرد سے کئی کئی بار پوچھتے کہ آپ کب آئے ہیں؟ مگر قربان جایے۔ جب نماز کا وقت داخل ہوتا تو مکمل شعور کے ساتھ بیدار ہو جاتے، پورے اہتمام سے وضو فرماتے اور انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا فرماتے۔ کچھ لوگ منتظر رہتے، آپ انھیں مرید فرماتے اور بستر پر دراز ہوتے تو پھر اسی عالَم میں چلے جاتے۔

تقسیمِ ہند کے بعد حالات انتہائی ابتر ہو گئے تھے۔ پورے ملک میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا تھا، لوگ پاکستان کے وجود کا انتقام ہندوستان کے مسلمانوں سے لے رہے تھے، کچھ لوگوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ بھی پاکستان منتقل ہو جائیں تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر میں اپنی ذات کے لیے پاکستان کیسے جا سکتا ہوں؟ اور پھر یہاں مزارِ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ بھی تو ہے۔

بعض خیرخواہوں نے مشورہ دیا کہ محلّہ سوداگران میں صرف آپ کا خاندان مسلم ہے ورنہ پورا محلّہ غیر مسلموں کا ہے۔ آپ چند روز نماز گھر میں ہی ادا فرما لیں۔ مبادا کہیں نقصان نہ پہنچ جائے؟ تو آپ نے ناراضی کا اظہار فرمایا کہ دُنیا کا کوئی خوف مجھے اللہ کے گھر میں حاضری سے نہیں روک سکتا۔

ہندوستان میں ہوائی جہاز کے سفر کو اس لیے بہتر فرمایا کہ کم وقت میں منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا ہے اور نماز قضا ہونے کا خوف نہیں رہتا۔

صرف نماز ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں آپ عزیمتوں پر ہی عامل رہے، آپ نے رُخصتوں سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ دراصل آپ کا سفرِ حیات عزیمتوں کا سفر تھا، آپ اولوالعزم فقہا اور اولیا میں سے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے کبھی تقاضاے شریعت سے انحراف گوارہ نہ کیا۔

آج کا دور اباحیت پسندی اور تن آسانی کا دور ہے، لوگ حرام اشیا کو مباح قرار دینے کے لیے طرح طرح کے حیلے تراشتے ہیں لیکن حضور مفتی اعظم علیہ الرحمہ کا موقف یہ تھا کہ تم اگر عزیمت کا راستہ اختیار کروگے تو لوگ رُخصت پر رُک جائیں گے لیکن اگر تم نے رُخصت کو اپنایا تو لوگ حرمت سے اجتناب نہ کرسکیں گے۔

حالات کا دباؤ کتنا شدید کیوں نہ ہو، آپ نے ہمیشہ اولیٰ پر عمل فرمایا اور فتویٰ بھی دیا، آپ کے معمولات اور فتاویٰ میں خلافِ اولیٰ پر عمل اور حکم نہیں ملتا اور ایسا کیوں نہ ہو؟ اولیاے کرام خلافِ اولیٰ کو بھی گناہ شمار کرتے تھے اور اس سے توبہ کرتے تھے۔ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ ہو یا گاؤکشی کا، برتھ کنٹرول کا مسئلہ ہو یا شاردا ایکٹ کا طوفان، آپ نے حالات کے دباؤ یا کسی نقصان کے خوف سے کوئی حکم صادر نہیں فرمایا، بلکہ پُرسکون حالات میں جن رعایتوں کو ملحوظِ خاطر رکھا جاسکتا تھا، آپ نے اس کا بھی خیال نہیں فرمایا بلکہ پوری قوت اور ایمانی استقامت کے ساتھ حق کی حمایت میں فتویٰ صادر فرمایا، جب کہ بہت سے لوگوں نے حالات کی خوف ناکی کو سامنے رکھ کر جواز کا حکم دیا یا نظرِ ثانی کی دعوت دی۔ سرکار مفتی اعظم نے نہ صرف یہ کہ فتویٰ صادر فرمایا بلکہ ان فتاویٰ کی بھرپور اشاعت فرمائی اور مسلمانانِ ہند کو استقامت کی تلقین فرمائی۔

بہت مشہور قول ہے **الاستقامة فوق الکرامة** مگر مفتی اعظم صاحبِ استقامت اور صاحبِ کرامت دونوں تھے، بلکہ ان کی کرامتیں بھی ان کی استقامت کے ذریعے ظہور پذیر ہوئیں۔

رجالُ الغیب اور جنات کے بارے میں اکثر علما فرماتے ہیں کہ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تھے۔ خود میرا اپنا مشاہدہ ہے غالباً ۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ حضور مفتی اعظم میرے گاؤں خالص پور اعظم گڑھ میں جلوہ گر ہوئے۔ سعید خان صاحب کے چبوترے پر قدم رکھتے ہی السلام علیکم فرمایا اور فرمایا: آپ کے مکان میں دو مہمان تو پہلے ہی سے موجود ہیں۔ اب اہلِ خانہ کو خیال آیا کہ بالائی منزل کے دروازے خود بخود کس طرح کھل جاتے

تھے اور کبھی کبھی اوپر کے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس کیوں ہوتا تھا۔ صاحبِ خانہ نے پوچھا کہ حضور ان سے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ بس آپ بالائی منزل صاف ستھری رکھیں تا کہ انھیں ایذا نہ پہنچے۔ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے اس بات کے شاہد ہیں کہ آپ انتہائی مہربان اور بہت کریم تھے۔ آپ کے دروازے پر ضرورت مند حاضر ہوتے تو آپ خود ان کی ضرورت پوری فرمادیتے اور کبھی کبھی خدامِ بارگاہ کو حکم دیتے کہ ان کی ضرورت پوری کردیں۔

خورد نوازی کا یہ عالَم تھا کہ ہم جیسے کم مایہ لوگ بھی ان کے الطافِ کریمانہ سے محروم نہ رہے۔ سفر و حضر میں اپنے خدام کا خاص خیال رکھتے اور وہ دسترخوان پر موجود نہ ہوتے تو میزبان کو حکم دیا جاتا کہ انھیں بھی بلایا جائے۔ راے پور کے ایک اجلاس میں میری تقریر ہوچکی تھی کہ لوگ آقاے نعمت حضور مفتی اعظم کو اسٹیج پر لائے، آپ منتظمین اجلاس پر ناراض ہوئے کہ آپ لوگ مجھے پہلے کیوں نہ لائے؟ میں ان کی تقریر سننا چاہتا تھا۔

جبل پور میں حضور برہان ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی دعوت پر سرکار مفتی اعظم کی معیت میں حاضر ہوا۔ مجھے خطاب کا حکم دیا گیا، میں نے اس خیال سے اختصار سے کام لیا کہ اسٹیج پر دوسرے علما بھی جلوہ گر ہیں، کہیں میں ان کا وقت نہ لے لوں، مگر حضور مفتی اعظم علیہ الرحمہ نے مجھے حکم دیا کہ میں دوبارہ تقریر کروں۔ ظاہر ہے یہ ساری نوازشات صرف میری حوصلہ افزائی کے لیے تھیں ورنہ-من آنم کہ من دانم-بس ایک بات سرمایۂ افتخار ہے کہ ع

نسبتِ ذرہ بہ خورشید جہاں تابے است

خلافِ شریعت بات پر سخت ناراض ہوتے لیکن اظہارِ ناراضی کے بعد لطف وکرم کی بارش بھی فرماتے اور سائل کو اس کی طلب سے سوا دیتے۔ حضور مفتی اعظم علیہ الرحمہ کی مسیحانفسی بے پناہ مشہور تھی۔ لوگ ان کی بارگاہ میں تعویذات کی غرض سے حاضر ہوتے اور شفایاب وکامراں لوٹتے۔ ملک و بیرون ملک کے لاکھوں افراد اس بات کے گواہ ہیں۔ انھیں حضور مفتی اعظم کے تعویذات اور دعاؤں سے بے پناہ فائدہ پہنچا ہے۔ لاکھوں افراد حضور مفتی

اعظم کے تعویذات کی برکتوں سے دین دار اور پابندِ صوم وصلوٰۃ ہوگئے۔ اس لیے کہ ہر طالب کو-نماز کی پابندی- اور-شریعت مطہرہ- پر عمل کی تلقین فرمایا کرتے تھے، ان کے بیش تر تعویذات آیاتِ قرآنیہ پر مشتمل ہوتی تھیں اور تعویذ لکھتے وقت ان آیات کی تلاوت بھی جاری رہتی تھی۔ اس طرح وہ مسلسل ذکر کی حالت میں رہتے ''دست در عمل وزبان در ذکر'' کی کیفیت ہمیشہ دیکھی جاسکتی تھی۔ لوگ ان کی بارگاہ میں تعویذ لینے کے لیے آتے اور عقیدہ وعمل کی زندگی سنوار کے جاتے تھے۔ ہزاروں افراد نے تعویذ کی برکتوں سے بدعقیدگی سے توبہ کی اور ہمیشہ کے لیے ان کے دامنِ عقیدت سے وابستہ ہوگئے۔

۱۹۷۶ء میں انگلینڈ سے پہلی بار وطن واپس ہوا اور آقاے نعمت مرشدِ گرامی کی بارگاہ میں حاضر ہوا، اس وقت آپ مسجد میں تھے میں نے قدم بوس ہونا چاہا، مگر انھوں نے گلے سے لگالیا اور فرمایا بہت دنوں کے بعد آئے ہو۔ مسجد میں نماز کی ادائیگی کے بعد دولت کدے پر تشریف لائے۔ خلافت عطا فرمانے کے لیے آپ نے مطبوعہ اجازت نامہ طلب فرمایا۔ مجھ سے میرے والدمحترم کا نام پوچھا۔ میں اس خیال سے گھبرایا ہوا تھا کہ خلافت کی عظیم ذمہ داری کس طرح نباہ سکوں گا؟ میں اس کا اہل نہیں ہوں، اس گھبراہٹ اور خوف کے عالَم میں زبان سے نام کے بجائے والدمرحوم کی عرفیت ''ناتواں خاں'' نکل گئی۔ چہرۂ اقدس پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے اور فرمایا ''بھلا یہ کیا نام ہوا'' میں نے عرض کیا حضور ان کا اصل نام عبدالحمید ہے۔ پھر آپ نے نہ صرف یہ کہ اجازت مرحمت فرمائی بلکہ آپ نے دستِ کرم سے سلاسلِ اربعہ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ بھی تحریر فرمادیا۔ اس وقت درِ اقدس پر حضرت مولانا مفتی غلام محمد صاحب ناگپوری اور ریحانِ ملت حضرت علامہ ریحان رضا صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہما موجود تھے۔

۱۹۷۲ء میں مولانا قاری حسین الدین صاحب جو غالباً گجرات کے رہنے والے تھے، عازمِ لندن ہوئے اور سرکار مفتی اعظم ہند کی بارگاہ میں بغرضِ سلام حاضر ہوئے۔ انھوں نے اپنے لندن جانے کا تذکرہ سرکار مفتی اعظم سے کیا۔ حضرت نے انھیں ایک تعویذ

عطا فرمایا اور کہا کہ یہ فلاں صاحب کو بریڈفورڈ میں دے دیجیے گا، انھوں نے بذریعہ خط درخواست کی ہے۔ مولانا حسین الدین صاحب تعویذ لے کر بے پایاں مسرور ہوئے اور لوگوں سے کہنے لگے، اب مجھے لندن جانے سے کوئی قانون نہیں روک سکتا۔ اب میں سرکار مفتی اعظم کی امانت پہنچانے جارہا ہوں۔ [خیال رہے کہ اس زمانے میں ویزا لندن ایئرپورٹ پر ملتا تھا اور بعض وقت مسترد بھی ہوجاتا تھا۔] اور ہوا بھی یہی وہ ایئرپورٹ پر اُترے، ویزا آفیسر نے پوچھا کہ آپ کس لیے آئے ہیں؟ انھوں نے کہا تدریس کے لیے۔ کیا پڑھائیں گے؟ مولانا نے کہا قرآن شریف۔ اس نے کہا مجھے قرآن سنایے۔ آپ نے ایئرپورٹ پر سورۂ فاتحہ کی تلاوت کردی اور اس نے ویزا دے دیا۔ شاید برطانیہ کی تاریخ میں یہ سب سے انوکھا اور مختصر انٹرویو تھا۔ قاری صاحب اس کا تذکرہ زندگی بھر لوگوں سے فخریہ کرتے رہے۔

اولیاے کرام کی کرامتیں حق ہیں۔ حضور مفتی اعظم بلاشبہہ نہ صرف ایک ولی کامل تھے بلکہ ولی گر تھے۔ ان کی بارگاہ سے فیض یافتہ منصبِ ولایت پر فائز ہوتے تھے۔ اسی لیے ان کی ذاتِ گرامی سے کرامتوں کا صدور بھی حق ہے، مگر گذشتہ صدی میں ان سے زیادہ صاحبِ کرامت بزرگ کوئی اور نظر نہیں آتا۔ ان کی کرامتوں کے تذکرے کے لیے ہزاروں صفحات درکار ہیں۔ ان سے ملنے والا شاید ہی کوئی عقیدت کیش ہو جس کے سینے میں ان کی کوئی نہ کوئی کرامت محفوظ نہ ہو۔ مگر میرے نزدیک ان کی کرامتوں سے زیادہ اہم ان کے وہ عظیم اور تاریخ ساز کارنامے ہیں جنھوں نے اسلامیانِ ہند کے ایمان وعمل کی دُنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا اور صبحِ قیامت تک اُمّتِ مسلمہ اسی انقلاب کی برکتوں سے فیض یاب ہوتی رہے گی۔ مصائب اور مشکلات کے زمانے میں اُٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ آپ نے جس ہمت واستقلال اور جرأت وبشاشت کے ساتھ کیا، یہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ کے کردار وعمل اور جہاد فی سبیل اللہ سے ہزاروں مسلمانوں کو نئی زندگی ملی اور

استقامت علی الدین کا حوصلہ ملا۔ بسا اوقات اولیاے کرام کے عقیدت کیش، کرامتوں کے ہجوم میں ان کی زندگی کے ان گوشوں کو فراموش کر دیتے ہیں جن کا تعلق جہدِ مسلسل، سعیِ پیہم اور جہاد فی سبیل اللہ سے ہوتا ہے۔ سرکار مفتی اعظم اس اعتبار سے ایک تاریخ ساز شخصیت کے حامل تھے کہ آپ نے اپنے دور میں؛ جو کچھ کم ایک صدی پر مشتمل تھا، اُٹھنے والے تمام فتنوں کا مقابلہ کیا، اور پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ ان گم راہیوں کا سدِ باب کیا جو مسلم معاشرے میں دَرانداز ہورہی تھیں۔ آپ نے اپنی تحریر و تقریر نیز حرکت و عمل سے الحاد و بے دینی کی کتنی ہی تحریکوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ہماری نسل نے ان کا بڑھاپا دیکھا ہے، مگر جن لوگوں نے ان کا عہدِ شباب دیکھا ہے وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ صرف ایک عالم، ایک فقیہ، ایک ولی، ایک زاہدِ شب زندہ دار ہی نہیں بلکہ ایک عظیم مجاہد بھی تھے۔

مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں داعیانِ دین نے دین کو پھیلایا، مگر حضور مفتی اعظم نے دین کو پھیلایا بھی اور دین پناہی کا فریضہ بھی انجام دیا۔ آپ نے اسلام کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت فرمائی۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ ''فقہا کے قلم کی سیاہی شہدا کے خون سے تولی جائے گی۔'' شہید- مملکتِ اسلامیہ کی جغرافیائی سرحدوں کے لیے جان دیتا ہے اور فقیہ- اسلام کی نظریاتی سرحدوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

ایک ایسے دور میں جب لوگ فرائض و واجبات کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ سرکار مفتی اعظم نے ان سنتوں کا احیا فرمایا جو نہ صرف یہ کہ لوگوں کی زندگی سے نکل چکی تھیں بلکہ ذہنوں سے بھی محو ہوگئی تھیں۔ آپ نے سیکڑوں سنتوں کو اپنے قول و عمل سے رواج عام دیا اور خود بھی **تمسک بالسنة** کا اہتمام فرماتے رہے۔ اور اپنے لاکھوں مریدوں کو بھی حکم دیتے رہے، بلاشبہہ آپ کو سیکڑوں شہدا کے ثواب سے نوازا جائے گا۔ اس لیے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ **من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهيدٍ.** [مشکوٰۃ شریف، ج ۱، حدیث ۱۷۶، دار الفکر، بیروت]

''جس نے فسادِ اُمّت کے وقت میری سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔''

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ سرکار مفتی اعظم کا دور مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی انحطاط اور زوال کا دور تھا، حکومتیں مٹ چکی تھیں، انگریزوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور مسلمانوں کے عقیدہ و ایمان پر ہر چہار جانب سے حملے ہو رہے تھے، کہیں وہابیت کے باطل عقائد کے ذریعہ مسلمانوں کے دلوں سے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت چھیننے کی کوشش کی جا رہی تھی، تاکہ قومِ مسلم بے جان لاشے میں تبدیل ہو جائے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو

اور کہیں قادیانیت، رفض و خروج اور نیچریت اپنے عقائدِ باطلہ کی اشاعت میں مصروف تھیں۔ ایسے دور میں امامِ اہلِ سُنّت امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ نے ان فتنوں کی سرکوبی کے لیے دلائل کی جو سرحدیں تعمیر فرمائی تھیں، سرکار مفتی اعظم نے زندگی کی آخری سانس تک ان کی حفاظت فرمائی۔

پیرانِ طریقت اور مشائخ کے ہجوم میں سرکار مفتی اعظم کی ذات اس اعتبار سے بہت ممتاز ہے کہ ان کے مریدین میں بیش تر علماے ملتِ اسلامیہ ہیں، کہ عالم میزانِ علم و عمل پر پورا اُترنے کے بعد ہی کسی شیخ کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیتا ہے۔ یہ مرشدِ برحق حضور مفتی اعظم کا روحانی تصرف تھا کہ جس نے بھی ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دیا وہ حق کے راستے میں جہاد فی سبیل اللہ کا آئینہ دار بن گیا۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں فتنۂ ارتداد [شدھی سنگھٹن] اپنی پوری قوت کے ساتھ تمام مادّی وسائل سے مسلّح ہو کر اسلام پر حملہ آور ہوا۔ ہندوؤں نے یہ پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ ہندوستانی مسلمان اصلاً ہندو ہیں، مغلوں نے انھیں بہ زورِ شمشیر مسلمان کیا تھا، اب مغل ختم ہو چکے ہیں، اس لیے ان کو اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ

آنا چاہیے۔ آگرہ وغیرہ کے ہزاروں مسلمان ہندو بن گئے۔ انھوں نے معاذ اللہ داڑھیاں منڈا دیں اور سر پر چوٹیاں رکھنے لگے۔ اس فتنۂ ارتداد کو ہندوؤں کے پنڈت، سرمایہ دار اور راجاؤں کا ہر طرح سے تعاون حاصل تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ چند سالوں میں مسلمانانِ ہند؛ ہندو بن جائیں گے، اور اس طرح ان کے -اکھنڈ بھارت- اور -رام راج- کا دیرینہ خواب پورا ہو سکے گا۔ ہندو ساہوکاروں نے اپنی تجوریوں کے منھ کھول دیے اور غریب مسلمانوں کو دولت کی لالچ دے کر ہندو بنانے لگے، اور جن علاقوں میں مسلمان ہندو بننے کے لیے تیار نہیں ہوئے، اُن پر مظالم کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔ دَر پردہ اس میں حکومتِ وقت بھی ملوث تھی، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس طرح سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر تحریکِ آزادی کا راستہ بھی روکا جا سکے گا اور مسلمانوں کی متحدہ قوت کو کم زور بھی کیا جا سکے گا۔

اسی زمانے میں متعدد پنڈتوں نے اسلام کے خلاف انتہائی دل آزار کتابیں لکھیں جس میں اسلام کے عقائد، قرآن عظیم اور پیغمبرِ اسلام کی سیرتِ طیبہ کا مذاق اُڑایا گیا۔ سوامی شردھانند کی ''ستیارتھ پرکاش'' اور ایک اور گستاخ کی کتاب ''رنگیلا رسول'' اس دور کی پیداوار تھیں، سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ علماے دیوبند اور ان کے ہم خیال مسلم سیاست دانوں نے اسی دور میں انگریزوں کے مقابلے میں ہندو مسلم اتحاد کی تحریک چلائی اور سوامی شردھانند جیسے گستاخ کو دلی کی جامع مسجد کے منبر پر بٹھا کر تقریریں کروائیں اور فتنۂ ارتداد سے یکسر آنکھیں بند کر لیں۔

ہندو مصنفین نے اس دور میں دست یاب قرآن عظیم کے تراجم کو سامنے رکھ کر اس طرح کے عنوانات اپنی کتابوں میں قائم کیے۔

معاذ اللہ- مسلمانوں کا خدا مکار رہے۔

اور نیچے وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ ط وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ [آل عمران: آیت ۵۴]

لکھ کر دیا بنہ کے ترجمے پیش کر دیے جنھوں نے عربی مکر کا ترجمہ اردو میں بھی ''مکر'' ہی سے کیا تھا۔

''مسلمانوں کا خدا ٹھٹھا کرتا ہے۔'' اس سرخی کے نیچے اَللّٰـــهُ یَسْتَھْـــزِئُ بِھِـــمْ [البقرۃ: آیت ۱۵] والی آیت لکھ کر استہزا کا وہ ترجمہ لکھا جو اس دور میں بعض تراجم میں موجود تھا۔ ایسے نازک ترین دور میں فتنۂ ارتداد کے خلاف حضور مفتی اعظم نے سُنّتِ صدیقی پر عمل کرتے ہوئے ایک عظیم تحریک چلائی۔ جماعت رضاے مصطفٰی کے پلیٹ فارم پر اکابر علماے اہلِ سُنّت کو جمع فرمایا، متاثرہ علاقوں کا دورہ فرمایا۔ پنڈتوں سے مناظرے کیے، اور بعض بعض علاقوں میں کئی کئی ماہ خیمہ زَن رہ کر ارتداد کے سیلِ رواں کو روکا، مرتد ہو جانے والے مسلمانوں کو دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل فرمایا۔ آپ کی جماعت کے ساتھ کچھ حجام بھی ہوتے تھے، جو دوبارہ اسلام قبول کرنے والوں کے آثارِ ہندومت کو سروں سے غائب کر دیتے تھے۔

یوں تو جملہ علماے اہلِ سُنّت حضور مفتی اعظم کے زیرِ قیادت اس جہادِ عظیم میں شامل تھے، مگر اعلیٰ حضرت کے چند عظیم خلفا حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیر بیشۂ اہلِ سُنّت مولانا حشمت علی خان رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا قطب الدین برہمچاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مناظرانہ طرزِ استدلال سے حالات کا رُخ بدل دیا۔ اس تحریک میں پنجاب کے ایک عظیم شیخ طریقت عاشقِ رسول حضرت علامہ پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے بار ہا سرکار مفتی اعظم کی دعوت پر اپنے رضا کاروں کے ساتھ جو ہمیشہ مسلح ہوتے تھے ان علاقوں کا دورہ فرمایا، اور اپنی نظرِ کیمیا اثر سے ارتداد کے فتنے کو ختم فرمایا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مفتی اعظم کا عہدِ شباب تھا اور ان کی دعوت پر اور ان کی قیادت میں معمر علما نے اس جہادِ عظیم میں شرکت فرمائی۔

اس دور میں دوسرے تراجمِ قرآن کے مقابلے میں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے

ترجمۂ قرآن عظیم نے ایک اہم رول ادا کیا۔ فتنۂ ارتداد کا استیصال حضور مفتی اعظم کی حیاتِ مبارکہ کا ایک عظیم باب ہے۔

علماے اہلِ سُنّت اور مشائخ عام طور پر یا تو خانقاہوں سے وابستہ رہے، یا درس گاہوں سے۔ انھوں نے سیاست کو شجرِ ممنوعہ قرار دے کر ہمیشہ خود کو میدانِ سیاست سے دور رکھا، جس کی وجہ سے انھیں مختلف ادوار میں شدید نقصانات برداشت کرنے پڑے لیکن سرکار مفتی اعظم نے بوقتِ ضرورت بعض سیاسی امور پر امتِ مسلمہ کو جمع فرمایا اور مرادآباد نیز بنارس کانفرنس میں سرحد سے لے کر بنگال تک تمام علما نے جمع ہو کر اپنے متفقہ فیصلوں سے حکومتِ وقت کو آگاہ کیا، جس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے۔

انھوں نے برتھ کنٹرول اور مسلم پرسنل لا کے معاملے میں شریعتِ مطہرہ کا جو فیصلہ صادر فرمایا اس پر ملک کے ہزاروں علما نے تائید فرمائی اور ایک آواز ہو کر حکومت کے غیر اسلامی فیصلوں کا مقابلہ کیا۔

سرکار مفتی اعظم کی شخصیت جملہ علماے اہلِ سنت اور جملہ سلاسلِ طریقت کے مشائخ کے لیے مرجع فتاویٰ اور عظیم قائد کی حیثیت رکھتی تھی، ان کے ہر فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا علما و مشائخِ ملتِ اسلامیہ کا معمول تھا، وہ ایک عظیم ولی، عظیم قائد، عظیم مجاہد اور مرجع فتاویٰ تھے؛ ان کی زندگی ہر دور کے مسلمانوں کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔



حافظِ ناموسِ ملت

استاذ العلماء جلالۃ العلم حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ ملتِ اسلامیہ کے ایک عظیم معمار تھے، جنھوں نے کم و بیش نصف صدی تک اسلامیانِ ہند کو باطل کے مسلسل حملوں سے بچائے رکھا، اور وصال سے قبل ملت کے گرد ایک ایسا حصار قائم فرما گئے جو رہتی دُنیا تک ناقابلِ شکست رہے گا- ان شاءاللہ تعالیٰ

حوادث، انقلابات، تغیرات، عالَم کی ناگزیر قدریں ہیں، جو عالَم اور اہلِ عالَم کو ہمیشہ درپیش آئیں گی۔ ملک ٹوٹتے اور متحد ہوتے رہیں گے، قومیں اُبھرتی اور مٹتی رہیں گی، تہذیبیں بلند و پست ہوتی رہیں گی، صفحۂ زمین پر سیاسی، معاشی اور ثقافتی اعتبار سے نئے نئے جغرافیائی نقشے اُبھرتے رہیں گے مگر دلوں کی دُنیا میں حضور حافظِ ملت کی ذات نے جو نقوش ثبت فرمائے ہیں وہ ناقابلِ شکست و ریخت ہیں۔ انسان کی روحانی زندگی کے گرد جو حصار قائم فرما گئے ہیں وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ روحانیت کے اس پیکرِ محسوس نے روح کی زندگی کے لیے جولافانی اقدامات کیے ہیں، وہ قیامت تک صالح اور سعید روحوں کے لیے وجہِ تسکین اور حاصلِ نشاط رہیں گے۔

حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے تھے جب کہ دُنیا کا سب سے- عظیم مذہب- سب سے- مظلوم مذہب- تھا۔ اور دُنیا کی سب سے عظیم قوم مسلسل شکستوں اور پیہم ہزیمتوں سے عاجز آ کر حالات کے رحم و کرم پر تھی۔ مسلمانوں کے سیاسی زوال نے نہ صرف یہ کہ اس قوم سے قوتِ عمل چھین لی تھی، بلکہ مذہبِ اسلام نے اُسے جو احساسِ برتری بخشا تھا وہ احساسِ کم تری میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جو لوگ اسلام کی تنظیموں سے آشنا تھے وہ صرف نوحہ کناں اور مرثیہ خواں تھے۔ اور حالات کے مدوجزر کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن کو مایوسیوں کے علاوہ کامیابی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دریں حالات برصغیر میں کچھ مصلحین اُٹھے مگر چوں کہ وہ لوگ خود فریب خوردۂ

حالات تھے اس لیے بجائے اسلام کی طرف دعوت دینے کے مغربیت کی طرف دعوت دینے لگے، اورانہوں نے مستقبل کی کامیابیوں کے امکانات صرف اس بات میں پائے کہ پوری قوم مغرب کی ذہنی، فکری اور ثقافتی غلامی اختیار کرلے اور اس سلسلے میں انہوں نے بے پناہ محنت کی، اور پورے اخلاص کے ساتھ محنت کی، لیکن ان کوششوں کے نتیجے میں جو لوگ سامنے آئے وہ پوری طرح سے شاطرانِ مغرب کی بساطِ لہو ولعب کے مہرہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے اُن کی جدوجہد اور سعیِ پیہم کا محور برصغیر میں مغربی اقدارِ حیات کا تحفظ اور پوری قومِ مسلم کو اسلام سے دور کرکے مغرب کی چوکھٹ پر سجدہ ریزی کے لیے تیار کرنا تھا۔ انہوں نے درس گاہیں قائم کیں، مگر ان درس گاہوں سے افکارِ اسلامیہ کا تحفظ کرنے والوں کے بجائے ایسے لوگ فارغ التحصیل ہوئے جن کے دل ودماغ پر مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی، اور سطوتِ اسلام کے سامنے سرخمیدہ ہونے کے بجائے اسلام سے بغاوت پر آمادہ ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض تو اس قدر جری ثابت ہوئے کہ انہوں نے اسلام کو فرسودہ نظریات وعقائد کا مذہب قرار دیا۔ اُن کے نزدیک نجات یا تو تقلیدِ مغرب میں تھی یا کارل مارکس کے معاشی نظریات میں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی درس گاہوں کے مسلم طلبہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ کچھ ابراہام لنکن کی جمہوریت کے علَم بردار تھے اور کچھ کارل مارکس کی اشتراکیت کے۔ لیکن ایک سو سال کی تدریسی اور تعلیمی زندگی میں وہ درس گاہیں ایسے چند افراد بھی پیدا نہ کرسکیں جو اسلامی نظامِ زندگی پر پورا یقین رکھتے ہوں اور جو اس ذہن وفکر کے ساتھ دُنیا کی قیادت کے لیے آگے بڑھیں، کہ انسانیت کی فلاح وبقا اور پوری دُنیا کے جملہ مسائل کا حل صرف اور صرف اسلام میں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ خالص اسلامی درس گاہوں سے ایسے لوگ کیوں پیدا ہونے لگے جن کے نظریات معتقداتِ اسلامیہ سے متصادم تھے اور جو مذہب کی آغوش میں پل کر بھی مذہب کے باغی اور ملحدانہ نظریات وخیالات کے حامل تھے۔ بظاہر یہ سوال بہت اہم ہے لیکن اگر ہم ان درس گاہوں کے بانیوں اور قائدوں کی

زندگیوں کا مطالعہ کریں اور ان کی تصنیفات کو بہ نظرِ عمیق پڑھیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ دراصل قیادت غیر صالح تھی اور مرکزی قائدین ہی اسلام کے بارے میں ریب وتذبذب کے شکار تھے، اور مغربی افکار ونظریات کے مقابلے میں ان کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔ وہ ایسے اسلام کو پیش کرنا چاہتے تھے جو مغرب کے نزدیک قابلِ قبول ہو، خواہ اس سلسلے میں انھیں روحِ مذہب کو ہی کیوں نہ قتل کرنا پڑے۔ چنانچہ ایک بہت بڑی درس گاہ کے بانی جب مغربی ممالک کے سفر سے واپس آئے تو اپنے ساتھ مستشرقینِ یورپ کے اعتراضات کا ایک انبار لائے اور بجائے اس کے کہ وہ ان کا جواب اسلام کے اصولوں کی روشنی میں دیتے انہوں نے نفسِ اسلام ہی کو بدل دینے کی کوشش کی۔ قرآنِ عظیم کی وہ تمام آیاتِ شریفہ جو معجزات یا خوارقِ عادات واقعات کو سمیٹے ہوئے ہیں اُن کی مادّی توجیہ کرڈالی، فرشتوں کو نفسِ ناطقہ کی ترقی یافتہ اور محسوس شکل قرار دیا، الہام اور وحی کو فکرِ انسانی کی نفیس ترین شکل اور وارداتِ ذہنی سے تعبیر کیا۔ جیسے کہ کسی شاعر کے پردۂ ذہن پر ایک خوب صورت شعر پورا کا پورا اُبھر آتا ہے۔ ایسے ہی نبی کے ذہن نبوت پر آیاتِ قرآنیہ کا نزول ہوتا ہے، ضربِ موسیٰ اور انفجارِ عیون کا مفہوم انہوں نے یہ سمجھایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر پہاڑ پر چلے گئے اور وہاں انہوں نے بارہ چشمے جاری پائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے احیاءِ موتی کے بارے میں یہ رائے دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام مُردہ دِلوں کو زندگی دیتے تھے اور بس۔ شفاءِ مبروص کے بارے میں یہ ذہن دینے کی کوشش کی گئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے ان مبروصوں کو دوبارہ انسانی سوسائٹی میں جگہ دی، جنھیں انسانوں نے نفرت کی بنا پر اپنی آبادیوں سے باہر نکال دیا تھا۔ شقِ صدر کی تشریح شرحِ صدر سے کی اور اس طرح سے **تفسیر الحدیث بالقرآن** کا دستورِ دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ معجزۂ شق القمر کی روایتوں کو ضعیف قرار دے کر تاریخی اعتبار سے ناقابلِ اعتبار بنا کر پیش کیا۔ معراجِ جسمانی کو خوابِ محض بنا کر پیش کرنے پر پورا زورِ قلم صرف کرتے ہوئے سیکڑوں صفحات سیاہ کرڈالے۔ جنت ودوزخ کو غیر موجود قرار دیا۔ اس سلسلے

میں قرآن وحدیث کی جملہ تشریحات کو قیامت کے بعد وجود پذیر ہونے والی جنت و دوزخ کا امکانی خاکہ قرار دیا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے، ورنہ اگر آپ دیکھیں تو صرف بابِ معجزات وخارقِ عادات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر اُس شعبے میں انھوں نے ترمیم کرنے کی کوشش کی جو مغربی تہذیب سے مختلف تھا، جسے مغرب کی مادّی عقل قبول کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ وہ طلبہ جو ان تحریروں کو پڑھ رہے تھے وہ اس کے نفسیاتی حملوں سے خود کو نہ بچا سکے۔ انہوں نے یہ تاثر لیا کہ یہ اسلام کے ایک ریفارمر کا اندازِ تحریر ہے جو مغرب کے مادّہ پرستوں کے سامنے اس قدر بے بس ہے کہ نہ صرف اسلام کے چودہ سو سالہ اندازِ فکر اور معتقدات کی نفی کر رہا ہے بلکہ عذر بھی پیش کر رہا ہے کہ اسلام تم سے علاحدہ کسی مستقل حیثیت کا مالک نہیں، یہ تو مسلمانوں کے مفسرین، مجتہدین، ائمہ اور اربابِ عزیمت کی [معاذ اللہ] کوتاہ نظری ہے کہ انہوں نے اسلام کو ایک منفرد نظامِ زندگی اور علاحدہ نظامِ حیات اور کامل ترین دستور العمل بنا کر پیش کیا، ورنہ ہمارا اپنا کوئی تشخص نہیں۔ موجودہ تہذیبِ مغرب تو دراصل اسلام ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ مذہب سے نا آشنا ذہنوں نے سوچا کہ جب تہذیبِ مغرب اسلام کی ترقی یافتہ شکل ہے تو ترقی یافتہ کو چھوڑ کر پس ماندہ کو کیوں قبول کیا جائے۔ ان درس گاہوں کے طلبہ کا ایک اور گروہ جو اپنے مخصوص رجحانِ فکر اور میلانِ طبع کی بنا پر مغرب کا ہم نوا نہ ہوسکا، وہ اشتراکیت کی آغوش میں چلا گیا جو مغربی دُنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک نیا اقتصادی اور معاشرتی نظام پیش کر رہی تھی۔ جو مغرب کے سامنے معذرت خواہ نہیں تھی۔ ایسی صورت میں اس فکرِ اسلامی کا علَم بردار کون ہوتا جس کا اپنا کوئی مستقبل موجود ہی نہیں تھا اور جو کچھ تھا وہ مغرب کے رحم وکرم پر تھا۔

چنانچہ کم وبیش ایک صدی تک ان درس گاہوں سے ملحدین، مادّہ پرست اور اشتراکی جنم لیتے رہے اور مسلم سرمایے سے قائم کردہ درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور اپنی تحریروں، تقریروں سے کارل مارکس، لینن اور اسٹالن کے نظریات کی اشاعت کرتے

رہے۔ یہاں تک کہ پورا اردو ادب جو عربی وفارسی کے بعد اسلامی نظریات کا سب سے زیادہ امین تھا؛ اشتراکی فکر کا علَم بردار ہوگیا اور بعض اعتبار سے اب بھی ہے۔ ایک طرف مسلم درس گاہوں کا یہ عالَم تھا، دوسری طرف مسلم تحریکوں کا جائزہ لیں تو یہاں بھی مایوسیوں کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ بعض تحریکیں مغرب کی تحریکوں کا چربہ تھیں جو روحِ اسلامی سے یک سر خالی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں جسمِ مغرب کو ڈھانکنے کے لیے اسلامی لباس پہنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان تحریکوں کے قائدین قرآن وحدیث کو اسلاف کی نگاہوں سے پڑھنے کے بجائے مغرب کی عینک سے پڑھنے کے عادی تھے اور اسی طرح سے مسلمانانِ عالَم کو لاشعوری طور پر اغیار کے آستانوں پر جھکانے کی کوشش کر رہے تھے۔

بعض مذہبی تحریکیں مذہب کو جس انداز سے پیش کر رہی تھیں اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ مذہب صرف چند مخصوص اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ مذہب کسی اجتماعی معاشرے کا ابدی نظام نہیں۔ انہوں نے اپنے رفقاے راہ کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ مذہب دراصل ایک مخصوص قسم کی - چلت پھرت - کا نام ہے اور اسی سے ہم دُنیا کے تمام سیاسی، تمدنی، معاشرتی معرکے سر کرلیں گے۔ انہوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر صرف یہی کوشش نہیں کی کہ مسلمانوں کو جدوجہد اور حرکت وعمل سے روکا جائے، بلکہ ایسا ماحول تیار کیا جائے کہ مسلمانوں کو دُنیا کی ترقیوں کا علم ہی نہ ہوسکے اور مذہب کو یہاں سے ضرب لگائی جا رہی ہے، اس کے مطالعہ کا موقع ہی نہ مل سکے۔ ماضی میں کم از کم اتنا تو ہوتا تھا کہ علماے کرام تاج داروں سے تعلقات رکھتے تھے اور ان کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے رہتے تھے، انھیں مفید مشورے دیتے تھے، ان کے اندر خوفِ خدا پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور احتسابِ یوم الدین کو ملحوظ رکھ کر قوم کو آگے بڑھانے کی تلقین کرتے تھے، مگر اب تو یہ حال ہوگیا ہے کہ مسلم معاشرہ اور زعماے معاشرہ کہاں کہاں غلطیاں کر رہے ہیں، معاشرہ کس طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے اور کون سے محرکات ہیں جن کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقے کے دل ودماغ سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے، ان خامیوں کا جائزہ لینا ہی بنامِ

مذہب جینے والوں کے لیے دُشوار ہو گیا ہے۔

حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جب قوم کی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو ان کے اِردگرد وہی ماحول تھا جس کا تذکرہ میں مندرجہ بالا سطور میں کر چکا ہوں۔ اُن کا حساس دل قوم کی اس حالت پر خون کے آنسو روتا رہا اور اُن کی سیکڑوں راتیں قوم کی اس حالت پر گریہ کناں گذریں۔ شب کی عبادتوں میں وہ اپنے سوزِ دروں کے پیشِ نظر قومِ مسلم کی صلاح و فلاح کے لیے دعائیں کرتے اور جب سپیدۂ سحر نمودار ہوتا تو ایک آہِ سحر گاہی کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے تاکہ قوم و ملت کی تعمیر کر سکیں۔ ان کی مومنانہ بصیرت نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ قوم و ملت کو سب سے زیادہ نقصان تعلیم و تربیت کی راہ سے پہنچایا جا رہا ہے۔ اب باطل کے حملوں کا انداز بدل گیا ہے، پہلے باطل شمشیر بکف آتا تھا اس لیے اس کے مقابلے میں شمشیر بکف مجاہدین کی ضرورت تھی، مگر اب زیورِ فکر و فن سے آراستہ ہو کر نظریاتِ اسلامی کی سرحدوں پر تاخت و تاراج کے لیے بڑھ رہا ہے۔ اب ضرورت ہے ایسے بیدار مغز اور پختہ کار علما اور مصلحین کی جو اسلام کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کر سکیں، اور باہر سے ہونے والے ہر حملے کا جواب دے سکیں۔ خواہ وہ حملہ سوشلزم اور کمیونزم کی جانب سے ہو، خواہ الحاد و بے دینی کی طرف سے، خواہ مادّہ پرستوں کی جانب سے ہو، خواہ مغرب زدہ انسانوں کی جانب سے، داخلی محاذ ہو یا خارجی محاذ ہو، ہر محاذ پر باطل کا مقابلہ کر سکیں۔

یہی وجہ تھی کہ آپ نے مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم کو پورے عالَمِ اسلام کی ایک مثالی درس گاہ بنانے کے لیے اپنی زندگی وقف فرما دی۔ آپ نے مدرسے کی تعلیم و ترقی کی راہ میں بے پناہ مشقتیں برداشت کیں۔ تعمیر ملت کی راہ میں اہلِ حق کو ہر دور میں مشکلات و مصائب کی جن منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے حضور حافظِ ملت اُن تمام منازل سے گذرے۔ آپ نے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ قوم کو تعمیری راہ پر لگانے کے لیے جسمانی مشقتیں جھیلیں۔ باطل کے مقابلے میں صبر و استقلال، ثبات و وقار عطا فرمانے کے لیے اپنے وجودِ

مقدس کو ہر طرح سے، ہر محاذ پر سب سے آگے رکھا، زبان و قلم کی توانائیاں صَرف کیں۔ عشقِ رسول کی شمع روشن کرنے کے لیے، قوم کے اندر باطل قوتوں کے خلاف مدافعانہ جذبات بیدار کرنے کے لیے، مصائب و آلام کے مقابلے میں سینہ سپر رہے۔ غریب قوم کو ایثار و قربانی پر مائل کرنے کے لیے فاقہ کشی کی زحمتیں برداشت کیں۔ اساتذہ کے اندر دُنیاوی مطالبات سے بلند ہو کر دین کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے خود زندگی کے جملہ معاشی مطالبات سے دست بردار رہے۔ طلبا کے اندر زہد و اتقا پیدا کرنے کے لیے آپ اپنی فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہمیشہ پابندِ شریعت و سنّتِ مصطفیٰ رہے۔ لوگ آدابِ شریعت کتابوں میں پڑھ کر جانتے ہیں مگر حضور حافظِ ملت کی حیاتِ مقدس شریعتِ مطہرہ کی ایک روشن کتاب تھی، جسے دیکھ کر لوگ قانونِ زندگی اور دستورِ حیات سیکھتے تھے۔ ایسے ماحول میں جہاں رُخصتیں تلاش کی جاتی تھیں، آپ ہمیشہ پابندِ عزیمت رہے تاکہ ان کے طلبا اور ان کے خوشہ چیں ان کی عزیمتوں سے استفادہ کر کے مستقبل میں ایک نئی تاریخ دعوت و عزیمت مرتب کر سکیں۔ جو ایثار، اخلاص، للّٰہیت، زہد و اتقا اور آلام و مصائب پر ثبات و استقلال سے بھر پور ہو۔ آپ نے سرفروشانِ ملتِ اسلامیہ کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک ایسے قصبے کا انتخاب فرمایا جو ابھی تک ہر طرح کی غیر دینی آلائشوں سے پاک تھا۔ جہاں کے لوگ غریب تھے اور سرمایے سے زیادہ خونِ جگر پیش کر سکتے تھے۔ مگر اشرفیہ کے ارتقا کی تاریخ شاہد ہے کہ غربائے مبارک پور نے حضور حافظِ ملت کی قیادت میں اپنا مال و زر بھی پیش کیا اور خونِ جگر بھی، اور دیکھتے ہی دیکھتے مدرسہ اشرفیہ دارالعلوم اشرفیہ کی صورت میں درسِ نظامیہ کی سب سے عظیم اور سب سے معیاری درس گاہ بن گیا۔ اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آپ نے مبارک پور کو بغداد، قرطبہ، طلیطلہ، قاہرہ، شیراز، اصفہان، سمرقند و بخارا اور دہلی کی قدیم درس گاہوں کے ہم دوش کر دیا۔ ممکن ہے کوئی شخص کمیت کے بارے میں شبہہ کرے مگر کیفیت کا یہ عالَم ہے کہ ہندوستان کے ۷ر کروڑ مسلمانوں میں سے کم از کم پانچ کروڑ مسلمانوں کی دینی ضروریات کا واحد کفیل الجامعۃ الاشرفیہ ہے۔ حضور حافظِ ملت کی

آغوشِ تربیت میں پروان چڑھنے والے طلبہ نے زندگی کے جس میدان میں قدم رکھا؛ کامیابیوں نے ان کے قدم چوٗمے۔ دارالعلوم اشرفیہ کے علما نے ملت کو حقیقی اسلام کی طرف دعوت دی۔ ان کے خطبات اور تقریریں ایک طرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نظامِ رحمت کی طرف دعوت کا آئینہ دار ہوتیں تو دوسری طرف ان تمام حریف قوتوں کا دنداں شکن جواب بھی ہوتی ہیں جو صدیوں سے مسلمانوں کی بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ وہ اگر ایک طرف اسلام کا نظامِ عبادت و طاعت پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف اسلام کا ثقافتی اور مدَنی نظام۔ ایک طرف ان کی تقریروں اور تحریروں سے اسلام کے معاشی نظام کے حقائق سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام۔ اگر ایک طرف سیاستِ اسلامیہ عصرِ جدید کی زندہ حقیقت بن کر نمودار ہوتی ہے تو دوسری طرف وہ اسلام کے ماضی کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ صرف مرثیہ نہ بن جائے بلکہ مستقبل کی راہوں میں اُمیدوں کے چراغ روشن کرے۔ ان کا شعورِ تنقید اسلام کی مخالف طاقتوں سے بے خبر نہیں ہے۔ اگر ایک طرف قرونِ اولیٰ کے معتزلہ اور خوارج کی خبر لیتے ہیں تو دوسری طرف عصرِ جدید کے مستشرقینِ یورپ کی تحریریں اُن کی زد میں ہیں۔ عصرِ جدید کے ملحدین، مرتدین، مادیّین نے بار بار برملا اعتراف کیا ہے کہ علماے اشرفیہ کی موجودگی میں ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ یہ سب حضور حافظِ ملت کے طریقۂ تعلیم و تربیت کا اثر ہے، جنھوں نے بے شمار نا قابلِ التفات افراد کو اس قابل بنا دیا کہ وہ آج مرجعِ عوام وخواص ہیں۔ خداے قدیر و جبار نے اس محسنِ ملت کو اس قدر جوہر شناس نگاہ بخشی تھی کہ وہ مٹی میں ملے ہوئے نا تراشیدہ پتھروں کے اندر پوشیدہ جواہر کو پہچان لیتے تھے۔ وہ انھیں زمین سے اُٹھا کر اُس تربیت گاہ میں لے جاتے جہاں سے نکلنے والے ہمیشہ اربابِ علم وفضل سے خراجِ تحسین وصول کرتے رہیں گے۔

حضور حافظِ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کے طریقۂ تعلیم و تربیت پر ایک مستقل تصنیف ہونی چاہیے۔ مختصر سا رسالہ اس تفصیل کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن اُن کی تعلیم و تربیت کے چند

بنیادی عناصر ضبطِ تحریر میں لا رہا ہوں، جس کی تائید ان کے تمام طلبہ کریں گے۔ ان شاء اللہ

آج کی یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں یہ طریقۂ تدریس رائج ہے کہ استاذ متعلقہ موضوع پر تیار ہو کر آتا ہے اور اپنی تحریر کی مدد سے ایک لیکچر دیتا ہے، جسے طلبہ ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور قیدِ تحریر میں لاتے ہیں۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ طلبا کتابی نہ بنیں، اور زندگی بھر لکیریں ہی نہ پیٹتے رہیں۔ بلکہ وہ درسی کتابوں سے ہٹ کر بھی مطالعہ کی عادت ڈالیں اور وہ موضوع کے پابند رہیں، کتابوں کے نہیں۔ اس لیے کہ کتبِ درسیہ رہ نماے منزلِ علم ہیں، منزل نہیں۔ حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی ہمیشہ لفظ بہ لفظ ترجمے سے احتراز فرمایا، بلکہ کتاب اور مبحث کو سامنے رکھ کر ایک ایسی تقریر فرماتے تھے جو موضوع کی تمام جزئیات اور کتاب کی عبارت کو حاوی ہوتی تھی اور طلبہ کے ذہنوں میں علم کا ایک خزانہ منتقل کر دیتی تھی۔ اُن کے اس طریقۂ تدریس نے طلبہ کو مطالعہ کا پابند بنا دیا تھا اور بہت کم طلبہ اُن کی مجلسِ درس میں بغیر مطالعہ کے شریک ہوتے تھے۔ حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اُن طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جو اپنے مطالعے کی روشنی میں اُن سے سوالات کرتے تھے۔ حضرت کی پوری تدریسی زندگی میں ایک بھی ایسی مثال نہیں دی جاسکتی کہ آپ نے سوال کو نظر انداز فرما دیا ہو، یا سائل طالب علم پر برہمی کا اظہار فرمایا ہو۔ اس کے برعکس جب کوئی طالب علم سوال کرتا تھا تو آپ کے چہرے پر بے پایاں مسرت کے آثار صاف نمایاں ہوتے تھے اور ایسے جملے ارشاد فرماتے جن سے بے زبان طالب علم کو زبان مل جائے، اور اُس کی خوابیدہ ذہنی صلاحیتیں بیدار ہوجائیں۔ کبھی کبھی ارشاد فرمایا کرتے تھے: ''سوالات ذہنِ بیدار کی علامت ہیں۔''

اس کے برعکس میں نے ہندوستان کی ایک مشہور درس گاہ میں جب ترمذی شریف کے درس کے موقع پر پے در پے دو سوال کر ڈالے تو مجھے یہ کہہ کر محروم جواب رکھا گیا کہ اس طرح ہم نصاب مکمل نہ کرسکیں گے۔ اس وقت حضور حافظِ ملت کی یاد اس شدت سے آئی تھی کہ آنسو چھلک پڑے تھے۔ حضور حافظِ ملت کی تدریس کی یہی خصوصیت تھی جس کی وجہ سے

اُن کا ہر شاگرد جرأت مند، باوقار اور پُراعتماد ہوتا تھا اور کسی بھی مسئلے میں شک وشبہہ کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ اور غالبًا اس کا یہی اعتماد اُس کو بڑے سے بڑے میدانِ علم میں تنہا اُترنے پر آمادہ کرتا ہے۔

حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ہمیشہ طلبہ کو اس بات کا درس دیا کہ حق بات ضرور کہو، خواہ اس کے لیے کتنے ہی ابتلا وآزمائش کے مرحلوں سے گذرنا پڑے، **افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر**. آپ نے ہمیشہ طالبانِ علمِ نبوت کے جائز موقف کی حمایت کی اور مصلحتوں کے سامنے سرنگوں نہ کرکے ہمیشہ ان کی علمی انا اور جذبۂ حق گوئی کو مجروح ہونے سے بچایا۔ اشرفیہ کی زندگی میں بارہا ایسے مقامات آئے جب طلبہ نے ایسی حق بات برملا کہہ دی جس سے بعض حضرات کے پندار کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ بعض مصلحت اندیشوں نے طلبہ کے اقدامات کو نقصان دہ قرار دیا، مگر حضور حافظِ ملت نے ہمیشہ مسرت کا اظہار فرمایا، اس لیے کہ ان کی مدبرانہ فراست یہ پسند نہیں فرماتی تھی کہ جن طلبہ کے کاندھوں پر مستقبل قریب میں ملت کی قیادت وامامت کا بوجھ پڑنے والا ہے اُن کو مصلحتوں کا پابند بنادیا جائے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد مذہبی حالات سب سے زیادہ خراب ہوگئے۔ پہلے مدارسِ عربیہ سلاطینِ اسلام کی مراعات کے زیرِ سایہ چلتے تھے مگر جب–شاہ–ہی نہ رہے تو مراعاتِ شاہانہ کہاں سے آئے۔ چنانچہ اب تک یہ حال ہے کہ زیادہ تر مدارس صدقہ، زکوٰۃ اور دیگر رقومِ خیر کے سہارے چلتے ہیں۔ اس لیے کہ اس دور میں مدارسِ عربیہ کی بقا کا اور کوئی ذریعہ نہیں مگر اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ قوم کے تعاون سے چلنے والے اِداروں میں ایسے قائدین ناپید ہوتے جارہے تھے جو قوم کے افراد کو ان کی غلطیوں پر برملا ٹوک سکتے۔ یہ احساسِ کم تری اُس غلط اندازِ تربیت کا نتیجہ تھا جو عام درس گاہوں میں پایا جاتا ہے۔

مگر حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے طلبہ کے اندر احساسِ برتری پیدا فرمایا، قوم کے اندر مہمانانِ رسول کی حیثیت سے ان کا تعارف کرایا اور عوام سے مطالبہ فرمایا کہ وہ

طلبہ کا احترام کریں۔ چنانچہ مبارک پور کے عوام نے طلبہ کو اس قدر احترام کی نگاہ سے دیکھا کہ اس کی مثال کہیں سے نہ مل سکے گی۔ ہندوستان کی تمام درس گاہوں میں اساتذہ اور طلبہ کے درمیان خادم ومخدوم کا رشتہ ہوتا ہے، لیکن الجامعۃ الاشرفیہ کے مخدومِ گرامی وقار نے اپنے طلبہ کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز تصور فرمایا، اور طلبہ کو اتنی محبت عطا فرمائی کہ وہ اپنے حقیقی والدین کی محبت، اُن کی عنایتوں پر قربان کردیں۔ اپنے ہی شاگردوں کو–مولانا–کہہ کر یاد فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اشرفیہ کے جملہ اساتذہ اپنے طلبہ کو اسی طرح یاد کرتے ہیں، جس طرح حضور حافظِ ملت یاد فرمایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری عنایتیں صرف اس لیے تھیں کہ مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بے بضاعتی کو محسوس کرکے احساسِ کم تری کا شکار نہ ہوجائیں، بلکہ وہ جس راہ کے مسافر ہیں اُس راہ کی عظمت کے پیشِ نظر خود کو خیرِ امّت کی حیثیت سے پیش کرنے کے لیے تیار ہوں اور ان کے اندر قائدانہ صلاحیتیں بیدار ہوں۔ وہ اتنے باوقار بن سکیں کہ وقت کی ہر جابر وظالم قوت کو للکار سکیں۔

الجامعۃ الاشرفیہ کے ابتدائی ایام میں حضور حافظِ ملت کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اگر میں یہ کہوں تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ان مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ انھیں کی ہمت تھی کہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی ان کی جبینِ استقلال پر شکن نمودار نہ ہوئی بلکہ مشکلات میں انہوں نے اپنی رفتارِ عمل مزید تیز کردی۔ اشرفیہ نے ابھی ترقی کی راہوں میں پیش قدمی کی ہی تھی کہ تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کا مرحلہ پیش آیا۔ یہ ایک ایسا طوفان تھا کہ ہندوستان کی بڑی بڑی درس گاہیں اس سیلابِ عظیم کی نذر ہوگئیں۔ اُس کا لازمی اثر اشرفیہ پر بھی پڑا لیکن حضور حافظِ ملت کے صبر و استقلال نے حالات کا رُخ بدل دیا۔ لوگ ترکِ وطن کرنے لگے۔ مبارک پور اور اطراف وجوانب کے مسلمان بھی ملک کے اندر اپنی توانائیوں کے استعمال کو اسرافِ بے جا تصور کرنے لگے۔ مستقبل کے بارے میں مایوسیوں کی ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی جو کسی بھی جرأت

مندانہ اقدام کے لیے نامناسب تھی۔حضور حافظِ ملت کی مومنانہ بصیرت یہ دیکھ رہی تھی کہ پاکستان یا دُنیا کا کوئی بھی ملک ہندوستان کے ۶ رکروڑ مسلمانوں کا کفیل نہیں ہوسکے گا۔اور انجام کار مسلمان اپنے وطن سے دور ہوکر ہزاروں ذلتوں اور رُسوائیوں کا شکار ہوگا۔چنانچہ آپ نے مسلمانانِ مبارک پور واطراف وجوانب کو سمجھایا کہ- ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست-الارض للّٰہ کے مقدس ضابطے کے پیشِ نظر ہمارا وطن ہندوستان ہی ہے، جس کو سجانے اور سنوارنے میں ہم نے ایک ہزار سال کی جملہ صلاحیتیں خرچ کی ہیں۔جس ملک کو ہم نے تہذیب وتمدن سے آشنا کیا ہے، جہاں کے رہنے والوں کو ہم نے شعورِ حیات عطا کیا ہے۔اور زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں سے نوازا ہے۔جس کے چپے چپے پر ہماری ہزار سالہ سطوتوں کے نشانات ثبت ہیں۔جس کی زمین ہمارے اولیا، علما، صلحا، شہدا کے عظیم کارناموں کی امین ہے۔جس میں خواجۂ ہند سے لے کر اعلیٰ حضرت تک آسودہ ہیں۔کیا ان کے آستانوں کی کشش ہم کو دُنیا کے ہر حصے میں بے قرار نہ رکھے گی؟ آپ کی ان مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیار قافلے رُک گئے۔بندھے ہوئے بستر کھول دیے گئے اور لوگوں نے نئے عزم وحوصلے کے ساتھ زندگی کی راہوں میں پیش قدمی کی۔قوم نے الجامعۃ الاشرفیہ کو اپنی آرزوؤں کا حاصل بنالیا، اور اپنی تمام توانائیاں جامعہ کی تعمیر وترقی کی راہ میں خرچ کرنے لگی۔اس طرح سے حضور حافظِ ملت نے پوری قوم کو مائل بہ عمل کر دیا، اور ملت کا ہر فرد مصروفِ جہاد ہوگیا۔اس تاریخ ساز شخصیت اور انقلاب انگیز ذات نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعین کردہ خطوطِ عمل کے مطابق ایک علمی اور اصلاحی معاشرہ تشکیل فرمایا اور ایک ایسی قوم منظرِ عام پر آئی جو حسنِ عقیدت کے ساتھ ساتھ حسنِ استدلال کی دولت سے بھی مالا مال تھی۔کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ سیّدنا اعلیٰ حضرت سے قبل اُمّتِ مسلمہ ایک ایسے دور سے بھی گذر چکی تھی کہ اُس کے پاس روایات کو باقی رکھنے کے لیے صرف حسنِ عقیدت کا سہارا رہ گیا تھا اور دلائل وبراہین قدما کی کتابوں میں پوشیدہ ہوگئے تھے۔

جن کو پڑھنے والے دن بہ دن ناپید ہوتے جا رہے تھے۔اعلیٰ حضرت نے اسلاف کی کتب سے دلائل وبراہین تلاش فرمائے اور انھیں کم وبیش ایک ہزار کتابوں میں محفوظ فرما دیا، تاکہ مرورِ ایام کی دست برد سے محفوظ ہوجائیں۔مگر حضور حافظِ ملت نے ان دلائل وبراہین سے آراستہ ایک ایسی قوم تشکیل فرمادی، جو ہر دور میں اُمّتِ مسلمہ کے بنیادی نظریات کو اُصولوں کی روشنی عطا کرتی رہے گی۔تلاش بسیار کے بعد بھی ہندوستان کی ایک ہزار سالہ تاریخِ دعوت میں کوئی فردِ کامل نہیں ملتا جس نے اپنی زندگی میں ایک درس گاہ قائم کی ہو اور اس کی حیات ہی میں اس درس گاہ کے طلبہ اور فارغ التحصیل علما نے غیر منقسم ہندوستان کے طول وعرض میں ہزاروں درس گاہیں قائم کر دی ہوں اور اوّلین درس گاہ کا بانی اپنے مولائے حقیقی کے حضور اس وقت پہنچا ہو جب کہ ملک کا گوشہ گوشہ اس کی تعلیمات کا امین اور اس کے دینی نظریات کا علَم بردار ہو۔قسّامِ ازل نے یہ شرف صرف حضور حافظِ ملت کے مقدر میں رکھا تھا، کہ آپ نے اپنی حیات ہی میں الجامعۃ الاشرفیہ کے ہزاروں طلبہ کو مسندِ تدریس پر فائز ملاحظہ فرمالیا اور جب آپ اپنے خدائے حقیقی سے ملے تو آپ کی ذاتِ اقدس کے چراغ سے ملک کے طول وعرض میں ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک میں ہزاروں چراغ روشن ہوچکے تھے۔اور آج بھی باطل کی طوفانی آندھیوں میں آپ کا اخلاصِ عمل فانوس بن کر اُن کی حفاظت کر رہا ہے۔دُنیا کی بے شمار درس گاہیں ایسی ہیں جہاں تعلیم پر زور دیا جاتا ہے مگر تربیت پر نہیں اور آج کی جدید دُنیا نے تو تربیت کو تعلیم سے قطعاً الگ کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں طلبہ کی تہذیبی اور اخلاقی حالت کا جائزہ نہیں لیا جاتا اور نہ ہی ان کے کردار کا احتساب کیا جاتا ہے، مگر حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تعلیم کے ساتھ طلبہ کی اخلاقی، روحانی اور فکری تربیت پر بھی اپنی توجہات مرکوز رکھیں اور طلبہ کے ذہن سے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ اوجھل نہ ہونے دیا کہ ان کی تعلیم کا مقصد کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہزار موانع کے باوجود ان کے طلبہ علمِ دین کی خدمت ضرور کرتے ہیں اور جہاں کہیں

بھی ہیں اپنے مقصدِ حیات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

الجامعۃ الاشرفیہ کے طلبہ کے سامنے چوں کہ حضور حافظِ ملت کی بے نقاب زندگی ہوتی ہے اس لیے وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے طرزِ حیات کو اپنائیں اور اس کی سیکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ جن لوگوں نے حضرت کے طرزِ حیات کو اپنایا وہ اقلیمِ دل کے تاج دار بن گئے............

حضور حافظِ ملت اپنے طلبہ کے لیے ایک استاد ہی نہیں تھے بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر ان کی راہ نمائی اور ہر طرح کی امداد فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فراغت کے بعد میدانِ عمل کا انتخاب بھی حضور استاذ العلماء ہی فرمایا کرتے تھے اور میدانِ عمل کے نشیب وفراز اور راہ کی دشواریوں میں اُن کا کرم ہمیشہ شریکِ حال رہا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اشرفیہ سے جدا ہونے کے بعد بھی ان کے طلبہ ان کی شخصیت کو مرکزِ ثقل تصور کرتے تھے، اور ان کے قدموں سے وابستگی میں اپنی نجات تصور کرتے تھے۔ ان کی بے پناہ عنایتوں کا ہی نتیجہ ہے کہ اشرفیہ کا ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ حضور حافظِ ملت کا کرم سب سے زیادہ اُسی کے شریکِ حال ہے۔ انہوں نے اپنے لطفِ عمیم سے وابستگانِ دامانِ علم کو اس قدر قریب کرلیا تھا کہ طلبہ ان سے اپنی جملہ حوائجِ دینی و دُنیوی کا تذکرہ کرتے ہوئے جھجک نہیں محسوس کرتے تھے۔

استاذ العلماء رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سفرِ حج کے لیے تیار تھے۔ میں بلرام پور ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ بہ وقتِ رُخصت میں نے دُعا کی درخواست کی اور خدا جانے کیوں اس وقت مالی پریشانیوں کا خیال آ گیا۔ حضور نے دُعا فرمائی اور اس کے بعد سے لے کر آج تک میں کبھی مالی پریشانیوں میں مبتلا نہیں ہوا۔ حضور حافظِ ملت اثنائے درس اور اثنائے خطاب مغربی تہذیب پر اس انداز سے تنقید فرمایا کرتے کہ وہ اپنی چمک دمک کے باوجود بے حقیقت اور بے وزن معلوم ہوتی تھی۔ مغرب کی مادّی زندگی اور اُس کی کثافتوں کے مقابلے میں اسلام کی روحانی زندگی اور اس کی برکتوں کا تذکرہ کچھ اس قدر حکیمانہ انداز سے

فرمایا کرتے تھے کہ اقبال کا یہ شعر شرحِ محسوس بن کر سامنے آجاتا تھا۔

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

طلبہ کی ناشائستہ حرکت اور نامناسب ہر اقدام پر تنبیہ اس انداز سے فرماتے کہ ان کی تنبیہ کے الفاظ ہی طلبہ کی اصلاح کے لیے کافی ہوتے تھے۔ میں بعض اعزا کے مشورے سے الجامعۃ الاشرفیہ میں متوسطات تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ندوۃ العلماء چلا گیا۔ اپنے اس اقدام پر میں اس قدر شرمندہ اور منفعل تھا کہ کئی بار ارادے کے باوجود حضور استاذ العلماء کی خدمت میں حاضری کی جرأت نہ کرسکا تا آں کہ ندوے کے طالب علمی کے زمانے میں استاذ العلماء لکھنؤ کے ایک اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے تشریف لائے۔ مچھلی محل میں قیام تھا۔ حضور نے احسانِ عظیم فرمایا اور مولانا غلام محمد صاحب بھیروی صدر المدرسین مدرسہ تعلیم القرآن بلرام پور گونڈہ کو ندوہ بھیجا کہ وہ مجھے خدمتِ اقدس میں حاضر کریں۔ میں سخت شرمندہ تھا۔ لرزاں و ترساں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ آج خیر نہیں ہے۔ حضور سخت ناراض ہوں گے مگر قربان جایے سلام عرض کرنے کے بعد دست بوس ہوا تو ارشاد فرمایا **الحکمۃ ضالۃ المومن** میں تمہارے ندوہ آنے پر ناراض نہیں ہوں۔ بس میری یہ خواہش ہے کہ خدائے قدیر تم کو خادمِ سُنّیت بنائے۔ خدا جانے ان لفظوں میں کیا تاثیر تھی کہ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے اور دیر تک یہ کیفیت رہی، تا آں کہ حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی پر تاثیر دُعاؤں سے تسکین عطا فرمائی۔

جامعہ اشرفیہ سے ندوۃ العلماء میں داخل ہونے کے بعد میرا اندازِ فکر بدل گیا تھا اور میں نے طے کرلیا تھا کہ عالمیت کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی میں داخلہ لے لوں گا اور گریجویشن کے بعد کسی آفس وغیرہ میں ملازمت کرلوں گا۔ مگر حضور کی نگاہِ کرم نے مجھے ایک بار پھر

مقصدِ حیات سمجھا دیا اور اب جب اُن کی بارگاہ سے واپس ہوا تو یہ طے کر چکا تھا کہ میری زندگی کا ہر لمحہ خدمتِ دین کے لیے وقف ہوگا۔ ندوے سے فراغت کے بعد بھی حضور نے فراموش نہیں فرمایا بلکہ اشرفیہ میں طلب فرما کر بخاری شریف کا امتحان دلوایا اور سندِ فراغت و دستار سے نوازا۔ یہ اُن کا کرم تھا کہ اُنھوں نے ایک ذرّۂ راہ کو اِس قدر عزت بخشی۔ میں اس خوش فہمی میں قطعاً مبتلا نہیں ہوں کہ یہ اُن کی عنایت صرف میرے ساتھ تھی بلکہ میرا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے کہ ان کے خوانِ علم کا ہر ہر ریزہ خوار اس طرح کے واقعات اپنی زندگی میں چھپائے بیٹھا ہے۔

اپنے طلبہ کے بارے میں حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی کہ طلبہ حصولِ تعلیم کے ساتھ تبلیغ واشاعتِ دین کے نشیب وفراز کو بھی سمجھیں اور زمانۂ طالب علمی ہی میں اُن کے اندر حالات سے مقابلہ کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ چنانچہ آپ طلبہ کی مختلف جماعتوں کو ہمیشہ مصروفِ عمل رکھتے تھے اور جمعرات وجمعہ کو اشرفیہ کے قرب وجوار میں طلبہ کے تبلیغی وفود بھیجتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اشرفیہ سے فراغت پانے والے طلبہ میدانِ عمل میں خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتے، بلکہ جہاں بھی جاتے ہیں اُن کو کام کرنے کا ایک ماحول مل جاتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ذات کے گرد مصنوعی خودداری کا ایک حصار قائم کر لیتے ہیں، اور اس سے باہر نکلنے میں ایک جھجک محسوس کرتے ہیں، اس طرح پوری زندگی گذار لیتے ہیں، مگر نہ ان سے قوم کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ خود اُن کی ذات کو۔ حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حکیمانہ انداز سے ایسے لوگوں کا علاجِ فکر فرماتے تھے کہ اُن کی اَنا بھی مجروح نہیں ہوتی تھی، اور وہ مائل بہ عمل بھی ہو جاتے تھے۔

میں نے جامعہ اسلامیہ رونا ہی فیض آباد سے حضور کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ جامعہ مالی انحطاط کا شکار ہے اور میں خود اپنے اندر یہ ہمت نہیں پاتا کہ قوم کے سامنے دستِ سوال دراز کروں۔ حضور حافظِ ملت نے جو جواب عطا فرمایا تھا، وہ مجھ جیسے بہت سے

افراد کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ ارشاد فرمایا: تمام بلندیاں فدایانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیچے ہیں۔ خود رحمتِ عالَم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر صحابہ سے سرمایہ طلب فرمایا ہے۔ قوم سے قوم ہی کے لیے طلب کرنا نہ عزتِ نفس کے خلاف ہے اور نہ ہی وجہِ شرم ہے۔ ہاں اپنی ذات کے لیے قوم کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا یقیناً باعثِ ننگ و عار ہے۔ خدا اس سے جملہ خادمانِ دینِ متین کو محفوظ رکھے۔ آمین بجاہ حبیبہٖ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

آپ کی چالیس سالہ جدوجہد کے بعد دارالعلوم اشرفیہ ہندوستان کا ایک مثالی دارالعلوم بن چکا تھا اور اس راہ میں آپ اپنی عملی زندگی کے بہترین ایام خرچ کر چکے تھے۔ انسان عالمِ پیری میں نہ صرف یہ کہ قویٰ میں اضمحلال محسوس کرتا ہے بلکہ تعمیری کاموں کے سلسلے میں وہ ذوق وشوق باقی نہیں رہتا۔ لیکن حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے، جو لوگ اس دُنیا میں کسی کامیابی کو منزل تصور کر لیتے ہیں بلکہ- ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں- کے مصداق آپ نے دُنیا کی مادّی درس گاہوں کا مشاہدہ کیا۔ مادّی لٹریچر اور ان کی ظاہری دل فریبی اور خوش نمائی آپ کے سامنے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ باطل آج کس قدر آراستہ اور پیراستہ ہو کر لوگوں کے سامنے آ رہا ہے۔ الحاد، مغربیت، کمیونزم اور سوشلزم کو پھیلانے کے لیے اہلِ دُنیا نے کتنی بڑی بڑی یونی ورسٹیاں قائم کی ہیں۔ آج باطل کی اشاعت کے لیے دُنیا کی تمام زبانوں کو استعمال کیا جا رہا ہے، لیکن حق دارالعلوموں اور مسجد کی چہار دیواریوں میں محدود ہے۔ پوری دُنیا میں مسلمانوں کی کوئی ایسی درس گاہ نہیں ہے جس میں ابتدا سے انتہا تک مذہب پڑھایا جاتا ہے، اور تعلیم کے ہر شعبے پر مذہب کی گہری چھاپ ہو۔ جہاں معاشیات کا درس رزّاقِ حقیقی کا نام لے کر دیا جاتا ہو اور جہاں سائنس کے جملہ شعبوں [طبیعیات، فلکیات، عبقریات وغیرہ] کی تعلیم صنّاعِ حقیقی اور خلّاقِ عالم کی عظمتِ تخلیق کے لازمی تصور کے ساتھ دی جاتی ہو۔ جہاں طب کا بنیادی

اُصول یہ بتایا جاتا ہو کہ ۔نسخۂ بیمار کا عنواں ہو الشافی بود۔ جہاں تسخیرِ کائنات کی تعلیم ''سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم'' کے عقیدے کے ساتھ دی جاتی ہو۔ جہاں مشاہدۂ کائنات کے ساتھ ساتھ پردۂ ذہن پر یہ حقیقتیں جلوہ گر ہوتی ہوں ؎

وفی کل شی له اٰیة   تدل علٰی انه واحد

بلکہ اس کے برعکس اسلام علومِ جدیدہ سے اس قدر دور ہوگیا ہے کہ علومِ جدیدہ کی سربراہی دُنیا کی مُلحد قومیں کررہی ہیں۔ جس کے نتیجے میں علمِ جدید کے ساتھ ساتھ جاہلیتِ جدیدہ یعنی ''الحاد'' پھیلتا جارہا ہے اور ذہنوں سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی ہے۔

آپ نے محسوس فرمایا کہ اگر قومِ مسلم نے صرف درسِ نظامیہ کی تعلیم پر اکتفا کرلیا تو عصرِ جدید کی اُبھرتی ہوئی نظریاتی قوتوں کا مقابلہ نہ کرسکے گی، جب کہ مقابلہ اس کے بغیر بھی ناممکن ہے۔ اس لیے علومِ قدیمہ اور علومِ جدیدہ کو شامل کرکے ایک نیا نصابِ تعلیم مرتب کیا جائے جو مرحلۂ اولی، وسطٰی، اُخریٰ اور تخصیص پر مشتمل ہو۔ جس میں ابتدا سے لے کر ریسرچ وتحقیق تک تعلیم دی جائے۔ اس طرح علماے ملتِ اسلامیہ دُنیا کے علومِ جدیدہ اور افکارِ جدیدہ سے استفادہ بھی کرسکیں اور انھیں مسلمان بھی بناسکیں۔ اسی لیے آپ نے دارالعلوم اشرفیہ کو الجامعۃ الاشرفیہ [عربی یونی ورسٹی] میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

چنانچہ آپ کے زیرِ اہتمام دارالعلوم اشرفیہ کی جانب سے یونی ورسٹی کی مجوزہ زمین پر ایک آل انڈیا دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی اور ۵/۶/۷/مئی ۱۹۷۲ء کو منعقد ہونے والے مشاورتی اجلاسوں میں ہندوستان کے مسلم اہلِ فکر اشرفیہ کے دامن میں سمٹ آئے اور مندرجہ ذیل مسائل زیرِ بحث لائے گئے:

[۱] مقتضاے وقت کے مطابق ایک جامع اور جدید نصابِ تعلیم کی تدوین۔

[۲] موجودہ معاشرے کی اخلاقی، تبلیغی، اصلاحی، اجتماعی اور علمی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر مدارسِ عربیہ کے طلبہ کی ذہنی، علمی اور عملی تربیت کے لیے ایک جامع نظام کی ترتیب۔

[۳] عربی مدارس کے درمیان تعلیمی معیار کی حد بندی۔

[۴] دینی مدارس کے نظامِ عمل میں تبدیلی کے لیے مدارس کے نمائندگان پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ کی تشکیل۔

[۵] تعلقات بین المدارس کے لیے اخلاقی اور ادارتی ضابطوں کی تشکیل۔

کُل ہند دینی تعلیمی کانفرنس کے موقع پر حضور مفتیِ اعظم ہند مدظلہ العالی نے اپنے نورانی ہاتھوں سے الجامعۃ الاشرفیہ کا سنگِ بنیاد رکھا اور حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ نے ۴/سال کے قلیل عرصے میں وسیع خطۂ زمین پر پھیلے ہوئے مجوزہ ''شہرِ علم'' کی دو عظیم عمارتیں درس گاہ اور دارالاقامہ کو مکمل فرمادیا۔ عوام اور صرف عوام کے تعاون سے تعمیر ہونے والی دینی درس گاہوں میں یہ پہلی درس گاہ ہے، جس کی تعمیر اس قدر مختصر مدت میں اتنی پُرشکوہ اور پُرعظمت ہے۔ دارالعلوم اشرفیہ، جامع مسجد راجہ مبارک شاہ، الجامعۃ الاشرفیہ، اشرفیہ مارکیٹ ان تمام عمارتوں کے مجموعے پر نظر ڈالی جائے تو یہ بھی حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کا عظیم کارنامہ ہے کہ تنہا آپ کی قیادت میں مبارک پور کے غریب مسلمانوں نے اتنی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرڈالیں۔ کیا ان پرشکوہ عمارتوں کے ہر زاویے سے حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کی سعیِ پیہم اور ان کا جہدِ مسلسل نمایاں نہیں ہے؟

سلام ہو اُس حافظِ ناموسِ ملت پر جس نے دین کے تحفظ کے لیے اس قدر پائے دار مستحکم قلعے تعمیر فرمائے، جو رہتی دُنیا تک اس کی عظمت کے گواہ رہیں گے۔

حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ نے [مدرسہ] اشرفیہ کو دارالعلوم اشرفیہ بنایا اور دارالعلوم اشرفیہ کو جامعہ اشرفیہ کے عظیم منصوبے میں تبدیل فرما کر اپنے محبوب ومسجودِ حقیقی سے جاملے۔ اب براعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ میں پھیلے ہوئے اُن کے کثیر طلبہ اور وابستگانِ دامن کی ذمے داری ہے کہ اُن کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنائیں۔ حضور حافظِ ملت کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا اس سے زیادہ بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ ذاتِ گرامی جس نے مقصد کی راہ میں اپنی ذات کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ وہ آج

بھی اشرفیہ میں آرام فرما ہے اور اُس کی روحِ اقدس ابنائے اشرفیہ سے تعمیر اور مسلسل تعمیر کا ایصالِ ثواب چاہتی ہے۔ آیے ہم عہد کریں کہ ہم اُن کی بارگاہ میں جب بھی حاضر ہوں گے تو ہمارے ہاتھوں میں خود ہمارے اس عمل کی دستاویز ہوگی، جو ہمارے ضمیر نے ہمیں اشرفیہ کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے کے سلسلے میں دی ہوگی۔ کیا ابنائے اشرفیہ کی نگاہوں سے یہ حقیقت اوجھل ہے کہ جب حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم اشرفیہ کو عربی یونی ورسٹی میں تبدیل کرنے کا فیصلہ فرمالیا تھا تو اُن کا اضطراب کس قدر بڑھ گیا تھا اور منزل کی جستجو نے آپ کو جس قدر سیماب صفت بنادیا تھا، جس کو دیکھ کر زبان پر آتا تھا۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ مہتابی

آپ نے قوم کے سامنے جب عربی یونی ورسٹی کا تخیل پیش فرمایا تو قوم نے آپ کی آواز پر لبیک کہا۔ لیکن جو قوم آج تک دارالعلوم اشرفیہ کا بارِگراں اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے تھی، وہ اپنا سب کچھ پیش کرکے بھی جامعہ اشرفیہ کے تخیل کو شرمندۂ تعبیر نہیں کرسکتی تھی، اس لیے حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ نے پوری دُنیائے سنیت کو آواز دی۔ وہ ایام ناقابلِ فراموش ہیں جب حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ یونی ورسٹی کی تعمیر کے سلسلے میں ملک کا دَورہ کررہے تھے۔ اُن کا جسمِ اقدس ضعیف تھا مگر اُن کی سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل نے اہلِ قافلہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ منزلِ عمل کے سب سے صحت مند قافلہ سالار ہیں۔ حضرت بیکل اُتساہی، حضرت علامہ مفتی عبدالمنان اعظمی صاحب قبلہ [علیہ الرحمہ] اور خادم کو کچھ دن اُن کے ساتھ رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ہم دن میں تھک کر چوُر ہوجاتے، مگر حضور حافظِ ملت دن بھر روزہ رکھ کر دَورہ فرماتے، اور شب میں تراویح اور تہجد میں دس پارے تلاوت فرماتے تھے۔ آپ اُس وقت ''ھم باللیل رھبان وبالنھار فرسان '' کی زندہ مثال بن گئے تھے۔

جب کبھی میں تاریخِ اسلام کے اُن فرزندوں کے واقعات پڑھتا تھا جنھوں نے اپنی

زندگی میں انتہائی دُشوار گذار راستے طے کیے اور منزلوں پر منزلیں طے کرتے رہے، مگر تھکن اُن کے قریب نہ پھٹکنے پاتی تھی، جبل الطارق کی کوہ پیمائی کے بعد وادیِ سندھ عبور کرنے کے بعد عراق کے صحراؤں سے گزر کر ایران میں داخلے کے بعد؛ قافلۂ حجاز نے اپنے سالارِ قافلہ سے ایک ایک لمحے کے آرام کی بھی مہلت نہیں مانگی تھی۔ وہ لوگ صحرائے عرب سے نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر قابض ہوگئے۔ وہ مسلسل معرکوں میں شامل ہوتے مگر بازوشل نہیں ہوتے۔ تو حیرت ہوتی تھی مگر حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی جاں گُسل مشقتوں کو دیکھ کر حیرت دور ہوگئی، اور یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ مقصد کی عظمت اور منزل کا وقار انسان کو بے پناہ توانائیوں سے نوازتا ہے۔

میں کہاں رُکتا ہوں عرش وفرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت آگے حدِ پرواز سے

میں نے بارہا دیکھا کہ جب اُن سے آرام کی درخواست کی گئی اور انہوں نے غلاموں کے احساسات کا خیال فرماتے ہوئے قبول فرمالیا تو اُن کا اضطراب بڑھ گیا اور گزرتے ہوئے لمحوں کو عمل کی گرفت میں لینے کے لیے بے قرار ہوگئے اور اُس وقت تک سکون نہ پایا، جب تک مصروفِ عمل نہ ہوگئے۔ اُن کو دین کے لیے تکلیف اُٹھانے ہی میں حقیقی راحت ملتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا: حضور تھوڑا سا آرام فرمالیں۔ ارشاد فرمایا -زمین کے اوپر کام، زمین کے نیچے آرام- میں خاموش ہوگیا، مگر حضور استاذ العلماء کی حیاتِ اقدس اس بات کی شاہدِ عدل ہے کہ انہوں نے زندگی میں کبھی آرام نہیں فرمایا حتیٰ کہ اُس روز بھی جس روز وہ اپنے مولائے حقیقی سے ملنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے لختِ جگر حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب کو درسِ حدیث دیا۔ گویا وہ وراثتِ علم اپنے شہزادے کی طرف منتقل کررہے تھے۔ اُن کا یہ عمل زبانِ حال سے پکار رہا تھا کہ مال جمع کرنے والے انتقال کے وقت اپنے بچوں کو مال دیا کرتے ہیں، مگر میں نے زندگی بھر قرآن وسنت کی خدمت کی ہے، اس لیے اپنے ولی عہد کو وہی بخش رہا ہوں۔

آپ کے جدِ امجد مرحوم نے آپ کا نام حضور سیّدنا عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر اسی لیے رکھا تھا کہ آپ علمِ حدیث کی خدمت اُسی طرح کریں گے جس طرح محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ چنانچہ آپ نے زندگی بھر خدمتِ حدیث کی، اور وصال کے بعد اپنے شہزادے کے ہاتھوں میں **اصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ** بخاری دے کر یہ واضح فرما گئے کہ ہماری حیات بھی اس لیے تھی، اور تمہاری زندگی بھی اسی مقصدِ عظیم کے لیے ہونی چاہیے۔

اشرفیہ کے سلسلے میں اُن کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دیکھ کر اُن کے خدام عرض کرتے: حضور! آپ زیادہ پریشان نہ ہوں خدائے وحدہٗ قدوس آپ کی پُرخلوص سعی کو رائیگاں نہ فرمائے گا اور الجامعۃ الاشرفیہ کا تخیل ایک حقیقت بن کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگا۔ تو ارشاد فرماتے:

’’تمہارا کیا خیال ہے ایسے انسان کے بارے میں جو اپنے اردگرد کاموں کا انبار دیکھ رہا ہے اور یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ سورج بس غروب ہونے ہی والا ہے، کیا وہ کاموں کی کثرت اور وقت کی قلت دیکھ کر مضطرب نہ ہوگا اور کیا اُس کا اضطراب بجا نہ کہلائے گا؟‘‘

ایسا نہیں کہ اُن کا یہ اضطراب دینی حالات کی پیداوار تھا، بلکہ زمانۂ طالب علمی میں جب آپ بعض گریلو مصروفیات کی وجہ سے تعلیم سے کچھ دنوں علاحدہ رہے حالاں کہ اس وقت بھی آپ خدمتِ دین کر رہے تھے، لیکن علم کے اُس مقام پر فائز نہ ہو سکے تھے جس کا آپ نے قصد فرمایا تھا۔ ایک روز آپ نے اپنی والدۂ محترمہ سے کہا، اماں! آپ تو کہا کرتی تھیں کہ میں بڑا ہو کر عالم بنوں گا مگر میں تو نہیں بنا۔

کیا یہ بات حضور غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعے سے ملتی جلتی نہیں ہے کہ جب انہوں نے ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد گھر کی ذمے داریاں سنبھال لیں تو انھیں ہر چیز زبانِ حال سے یہ کہتی ہوئی نظر آتی تھی: **ما لھٰذا خلقت ولا بھٰذا اُمرت.** چنانچہ اس اشارۂ غیبی کے بعد حضور غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بغداد کا قصد فرمایا

تھا۔ یہاں نائب غوث الاعظم حضور استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے اضطرابِ روحانی کا اپنی والدہ مخدومہ سے تذکرہ فرمایا اور قدرت نے ایسے حالات پیدا فرما دیے کہ آپ نے مزید حصولِ تعلیم کے لیے پہلے بعض دیگر اساتذہ اور پھر حضرت صدر الشریعہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ اقدس میں حاضری دی۔ ملت کا درد اور تعمیرِ قوم کا جذبہ قدرت نے آپ کی فطرت میں پوشیدہ فرما دیا تھا، جو عمر کے ہر حصے میں آپ کی ذاتِ اقدس سے نمایاں رہا۔ چوں کہ آپ کو ایک ایسی امت کی قیادت کرنی تھی جس کو قرآن عظیم نے خیرِ اُمّت کے لقب سے نوازا ہے۔ اس لیے آپ نے وہ تمام منازلِ عمل طے فرمائیں جو اس منصب کا بنیادی مطالبہ تھیں۔ آپ خیرِ اُمّت کو خیرِ اُمّت ہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے اور جب بھی کسی انسان کو مبتلائے غفلت دیکھتے تو بہت زیادہ کرب محسوس فرماتے اور ارشاد فرماتے: ’’اسے کیا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا، اور کیا کر رہا ہے۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ آپ زندگی میں رُخصتوں کے بجائے عزیمتوں پر عمل فرمایا کرتے تھے۔ شدید بیمار ہیں، نقاہت ہے، لیکن رمضان شریف کے روزے اور جملہ اَوراد و وظائف صحت مندوں کی طرح ادا کر رہے ہیں۔ خادموں نے عرض کی حضور ایسی حالت میں شریعت نے رُخصت دی ہے۔ جواب عطا ہوتا مگر جو ثواب رمضان میں ملتا ہے رمضان کے بعد کہاں۔ نماز سے اس قدر محبت فرماتے تھے کہ سفر وحضر میں ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے لیے سراپا اشتیاق وانتظار رہتے تھے۔ میں نے بار بار اُن کے ساتھ سفر کی سعادت حاصل کی ہے۔ نماز کا چھوڑنا تو درکنار کبھی سُنن ونوافل کو بھی چھوٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ٹرین میں سفر فرما رہے ہیں یا بس میں یا کسی اور سواری سے، نماز کا وقت آتے ہی **من جانب اللّٰہ** کچھ ایسی صورت پیدا ہوتی تھی کہ آپ نماز بخوبی ادا فرما لیتے تھے۔ اہلِ عقیدت اللہ کی بخشی ہوئی اس توفیق کو حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت کا نام دیں گے مگر میں عرض کروں گا کہ یہ تو اللہ کا وعدہ ہے: وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا. [العنکبوت: آیت ۶۹]

آنکھوں کے آپریشن کے بعد جب کہ ڈاکٹر حرکت کرنے کی اجازت بھی نہیں

دیتے، حضور حافظِ ملت جملہ نمازیں قیام ورکوع وسجود کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔ بلرام پور کے دورانِ قیام آپ پر کئی روز استغراق کی کیفیت طاری رہی مگر اوقاتِ نماز میں آپ عالَمِ صحو میں آجاتے اور نماز ادا فرماتے، پھر وہی کیفیت ہو جاتی۔

عبادتوں سے یہ شغف بھی اوائلِ عمر ہی سے تھا۔ حضرت سیّد العلماء مولانا سیّد آلِ مصطفیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے سنّی جمعیۃ العلماء کے آفس میں علماے کبار کی موجودگی میں ارشاد فرمایا: میں نے زمانۂ طالب علمی میں اجمیر مقدس کے قیام کے دوران حافظِ ملت سے زیادہ کسی کو عابد وزاہد نہیں پایا۔ میں تو اُس وقت اور اِس وقت کی حالت میں کوئی فرق نہیں پاتا۔ یہی احتیاطیں اور عزیمتوں پر عمل اُس وقت بھی تھا جو آج ہے۔ ہم لوگ ساتھی ہونے کی حیثیت سے بے تکلف ضرور تھے مگر بے تکلفی میں بھی حدِّ ادب قائم تھی۔ ہم لوگوں کا دل گواہی دیتا تھا کہ حافظِ ملت ولی ہیں۔

عبادت کی کیفیت وہ تھی جس کا میں نے اوپر تذکرہ کیا اور اخلاقِ کریمانہ کا یہ عالَم تھا کہ مجھے پوری زندگی کوئی ایسا انسان نہ ملا جسے حضور حافظِ ملت میں کوئی خلافِ شرع بات نظر آئی ہو۔ آپ سے اختلاف رکھنے والے بھی آپ کے اخلاق کے معترف تھے۔ اُن کا سلسلۂ تلمذ تین واسطوں سے حضرت شیخ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے:

	پیدائش	وصال
حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ	۱۳۱۴ھ	۱۳۹۶ھ
حضور صدر الشریعہ رحمۃ اللہ علیہ	۱۲۹۶ھ	۱۳۶۷ھ
حضرت علامہ ہدایت اللہ رامپوری رحمۃ اللہ علیہ	۱۲۵۳ھ	۱۳۱۹ھ
شہیدِ حُریت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ	۱۲۱۲ھ	۱۲۷۸ھ
حضور سیّدنا الشاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ	۱۱۵۹ھ	۱۲۳۹ھ

محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر محدثِ مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ تک ہر ایک ذات اپنے عصر میں تدریس وتبلیغ میں یکتاے روزگار تھی مگر حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کا

یہ عالَم ہے کہ وہ اپنے اساتذۂ گرامی کی عظیم استعدادوں کا خلاصہ اور حاصل تھے۔ پروردگارِ عالَم نے اُن کی ذات کو شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے علمِ حدیث اور اتباعِ سنت، علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے جذبۂ جہاد واعلاے کلمۃ الحق، علامہ ہدایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اندازِ تدریس وتفہیم اور صدر الشریعہ رحمۃ اللہ علیہ کے تفقہ وایثار کا مظہرِ اتم بنایا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ حضور صدر الشریعہ کے واسطے سے سیّدنا اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا عشقِ رسول ان کے رگ وپے میں سمایا ہوا تھا بلکہ وہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دردِ ملت کی مجسم تصویر تھے۔

ممکن ہے حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نہ کرنے والے لوگ میری اس تحریر کو حسنِ عقیدت پر محمول کریں، مگر وہ لوگ جنھوں نے حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کی صبح وشام دیکھی ہے اور اُن کے فیضِ صحبت سے مستفید رہے ہیں وہ یقیناً میری تائید کریں گے۔ حالاں کہ اگر میں اپنے آقاے نعمت کے حضور میں حسنِ عقیدت کی نذر پیش کروں تو یہ مجھے حق ہے کیوں کہ میرے شعورِ دین کو اُنھیں کی بارگاہ میں جِلا ملی اور میرے پاس جو کچھ ہے یہ اُنھیں کی نظرِ کرم کا صدقہ ہے۔

خداے پاک ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ حبیبہٖ سیّد المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

[مطبوعہ حافظِ ملت نمبر، ماہ نامہ ''اشرفیہ'' مبارک پور]

☆☆☆

باب ہفتم

نقطۂ نظر

اُصولوں کی فتح وسر بلندی کے لیے

الیکشن میں شکست کا خیر مقدم

پاکستان کے حالیہ الیکشن کے نتائج سامنے آئے تو مسلمانوں کے دین پسند طبقے بے پناہ غم زدہ ہوئے کہ جمعیۃ علمائے پاکستان سمیت بیش تر اسلامی جماعتیں ہار گئیں اور نظامِ مصطفیٰ کے مقابلے میں عوام نے سوشلزم کو ووٹ دیا۔ اس طرح عوام نے عملاً ثابت کر دیا کہ ہم [سیاست دانوں کے ذریعے پیش کردہ] اسلام کو مسجدوں اور درس گاہوں کی حد تک تو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں اربابِ اقتدار اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے اسلام کا نام بطورِ حربہ استعمال کرتے رہے، مگر اسلام کے سلسلے میں ان کے عدمِ اخلاص نے انھیں ان تمام اقدامات سے باز رکھا جن کی وجہ سے اسلام ایک صالح نظامِ حکومت کی حیثیت سے متعارف ہو سکتا اور عوام میں اپنی جڑیں مضبوط کر سکتا۔

گذشتہ دنوں میں اسلام کا نام لے کر اسلام کو سب سے زیادہ رُسوا کیا گیا، یہاں تک کہ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب تک تو دینی حلقوں کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جاتا رہا ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد اسلام عملاً نافذ نہ ہو سکا، اس لیے اس نظام کی برکات سے دُنیا مستفید نہ ہو سکی اور اس کا حقیقی جمال دُنیا پر آشکارا نہ ہو سکا، مگر اب پاکستان میں اسلام کو بھی آزما لیا گیا ہے۔ معاذ اللہ! اسلام عصرِ حاضر میں کسی نظامِ حکومت کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ پاکستان کے اربابِ اقتدار نے مارشل لا کے بیش تر اقدامات کے لیے اسلامی جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔ وہ کرتے وہی تھے جو اُن کا مزاجِ اقتدار پسندی مطالبہ کرتا تھا، مگر اس کو اسلام کا نام دے کر عوام کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ اگر پاکستان کے اربابِ اقتدار اسلام کو صرف اپنی جانب سے پیش کرتے تو عوام یہ سمجھتے کہ یہ حقیقی اسلام نہیں ہے مگر بدقسمتی سے علمائے کرام کا ایک گروہ ضیا صاحب

کے ان اقدامات کی بھرپور تائید کرتا رہا جس میں عوام یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھے کہ اسلام یقیناً یہی ہے ورنہ علما ساتھ نہ دیتے، اور اگر اسلام یہی ہے تو یہ نظامِ عصرِ حاضر کی قیادت نہیں کرسکتا۔

مارشل لا کے زیرِ سایہ عوام کی خاموشی کو رضامندی کا نام دے کر اپنے اقتدار کو طول دیا جاتا رہا، مگر اس خاموش سمندر کی تہ میں پوشیدہ اضطراب کے طوفانوں کا صحیح اندازہ نہیں کیا گیا، اور الیکشن کی تاریخ مقرر کردی گئی، الیکشن ہوا اور جب سیاست کا غُبار آلود مطلع صاف ہوا تو ضیا صاحب کے اسلامائزیشن کا کوسوں پتا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ان کی سب سے چہیتی جماعت؛ جماعتِ اسلامی بھی چاروں صوبوں میں چاروں شانے چت ہوگئی۔

اگر جنرل ضیاء الحق صاحب نے ۹۰ر دن کے وعدے کے مطابق الیکشن کرادیا ہوتا تو نتیجہ آج سے بالکل مختلف ہوتا۔ ان کے ۱۱ر سالہ اقتدار نے اسلامائزیشن کے عمل کو پچاس سال پیچھے دھکیل دیا ہے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون.

ایک طرف تو عالَم یہ تھا کہ پاکستان کی بیش تر مذہبی قیادتیں اربابِ اقتدار کے غیر دانش مندانہ مذہبی اقدامات پر خاموش تھیں اور دوسری طرف کمیونسٹ اور دُنیا بھر کی مسلم دُشمن قوتیں پاکستان کے نام نہاد اسلام کو بدنام کرنے کے لیے اپنے تمام نشریاتی ذرائع استعمال کرتی رہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے کوڑوں کی سزاؤں پر فلمیں تیار کیں اور پوری دُنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اسلام صرف ان ہی کوڑوں کا نام ہے۔

اسلامائزیشن کے اس عمل کے خلاف صنفِ نسواں کو وَرغلانے کے لیے پردہ، دِیت، شہادت وغیرہ جیسے فقہی مسائل کو ہوا دی گئی اور عورتوں کے ذہن میں یہ بات اُتارنے کی کوشش کی گئی کہ اسلام کے دامن میں انہیں انصاف نہ مل سکے گا، اور چوں کہ ان کے ذہن اسلامی نہ بن سکے تھے اس لیے بہ آسانی ان کا ذہنی اغوا عمل میں لایا گیا۔

سابقہ حکومت کے زمانے میں اسلام کے نام پر سب سے پہلے کوڑوں کو متعارف کرایا گیا، اور وہاں بھی کوڑوں کی سزائیں دی گئیں؛ جہاں ان کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ مثلاً

حدود جہاں مقررہ سزاؤں سے گریز ناممکن ہے، وہاں اسلام کی مقرر کردہ سزا ہی دی جانی چاہیے تھی، مگر تعزیرات، جہاں قاضیِ شرع کو خود سزاؤں کے انتخاب کا حق دیا گیا ہے، وہاں صرف کوڑوں ہی کو استعمال کرنے کا کیا جواز تھا؟

یہ عجوبہ بھی پاکستان ہی کی سرزمین پر دیکھا گیا کہ ملک کی عدلیہ کو تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا، اور انصاف فراہم کرنے کے لیے تین متضاد طریقے اختیار کیے گئے، یعنی وہاں شرعی عدالت، مارشل لا کورٹ اور سول کورٹ کو ایک ساتھ متعارف کرایا گیا۔ بعض مقدمات کے فیصلے شرعی عدالت کے ذریعے اور بعض کے فیصلے مارشل لا اور سول کورٹ کے ذریعے کیے جانے لگے۔ پاکستانی عوام کے سروں پر تین الگ الگ عدالتوں کی لٹکتی ہوئی تلواروں نے ان کے اندر سیکڑوں شکوک وشبہات کو جنم دیا۔ وہ علماے کرام جو اسلام کو نافذ کرنے کے جذبے کے ساتھ حکومت میں شامل ہوئے تھے آج عوام کا ضمیر اُن سے یہ پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ اسلامی عدالتوں کے ساتھ بقیہ دو عدالتوں کا کیا جواز تھا؟

کیا اسلام کا نظامِ عدالت اس قدر ناقص ہے کہ وہ مارشل لا اور سول لا کی بیساکھیوں کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا؟ اور ستم بالاے ستم یہ ہے کہ عملاً شرعی عدالتوں کے فیصلوں کی تنسیخ کا حق مارشل لا عدالتوں کو دے دیا گیا، اس طرح مارشل لا کی برتری شریعت پر تسلیم کرلی گئی۔ ۱۱ر سال تک اسی طرح کے فیصلے ہوتے رہے اور شریکِ اقتدار علماے کرام خاموش رہے۔ علماے کرام کی اس مجرمانہ خاموشی نے اسلام کے نظامِ عدالت کے تقدّس کو پامال کیا، اور عوام کا اعتماد اسلامی نظامِ عدل سے اُٹھ گیا۔

علماے کرام نے سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق نہ کہہ کر لاشعوری طور پر دین سے انحراف کی راہیں ہموار کیں۔ اِس کے نتیجے میں اُس سوشلزم کا دوبارہ پُرجوش استقبال کیا گیا جس کو تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے زمانے میں بیک بینی ودوگوش ملک سے باہر کردیا گیا تھا۔

اسلام صرف حدود وتعزیرات ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ اسلام ایک پُرامن فلاحی مملکت کا تصور بھی پیش کرتا ہے، جس میں بچوں، بوڑھوں، کم زوروں، غریبوں اور بے روزگاروں کی

معاشی کفالت اسلامی حکومت کی ذمے داری ہے، مگر پاکستان میں اس طرح کے فلاحی اقدامات نہیں کیے گئے، جس کی وجہ سے وسائلِ حیات سے محروم طبقے کا احساسِ محرومی فزوں تر ہوتا گیا اور مذہب کو صرف آخرت کا ضامن سمجھ کر دُنیا غیر اسلامی عناصر کے حوالے کر دی گئی۔ لے دے کے پاکستان میں زکوٰۃ کا نظام نافذ کرنے کی کوشش کی گئی مگر زکوٰۃ کی عدم منصوبہ بندی اور ناقص تقسیم نے اس کے مثبت اثرات کو سلب کر لیا۔

اس کے برعکس سرمایہ دار طبقے نے زکوٰۃ کو ٹیکس کے اوپر ایک اضافی بوجھ تصور کر کے مختلف حیلوں اور بہانوں سے نظامِ زکوٰۃ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی، حتیٰ کہ بعض لوگوں نے خود کو اُن لوگوں میں شامل کر لیا، جنہیں زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ ملک کے غریب عوام کے مسائل حل کرنے کے بجائے مارشل لا میں سرمایہ دار عناصر کو ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی گئیں، انہیں پلاٹ الاٹ کیے گئے، ملک اور بیرون ملک سرمایہ کاری کے مواقع فراہم کیے گئے۔ جس نے مفلوک الحال عوام کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ملک کے وسائل صرف مارشل لا کی چھتری کے نیچے پناہ لینے والوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اگر کوشش کی جاتی تو اس ۱۱رسالہ دورِ اقتدار میں یونی ورسٹیوں اور کالجوں سے لاکھوں افراد کی ایک ایسی جماعت تیار کی جا سکتی تھی جو خالص اسلامی ذہن و فکر کی ہوتی، مگر اس کے لیے ملک کے مسلم دانش وَروں کو ایک ایسا نصاب تیار کرنا پڑتا جو اسلام کو ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے ذہنوں میں منتقل کرنے کا کفیل ہوتا، لیکن ایسا نہ کیا جا سکا بلکہ یونی ورسٹیوں میں اسلامی کاز کے لیے کام کرنے والے طلبہ پر پابندیاں عائد کی گئیں، اور نصابِ تعلیم میں ایسے مضامین شامل کیے گئے جو اسلام کو صرف ان کی پرائیوٹ لائف کا رہ نما قرار دے سکیں۔

چنانچہ وہ نسل جو اسلامی نظام کے لیے ہراول دستے کا کام کر سکتی تھی اُس نسل نے قومیت، علاقائیت، لسانیت اور برادری ازم کے تباہ کن نعروں سے متاثر ہو کر دین کا ساتھ چھوڑ دیا۔

۱۱رسال تک تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد رہی۔ ان میں وہ جماعتیں بھی تھیں جو صرف نظامِ مصطفیٰ کے لیے کام کرنا چاہتی تھیں۔ اس پابندی کے نتیجے میں عوام کا رابطہ

جماعت سے منقطع ہو گیا اور ۸رسال کی عمر کے بچے ووٹر بننے کی عمر تک پہنچتے پہنچتے دین کے تقاضوں سے نا آشنا اور اساسی داعیات سے عاری ہو چکے تھے۔ وہ مقاصد تو در کنار اُن نعروں سے بھی نا آشنا تھے جو تحریک نظامِ مصطفیٰ کے شہیدوں نے قوم کو دیے تھے، اور جنھوں نے بوقتِ شہادت اپنی لرزتی ہوئی انگلیوں کو خونِ جگر میں ڈبو کر اپنے مقتل کی زمین پر لکھا تھا:

''نظامِ مصطفیٰ زندہ باد''

اس طویل دورِ اقتدار میں آزادیِ فکر کے نام پر اُن تمام غیر اسلامی تنظیموں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا گیا جن کے نظریات براہِ راست اسلام سے متصادم تھے۔ چنانچہ زبان اور علاقوں کے نام پر صوبوں کا مطالبہ، ورنہ ملک توڑ دینے کی دھمکی سرزمینِ مملکت خداداد کا روز مرّہ بن چکی تھی۔ اس درمیان میں ایک لسانی گروہ نے ایک غیر منطقی اور غیر فطری قومیت کو جنم دیا۔ اربابِ اقتدار نے اس نومولود کو دودھ پلایا اور پروان چڑھایا، اب اسی جماعت نے وقتی طور پر ایک مخصوص علاقے میں خاصا اثر ورسوخ قائم کر لیا ہے۔ مگر عواقب ونتائج سے بے خبر جوشیلے نوجوان اس حقیقت سے نا آشنا ہیں کہ اس لسانی عصبیت کا ردِّ عمل انتہائی خطرناک نتائج کا حامل ہوگا۔ پاکستان اب خدانخواستہ کسی نئے بنگلہ دیش کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کریں تو اس پورے دورِ اقتدار میں ان تمام غیر اسلامی، غیر آئینی اور غیر فطری اقدامات کے خلاف اگر کوئی جماعت برسرِ پیکار رہی تو وہ جمعیۃ علماے پاکستان تھی۔ اس نے مارشل لا اور اس سے قبل کے کسی دور میں بھی غیر اسلامی اور غیر جمہوری اقدار کی حوصلہ افزائی نہیں کی، نقصانات اُٹھائے، شکستوں کے کرب جھیلے مگر اُن عناصر اور تحریکوں کے ساتھ صلح نہ کی جو اسلام کے حقیقی مقاصد کو سبوتاژ کرنے والے تھے۔

جمعیت کے فلک وقار قائد نے پابندیوں کے باوجود حکومت کے ہر اُس اقدام کی مخالفت کی جس سے ملک وقوم اور بالخصوص تحریک نظامِ مصطفیٰ کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ سندھ کے ایک حصے میں لسانی عصبیت کے سیلاب نے بڑے بڑے اسلام کے ٹھیکے داروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ مگر قائدِ اہلِ سنت علامہ شاہ احمد نورانی نے اِس غیر اسلامی فکر کی بھرپور

مخالفت کی، یہاں تک کہ ان پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا، مگر ان کے اعلانِ حق کو دبایا نہ جا سکا۔ وہ الیکشن میں شکست کھا گئے مگر پاکستان کی لوحِ سیاست پر یہ عبارت ثبت کر گئے کہ ''اسلام علاقائی اور لسانی عصبیتوں کے خلاف جہادِ مسلسل کا نام ہے۔'' ......انہوں نے شکست کا زخم کھا کر بھی اُصولوں کو سر بلند کیا، اس لیے ہم ان کی اس شکست کو سلام پیش کرتے ہیں اور اُصولوں کی فتح کے لیے ان کی شکست کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

اگر آپ اسلام کی ۱۴۰۰ سوسالہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ خلافتِ راشدہ کے بعد حق ہمیشہ مظلوم رہا اور کرسیِ اقتدار پر ظلم قابض رہا۔ چنانچہ ہر دور میں اسلام کے حقیقی وارث تاج و تخت سے محروم اور غیر اسلامی نظریات کے حامل دُنیا کے اقتدار کی تمام نعمتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ امام اعظم، امام احمد بن حنبل اور مجدد الف ثانی رحمہم اللہ قید و بند کی مشقتوں سے ہم کنار رہے اور حکومت پر دُنیا داروں کا قبضہ رہا، مگر دُنیوی اقتدار سے سرفراز ہونے والے سرنگوں ہو گئے اور اعلاء کلمۃ الحق کرنے والے آج بھی ایک ارب مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔

جب تک کسی ملک کی اکثریت اسلام کو ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو اُس وقت تک اہلِ حق کا حزبِ اقتدار میں رہ کر اربابِ اقتدار کے ظلم و جبر کی نشان دہی کرنا ہی ان کی سب سے بڑی ذمے داری ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس عظیم فریضے کی انجام دہی کے لیے جمعیت کے پارلیمانی قائد مجاہد ملت علامہ عبد الستار خان نیازی اپنے پُر خلوص اور جاں نثار رفقا کے ساتھ پارلیمنٹ میں پہنچ گئے ہیں۔ کبھی کبھی ایک قد آور آواز بے شمار ہنگاموں پر بھاری ہوتی ہے۔ علامہ نیازی کا ایوان میں موجود ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ ان شاء اللہ وہاں غیر اسلامی فیصلے نہ ہو سکیں گے اور اگر اربابِ اقتدار نے اکثریت کے بل بوتے پر غیر اسلامی فیصلے کر لیے تو مجاہد ملت کا اختلافی نوٹ آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہوگا۔

☆☆☆

لیبیا کے خلاف امریکہ کی ننگی جارحیت

عالَمِ اسلام کے لیے یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ امریکہ نے چند سال قبل لیبیا کے رہ نما کرنل قذافی پر قاتلانہ حملے کی ناکام کوشش کی اور ایک بے گناہ بچی کی جان لینے کے بعد اب دوبارہ اسی طرح کے اقدام کی کوشش کر رہا ہے، امریکہ نے لیبیا پر الزام لگایا ہے کہ اس نے طرابلس کے قریب کیمیاوی اسلحوں کے لیے کارخانہ قائم کیا ہے جس سے امنِ عالم خطرے میں پڑ گیا ہے۔

امنِ عالم کا یہ نام نہاد ٹھیکے دار نصف صدی سے امنِ عالم کی تباہی اور بربادی کا ذمے دار ہے۔ دُنیا کی کوئی جنگ ایسی نہیں جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ امریکہ کا ہاتھ نہ ہو، اسلحوں کی صورت میں موت کا یہ سوداگر لیبیا کے کارخانے کو بہانہ بنا کر لیبیا پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ حالاں کہ خود امریکہ کے پاس کیمیاوی اسلحوں کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ اگر کیمیاوی اسلحوں کا کارخانہ قائم کرنا جُرم ہے تو امریکہ سب سے بڑا مجرم ہے۔ دُنیا کو یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ امریکہ سب سے پہلے اپنا کارخانہ تباہ کرے۔ ابتدائی اقدام کے طور پر امریکہ نے لیبیا کے دو جنگی طیارے مار گرائے اور امریکہ کا جنگی بحری بیڑہ طرابلس کے ساحل سے قریب ہو رہا ہے، اگر عالَمِ اسلام اور دُنیا کی امن پسند طاقتوں نے امریکہ کے اس اقدام کا سختی سے نوٹس نہیں لیا تو امریکہ لیبیا پر براہِ راست حملہ کرنے سے دریغ نہیں کرے گا، جس کے نتیجے میں امریکی مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے والا ملک لیبیا شدید نقصانات سے دوچار ہوگا۔

امریکہ صرف اُن ملکوں کے خلاف واویلا کرتا ہے جو اُس سے اصولی اور نظریاتی اختلاف رکھتے ہیں، ورنہ امریکہ کی ناجائز اولاد اسرائیل اور رُسوائے زمانہ نسل پرست ملک ساؤتھ افریقہ بھی کیمیاوی ہتھیار تیار کر رہے ہیں۔ امریکہ ان کے کارخانے تباہ کرنے کی دھمکی کیوں نہیں دیتا؟ لیبیا نے بار بار تردید کی ہے کہ وہ کیمیائی اسلحہ نہیں تیار کر رہا ہے اور بعض امن پسند حکومتوں نے آزادانہ تحقیقات کا مطالبہ بھی کیا، مگر امریکہ؛ اسرائیل کی خواہشات کی تکمیل کے لیے لیبیا کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ امریکہ کے اتحادی مسلم ممالک، امریکہ سے اپنے تعلقات پر نظرِ ثانی کریں اور دُنیا کی تمام مسلم حکومتیں متحد ہو کر امریکہ کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیں، ورنہ امریکہ کی مسلم دشمنی فرداً فرداً تمام ممالکِ اسلامیہ کے لیے تباہی کا سامان فراہم کرے گی۔ ☆☆☆

قائدِ اہلِ سنت علامہ شاہ احمد نورانی پر قاتلانہ حملہ

گذشتہ دنوں کراچی کے ایک جلسۂ عام میں قائدِ اہلِ سنت قائدِ تحریکِ نظامِ مصطفیٰ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی اور دیگر قائدینِ اہلِ سنت پر ایک مبیّنہ لسانی گروہ کی ایما پر قاتلانہ حملہ کیا گیا......شب ۱۲ / بجے جب مجاہدِ ملت علامہ عبدالستار خان نیازی ایک جلسۂ عام سے خطاب کے لیے کھڑے ہوئے تو شرپسندوں اور اسلام دُشمنوں کے ایک منظّم گروہ نے اس جلسۂ عام پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جس میں جمعیۃ العلماء پاکستان کراچی شرقی کے نائب صدر ثناء اللہ شہید ہوگئے اور متعدد کارکن شدید زخمی ہوگئے۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جلسۂ عام میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ قائدِ اہلِ سنت گولیوں کی بوچھاڑ میں خطاب کے لیے کھڑے ہوئے اور انہوں نے قاتلوں اور شرپسندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نظامِ مصطفیٰ کا راستہ گولیوں سے نہیں روکا جاسکتا۔ اختتامِ جلسہ پر انہیں پولیس کے حصار میں ان کی قیام گاہ تک پہنچایا گیا۔

قائدِ اہلِ سنت کے اجلاس پر حملہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے مذموم اور بدترین واقعہ ہے۔ اگر جلسوں پر حملوں کی یہ روایت چل پڑی تو مستقبل میں کوئی سیاسی اور مذہبی اجلاس منعقد نہ ہو سکے گا اور اس طرح سے اس مملکتِ خداداد کا سیاسی اور مذہبی باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔

قائدِ اہلِ سنت کے اجلاس پر قاتلانہ حملے کی اطلاع نے دُنیائے اسلام کے کروڑوں مسلمانوں کو غم زدہ کر دیا ہے، اس لیے کہ علامہ شاہ احمد نورانی عصرِ حاضر کے سب سے محبوب قائد اور داعیِ اسلام ہیں۔ پوری دُنیا میں اُن کی دینی خدمات کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ دلوں کے فاتح اور قلوب کی مملکت پر حکمرانی کرنے والے رہ نما ہیں۔ وہ آج کے نازک ترین دور میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، اور اس سلسلے میں انہیں بارہا قید و بند کی مشقتوں سے دوچار ہونا پڑا، اور ان کے رفقا کو صلیب

و دار کی منزلوں سے گذرنا پڑا۔ وہ ان نامساعد حالات میں کلمۂ حق کے امین اور باطل اقتدار کے سامنے بے باک مجاہد کی حیثیت سے احقاقِ حق کرنے والے رہ نما ہیں......ان پر قاتلانہ حملے کی اطلاع ملتے ہی برطانیہ کے دینی اور مذہبی حلقوں میں اضطراب اور بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ورلڈ اسلامک مشن، جمعیۃ العلماء پاکستان اور دیگر مسلم تنظیموں کی طرف سے احتجاجی اجلاس منعقد ہوئے جن میں علمائے اہلِ سنت اور قائدین نے حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ شرپسندوں کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دے۔

ایک احتجاجی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جناب سیّد غلام السیدین سکریٹری جمعیۃ العلماء پاکستان؛ برطانیہ نے کہا کہ علامہ نورانی پر حملہ پوری ملتِ اسلامیہ پر حملے کے مترادف ہے۔ افسوس کہ نظامِ مصطفیٰ کے قیام کو ناکام بنانے کے لیے اسلام کے مخالفین اپنی بدترین بزدلانہ حرکتوں پر اُتر آئے۔ ہم دُشمنانِ اسلام کو خبردار کرتے ہیں کہ ہم ہمیشہ آندھی میں چراغ جلانے کے قائل ہیں۔ اس طرح کی مذموم کوششیں پاکستان کو اسلامی مملکت بننے سے نہیں روک سکتیں۔

اوور سیز برانچ کے کنوینر قائدِ اہلِ سنت کے برادر بزرگ جناب مولانا جیلانی صدیقی نے اس واقعے کی مذمت کرتے ہوئے ان اسلام دُشمن قوتوں کو متنبہ کیا کہ اگر پاکستان میں نظامِ مصطفیٰ کا راستہ روکنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتائج انتہائی خطرناک ہوں گے۔ ہماری تحریک امن و صلح کی تحریک ہے، لیکن اگر نظامِ مصطفیٰ کے لیے قربانیاں دینے کی ضرورت پیش آئی تو ہم اسلام کی نظریاتی سرحدوں کی فصیل تعمیر کر کے پاکستان، اسلام اور وقارِ مصطفیٰ کا تحفظ کریں گے۔

ورلڈ اسلامک مشن نے دُنیا بھر میں مشن کی شاخوں کو اس دردناک واقعے پر احتجاج کے لیے ہدایات جاری کیں۔

☆☆☆

باب ہشتم

اصلاح احوال

اُمید و بیم

آج کل برطانیہ کے اُن تمام شہروں میں جہاں مسلمان بستے ہیں ایک کتابچہ کسی عیسائی مشنری کی جانب سے تقسیم کیا جارہا ہے، جس کا عنوان ہے ''میں عیسائی کیوں ہوگیا''...... یہ کتابچہ جان محمد نامی ایک مولوی کا لکھا ہوا ہے جس نے ۱۹۳۶ء میں بمبئی کے کسی چرچ میں براہِ ارتداد مسیحیت کو قبول کرلیا تھا۔ چوں کہ اسلام کا سطحی مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ کتابچہ خاصہ گم راہ کُن ثابت ہوسکتا ہے، اس لیے جواباً چند سطور ہدیۂ قارئین ہیں۔

مولوی جان محمد نے اسلام ترک کرنے کے جو اسباب بیان کیے ہیں اُن میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کو اسلام میں نجات نہ مل سکی، اس لیے کہ قرآنِ عظیم کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو صرف یہ معلوم ہوا کہ اسلام جزا و سزا کا مذہب ہے، اور خدائے قہار میدانِ قیامت میں ذرّے ذرّے کا حساب لے گا، اور لمحہ لمحہ کے گناہوں پر صدیوں کی سزائیں ملیں گی اور چوں کہ نبی کے علاوہ کوئی انسان معصوم نہیں اس لیے سزا سب کو ملے گی، اور کوئی بھی بغیر جہنم کا منھ دیکھے جنت میں نہ جاسکے گا، اور اس کے برعکس مسیحیت میں انسان خواہ کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو صلیبِ مسیح کے سامنے اعترافِ گناہ کرلے تو بالکل پاک و صاف ہوجاتا ہے۔ اتنا پاک و صاف کہ اس کے نجات یافتہ ہونے کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔

مندرجہ بالا مفروضے کو بنیاد بنانے کے بعد انھوں نے قرآنِ عظیم کی وہ ساری آیاتِ مبارکہ نقل کردی ہیں جن میں ہر مثقال ذرّہ کی جزا و سزا کا حکم صادر فرمایا گیا ہے۔ موصوف نے چوں کہ مسیحیت بر بنائے تحقیق نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت قبول کیا تھا، اس لیے ان کو وہی آیاتِ مبارکہ نظر آئیں جن میں جزا و سزا کا قانون اور عفو و مغفرت کا نظام بھی واضح فرمادیا گیا ہے۔ اب دوسرے لفظوں میں ان کو خدائے پاک کے اسمائے صفاتی میں قہار و جبار، عادل و منتقم وغیرہ تو نظر آئے لیکن ستار و غفار، غفور و رحیم، ودود و کریم، رؤف و

رحمٰن، جل جلالہٗ جیسی صفاتِ مقدسہ نظر نہ آسکیں۔

اوّل تو موصوف کا یہ تصور ہی غلط ہے کہ ہر انسان پیدائشی گناہ گار ہے۔ یہ عقیدہ انہوں نے خود عیسائیت سے لیا ہے، ورنہ غیر معصوم ہونے کا مطلب بالکل یہ نہیں ہے کہ آدمی گناہ ضرور کرے گا۔ معصوم اور عاصی کے درمیان ایک اور درجہ ہے جسے ''محفوظ'' کہا جاتا ہے۔ غیر نبی معصوم تو نہیں ہوتا، مگر اللہ اپنے فضل سے بے شمار ایسے افراد کو نجات دیتا ہے جو گناہوں سے ''محفوظ'' ہوتے ہیں، یا جن کے گناہِ صغائر ان کی نیکیوں سے دُھل جاتے ہیں۔ حضور کے اُمّتیوں میں ایسے کثیر صحابہ، اولیا، غوث، اقطاب و اوتاد گزرے ہیں اور قیامت تک گزرتے رہیں گے جو گناہوں سے محفوظ ہیں۔ دراصل انہوں نے پہلے عیسائیت کے مطالعہ سے اپنا منطقی شعور ترتیب دے کر خود کو پیدائشی گناہ گار مان لیا اور اس کے بعد نجات اسلام کے دامن میں تلاش کرنے لگے، حالاں کہ اسلام کے نزدیک انسان پیدائشی گناہ گار نہیں بلکہ مسلم و مومن، مطیع و منقاد اور ماں کے شکم سے گناہوں سے پاک و صاف پیدا ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلٰى الفِطْرَةِ الْاِسْلَامِ وَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ وَيُمَجِّسَانِهٖ وَيُنَصِّرَانِهٖ.

''ہر پیدا ہونے والا اسلامی فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے ماں باپ اُس کو یہودی یا مجوسی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔''

اس لیے اسلام کے نزدیک وہ تمام لوگ جنتی ہیں جو پیدائش کے بعد بغیر کسی گناہ کے انتقال کر گئے۔ اس کے برعکس عیسائیت یہ ذہن بناتی ہے کہ چوں کہ حضرت آدم علیہ السّلام سے جو ابوالانسان ہیں، گناہ سرزد ہو گیا تھا اس لیے انسان فطرۃً گناہ گار ہے، اور یہ فطرتِ گناہ وراثۃً اولادِ آدم کی طرف منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔

اسلام اوّل تو تمام انبیا علیہم السّلام اور ابوالانبیا حضرت آدم علیہ السّلام کو۔معصوم۔ مانتا ہے اور ان کی وہ زلتِ پیغمبرانہ جو جنت میں سرزد ہوئی تھی وہ تو تخلیقِ کائناتِ انسانی کے

لیے قدرت کا ایک بہانہ تھا، ورنہ ہمیشہ گناہوں کے نتیجے میں بربادیاں ہوتی ہیں۔ یہاں آدم علیہ السّلام کی اس زلت کے نتیجے میں آبادیاں وجود پذیر ہوتی چلی جارہی ہیں اور یہ عالَمِ رنگ و بو سنورتا چلا جارہا ہے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
انھیں زلفوں کے سب اسیر ہوئے

کیا فطرتِ جُرم کی آغوش میں کوئی مسیحا اور کوئی مطہر و نجات دہندہ اور معصوم پروان چڑھ سکتا ہے؟ حالاں کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت مسیح و حضرت محمد علیہم السّلام، آدم علیہ السّلام کے بیٹے ہیں۔ آدم علیہ السّلام معصوم تھے۔ ہر فرزندِ آدم بے گناہ پیدا ہوتا ہے۔ گناہ تو ارتکابِ عملِ بد کا نام ہے۔

دُنیا کے مفکروں کی طرح اسلام نے انسانی فطرت کو نور و نار کے درمیان کی چیز نہیں بلکہ سراسر نوری قرار دیا ہے۔ البتہ اپنے اعمالِ بد سے انسان ناری بن جاتا ہے۔ دراصل عیسائیوں نے انجیل پاک میں تحریف کر کے دُنیا کے سامنے موروثی گناہ گار ہونے کا تصور پیش کیا تو آدمی مایوس ہو گیا اور اس نے سوچا کہ اگر ہم پیدائشی گناہ گار ہیں اور نجات ممکن نہیں تو پھر لذتِ گناہ سے دامن کیوں کھینچا جائے۔ اگر لذتِ فردا میسر نہیں تو عیشِ امروز سے دست برداری نادانی کے مترادف ہے۔ نتیجتاً پورا عیسائی معاشرہ گناہوں میں ڈوب گیا۔ زندگی کی شاہ راہ پر اپنے اس من گھڑت عقیدے کی ناکامی دیکھ کر اربابِ کلیسا گھبرا اُٹھے، اور انہوں نے فوراً ایک دوسرا عقیدہ گھڑ لیا کہ اگرچہ انسان پیدائشی گناہ گار ہے، لیکن اگر صلیبِ مسیح کے سامنے اعترافِ گناہ کر لے تو ہر گناہ سے پاک ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ لوگ اس طرح سے مایوسی کے دَل دَل سے نکلیں گے اور ارتکابِ گناہ چھوڑ دیں گے۔ مگر یہاں بھی انجام اُلٹا ہو گیا، اس لیے کہ پہلے انسان مایوس ہو کر گناہ کر رہا تھا اور اب اپنے کو نجات یافتہ تصور کر کے گناہوں میں ڈوب گیا کہ جب بہرصورت حضرت عیسیٰ کی صلیب ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے تو متاعِ زہد و متاعِ گناہ دونوں کیوں نہ سمیٹی جائیں، یعنی پورا

ہفتہ گناہ کیا جائے اور صرف اتوار کو چند لمحوں کے لیے صلیبِ مسیح کے سامنے اعترافِ گناہ کر کے مغفرت حاصل کر لی جائے۔ چنانچہ آج پورا یورپ یہی کر رہا ہے، اور آج پورا عیسائی معاشرہ جنسی جنون کی بھینٹ چڑھ چکا ہے اور مریم پاک کا وظیفہ کرنے والے خود اپنا دامن تار تار کر چکے ہیں، اور پورے عیسائی معاشرے میں عصمت ایک جنسِ نایاب ہے۔

موجودہ عیسائیت اپنے عقیدۂ تثلیث سے لے کر عقیدۂ صلیب و کفارہ تک سرتاسر انسان کی ذہنی عیاریوں کی ایک ایسی ناکام تاریخ ہے جس میں باپ کے جُرم کی پاداش میں بیٹے کو، اُمّتی کے جُرم کی پاداش میں نبی کو، بلکہ خدا کے بیٹے [معاذ اللہ] اور خود خدا کو سرِ دار کھینچ دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اسلام نے انسان کو-امید و بیم- کے درمیان رکھا ہے، تا کہ انسان کا قدم صراطِ مستقیم سے بھٹکنے نہ پائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الایمان بین الخوف وَالرجاء .

''ایمان امید و بیم کے درمیان ہے۔''

یعنی نہ اس قدر نجات یافتہ پیدا کر دیا گیا کہ انسان رحمت کے سہارے مے کدہ بر دوش نظر آئے اور نہ ہی اس قدر مایوس کر دیا گیا ہے کہ ارتکابِ کفر کرنے لگے۔ خدائے قدیر نے ارشاد فرمایا:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰه.

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔''

اسلام نے ایک طرف جزا و سزا کا قانون پیش کیا تو دوسری طرف توبہ و مغفرت شفاعت وغیرہ کا نظام مرتب فرمایا، تا کہ انسان خدا کو مالکِ یوم الدّین سمجھ کر گناہوں سے باز رہے اور غفور الرّحیم جان کر سابقہ گناہوں سے توبہ کر لے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع المذنبین مان کر آخرت میں کامیابی کا یقین لے کر اُٹھے۔

جزا و سزا: کسی بھی نظامِ عدل کے قیام کے لیے جزا و سزا کا قانون ضروری ہے۔ اگر انسان کو نیکیوں پر جزا اور برائیوں پر سزا کا یقین نہ ہوگا تو انسان نیکیوں کا طلب گار اور برائیوں

سے نفرت کرنے والا کیوں کر ہوگا۔ پھر برائیاں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں بعض کا تعلق بدکرداری کا اپنی ذات سے ہوتا ہے، اور بعض برائیوں کے اثرات متعدی ہوتے ہیں اور پورے معاشرے کو متاثر کرتے ہیں۔ کیا وہ انسان سزا کا مستحق نہیں ہے جس نے پوری سوسائٹی کو نشانۂ ظلم و ستم بنایا ہو؟ یا کسی ایک انسان پر مشقِ ستم کی ہو؟ ذرا غور فرمایئے ایک مظلوم؛ زندگی بھر ظالم کے ظلم کو صرف اس یقین پر برداشت کر لیتا ہے کہ یہاں میرے بازوؤں میں طاقتِ انتقام نہیں مگر میدانِ حشر میں خدائے قدیر کے انتقام سے کوئی نہ بچ سکے گا۔

قریب آتا ہے روزِ محشر چھپے گا کُشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اگر ایک مظلوم کو یوم الجزا پر یقین نہ ہو تو فرطِ غم سے مظلوم کا کلیجہ پھٹ جائے، لیکن ہزار ظلم کے باوجود اگر وہ جیتا ہے تو قدرت کے عدل پر وردستِ انتقام کے سہارے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے حقوق العباد میں عدلِ کامل برتنے کی بار بار تاکید کی ہے۔ حقوق اللہ تو معاف ہو جائیں گے، مگر حقوق العباد اُس وقت تک معاف نہ ہوں گے جب تک مظلوم خود راضی نہ ہو جائے۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دُعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

توبہ: ہاں! اگر انسان نے بندوں کے حقوق غصب نہیں کیے ہیں بلکہ اپنے ہی اوپر ظلم کرتا رہا ہے تو اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ گناہ گار بندہ جب کبھی شرمسار ہو کر خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوگا تو خدائے پاک اُس کو ضرور معاف فرما دے گا۔ چنانچہ قرآنِ عظیم میں آیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْآ اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ.

[آل عمران، آیت ۱۳۵]

جن لوگوں سے اعلانیہ گناہ سرزد ہوئے یا ان لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا پھر اللہ کو یاد

کیا اور اپنے گناہوں سے مغفرت طلب کی تو خدا کے علاوہ گناہوں کا بخشنے والا کون ہے! جب کہ ان لوگوں نے اپنے گناہوں پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کیا۔

ایک مقام پر ارشاد ہے:

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. [المآئدۃ،آیت۳۹]

جس نے گناہ کے بعد توبہ کی اور خود کو نیکی کی راہ پر ڈالا تو اللہ بے شک اُس کی توبہ ضرور قبول فرمائے گا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

حیرت یہ ہے کہ "میں عیسائی کیوں ہو گیا" کے مؤلف کو قرآن عظیم کی یہ آیاتِ کریمہ نظر نہ آئیں۔ وہاں تو اعترافِ گناہ کے لیے چرچ تک جانا پڑتا ہے، لیکن یہاں اس کی بھی شرط نہیں۔ جہاں کہیں بھی انسان اپنے گناہوں پر نادم ہوا اور توبہ کرے، اللہ تعالیٰ اُس کی توبہ ضرور قبول فرماتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلنَّدَامَةُ تَوْبَةٌ.

"گناہوں پر شرمندہ ہو جانا ہی توبہ ہے۔"

گناہ کے بعد جس قدر جلد توبہ کی جائے اُسی قدر جلد مغفرت ملتی ہے۔ چنانچہ قرآن عظیم فرماتا ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. [النسآء،آیت۱۷]

"اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو بے خبری سے گناہ کرتے ہیں، مگر توبہ میں جلدی کرتے ہیں، یہی لوگ معافی کے قابل ہیں اور اللہ تعالیٰ علم و حکمت والا ہے۔"

حدیث پاک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اعْتَرَفَ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ لَهٗ.

"جب بندہ اعترافِ گناہ کر لے اور پھر توبہ کر لے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔"

ایک دوسری حدیث پاک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنْ عَلِمَ أَنِّىْ ذُوْ قُدْرَةٍ عَلٰى مَغْفِرَةِ الذُّنُوْبِ غَفَرْتُ لَهٗ وَلَا اُبَالِىْ مَالَمْ يُشْرِكْ بِىْ عَلَيه.

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ میں مغفرت کرنے والا ہوں، میں نے اُس کی مغفرت کر دی جب تک کہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے۔"

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں:

قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم اِنَّ الشَّيْطٰنَ قَالَ وَعِزَّتِكَ يَارَبّ لَا اَبْرَحُ اُغْوِى عِبَادَكَ مَادَامَت اَرْوَاحُهُمْ فِي اَجْسَادِهِمْ قال الربُّ عَزَّ وجَلّ وعِزّتى وجلالى وَارْتِفَاعِ مَكَانِى لا أَزَالُ اَغْفِرُ لَهُمْ مَا اسْتَغْفَرُوْنِى.

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا، اے اللہ تیرے عزت و جلال کی قسم میں تیرے بندوں کو اُس وقت تک گمراہ کرتا رہوں گا جب تک اُن کے جسموں میں جان رہے گی۔ خدائے پاک نے ارشاد فرمایا مجھے میرے عزت و جلال کی، بزرگی و عظمت کی قسم ہے میں اُن کو اُس وقت تک معاف کرتا رہوں گا جب تک وہ مغفرت طلب کرتے رہیں گے۔"

مندرجہ بالا آیاتِ شریفہ اور احادیثِ مبارکہ ایک بندۂ گناہ گار کو یہ یقین دلاتی ہیں کہ اُس کی مغفرت ہو جائے گی، لیکن اس کے ساتھ پروانۂ نجات دے کر مزید ارتکابِ گناہ کا حوصلہ نہیں دیتیں۔ بلکہ امیدِ واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ بخش دے گا، اس لیے کہ اُس کا فرمان ہے: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ [الزمر: آیت۵۳] لیکن اللہ غنی ہے، بے نیاز ہے اس لیے اس کا خوف باقی رہتا ہے کہ کہیں وہ گرفت نہ فرمالے۔ امید و بیم کی یہی کیفیت انسان کو ارتکابِ معاصی سے روکتی ہے۔ اُس کے اندر عمدہ اخلاق اور بہترین خصائل کو جنم دیتی ہے

اور ہر طرح کے غرور وتمرّد سے باز رکھتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی عظیم شخصیت جن کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نبیًا لَکَانَ عُمَر

''اگر میرے بعد کوئی نبی ممکن ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔''

وہ ایک مرتبہ مومن کی کیفیتِ بیم ورجا کی ترجمانی ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:

''اگر میدانِ حشر میں یہ ندا آئے کہ ایک شخص کے علاوہ تمام ابنائے آدم کو بخش دیا گیا تو مجھے یہ خوف ہوگا کہ وہ میں ہی ہوں۔ اور اگر یہ آواز آئے کہ ایک فرد کے علاوہ سب جہنم میں جائیں گے تو مجھے اپنے خدا کے فضل سے یہ امید ہوگی کہ وہ میں ہی ہوں کہ جنت میں جاؤں گا۔''

شفاعت: توبہ ومغفرت کے علاوہ اسلام آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا بھی یقین دلاتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

شفَاعَتِیْ لِاَ ھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِی۔

میدانِ قیامت میں میری شفاعت اُن اُمّتیوں کے لیے ہے جنھوں نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا ہے۔

یعنی اگر اس دُنیا میں خدائے پاک کی جانب سے بخشش کا انعام نہ ملا تو بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ ابھی مرحلۂ شفاعت باقی ہے اور ہر اُمّتی کو اپنے آقا سے یہ اُمید ہے کہ وہ شفاعت فرمائیں گے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام میں نجات ہے مگر کسی بے جان صلیب کے سامنے اعترافِ گناہ کے ذریعے نہیں بلکہ شہید واجیر، رحیم وکریم خدا کے سامنے اعترافِ گناہ اور توبہ کے ذریعے سے ہر انسان کو نجات ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نجات عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆

اخلاصِ عمل

دین کا کوئی بھی کام کیا جائے اُس کو اللہ کے نزدیک قبولیت حاصل کرنے کے لیے اخلاصِ عمل بہت ضروری ہے۔ یعنی وہ کام صرف اللہ ہی کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے کیا جائے۔ اگر کسی اور غرض وغایت سے کیا گیا ہے تو اس کی جزا نہ ملے گی۔ چنانچہ قرآن عظیم نے بار بار عمل میں اخلاص پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کے عبادت جو صرف اللہ پاک کی ہی کی جاتی ہے اور اس میں بھی حسنِ نیت اور اخلاص پر انحصار کیا گیا ہے، کہ عبادت سے بھی مراد صرف رضائے الٰہی ہو، اور دوسری کوئی بات مقصود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اَنْ اَعْبُدَاللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ. [الزمر: آیت ۱۱]

''پس اللہ کی عبادت کیجیے خلوص اور اطاعت کے ساتھ۔''

عبادت کے علاوہ بھی جملہ امورِ دینی میں اخلاص بہت ضروری ہے تا کہ وہ عنداللہ مقبول وماجور ہوسکیں۔ شیطان جب انسان کو نیک عمل سے باز نہیں رکھ سکتا تو اُس کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس میں کوئی دُنیاوی غرض شامل کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں ان کا کُل کِیا دھرا مٹی بن جاتا ہے۔ دین کی راہ میں کام کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ کوئی ایسا طریقہ نہ اختیار کریں جس میں شیطان کو بہکانے کا موقع مل جائے بلکہ ہر وقت اور ہر آن رضائے الٰہی کو پیشِ نظر رکھیں۔ حدیث پاک میں اخلاصِ عمل پر اُبھارنے کے لیے میدانِ قیامت اور روزِ حساب کا ایک دردناک منظر پیش کیا گیا ہے، جس میں تین آدمیوں کو خدائے ذوالجلال کے حضور میں پیش کیا جائے گا:

[۱] قرانِ عظیم کی تلاوت کرنے والا۔

[۲] صدقہ وزکوٰۃ دینے والا مال دار آدمی۔

[۳] اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا مجاہد۔

چنانچہ جب خداے وحدۂ قدوس ارشاد فرمائے گا کہ ہم نے تجھے قرآن کا علم دیا تھا تاکہ لوگوں کو قرآن سیکھائے، قاری جواب دے گا:

میں نے اپنی پوری زندگی لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی۔ اللہ پاک ارشاد فرمائے گا:

''تو، کاذب ہے۔ تو نے قرآن اس لیے پڑھایا تھا کہ لوگ تجھ کو قاری کہیں۔

پھر دولت مند سے ارشاد فرمائے گا: میں نے تجھے اپنی نعمتیں دی تھیں۔

وہ عرض کرے گا: میں نے صلۂ رحمی کی۔ تیری نعمتوں کو تیرے بندوں پر خرچ کیا۔

تو اللہ پاک ارشاد فرمائے گا:

تو نے جو کچھ کیا محض اس لیے کہ لوگ تجھ کو فیاض اور سخی کہیں۔

مجاہد سے اُس [کو عطا کی گئی] قوت وطاقت کا حساب لے گا تو وہ کہے گا: میں نے تیرے راستے میں جہاد کیا۔ تو اللہ پاک فرمائے گا:

تو نے جہاد میری رضا کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ اس لیے کیا تھا کہ لوگ تجھ کو مجاہد کہیں، بہادر کہیں۔

اور پھر ان لوگوں کو جہنم میں ڈال دے گا۔ اس حدیثِ مبارک سے معلوم ہوا کہ خدا کے حضور میں صرف خلوصِ عمل مقبول ہے۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ.

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''

اس معیار پر جب ہم صحابۂ کرام کی مقدس زندگیوں کا جائزہ لیتے ہیں، تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اُن کے ہر عمل میں ان کی نیت اور ان کا ارادہ – رضاے الٰہی – کا حصول ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جلیل القدر صحابۂ کرام اپنی تمام تر عظمتوں کے باوجود خداے ذوالجلال کے حضور میں ہمیشہ لرزتے رہتے تھے اور اس سے دُنیا میں جزا مانگنے کے بجائے آخرت میں صرف اس کی رضا کے خواست گار ہوتے تھے۔ چنانچہ خلیفۂ اوّل یارِ غارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؛ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کو خود خداے ذوالجلال نے

بذریعۂ جبریل علیہ السّلام سلام بھیجا ہے، جن کا تذکرہ قرآن عظیم میں موجود ہے، جنہیں ساری دُنیا – افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق – کہتی ہے۔ جن کی خدمات کا یہ عالَم کہ ابتداے اسلام سے لے کر اپنی وفات شریف تک ہر ہر لمحہ دینِ متین کی خدمت میں گذارا ہے۔ بڑے بڑے صحابۂ کرام جن کی ایک نیکی کے بدلے میں زندگی بھر کی نیکیاں قربان کرنے کے لیے تیار تھے۔ جو زندہ رہے تو یارِ غار بن کر، اور پردہ فرمانے کے بعد یارِ مزار کی حیثیت سے آرام فرما ہیں...... ایک مرتبہ ایک باغ سے گذر رہے تھے۔ درختوں کی شاخوں پر کچھ پرندے چہچہا رہے تھے۔ اُن کو دیکھ کر بے ساختہ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور ارشاد فرمایا:

''اے طیورِ خوش الحان! تم ہم سے ہزار ہا درجہ بہتر ہو، اس لیے کہ خلّاقِ عالَم نے تم کو آخرت کے احتساب سے بے نیاز فرمایا ہے۔ آہ! ہمارا کیا عالَم ہو گا جب خدا کے حضور میں ہمارے اعمال پیش کیے جائیں گے۔''

اسلام قیامت تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے احسانات سے دبا رہے گا۔ ہماری گردنیں اُن کے پاے عظمت پر ہمیشہ خم رہیں گی، مگر آپ کے انکسار کا یہ عالَم ہے کہ اپنے اعمال کو مدارِ نجات و ذریعۂ فخر ومباہات نہیں قرار دیتے بلکہ خدا کے حضور میں لرزاں وترساں ہیں اور صرف اُس کے فضل کے طلب گار رہیں۔

حضرت سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق کے بعد سب سے بلند وبالا ہے۔ جن کی بے پناہ قوت وشجاعت نے اسلام کو طاقت وشوکت بخشی۔ جن کے اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کے پیروں سے زنجیرِ محن ٹوٹی۔ جن کے بارے میں خود سیّدِ عالَم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لو کان بعدی نبیّاً لکان عمر .

''اگر میرے بعد کوئی نبی ممکن ہوتا، تو جناب عمر ہوتے۔''

ان کا یہ عالَم ہے کہ صحرا سے گذرتے وقت اچانک بے قرار ہو جاتے ہیں اور آسمان کی طرف نگاہِ مبارک اُٹھا کر عرض کرتے ہیں:

"اے اللہ! تیرے احسانات کا شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ ورنہ ایک دن وہ تھا جب میں اپنے والد خطاب کے اونٹ اِسی میدان میں چَرایا کرتا تھا اور وہ مجھے جھڑکیاں دیتے تھے۔"
یہ کہتے کہتے زمین پر بیٹھ گئے اور ریت کے ذرّوں کو سینے سے لگا کر ارشاد فرمایا:

"ریت کے ذرّو! مجھے تمہاری قسمت پر رشک آتا ہے، اس لیے کہ تم کو خدائے پاک کے حضور میں حساب نہ دینا ہوگا۔"

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو ذوالنورین ہیں، جن کی حیا فرشتوں کے لیے بھی مثالی ہے، جن کی سخاوت نے غربائے مدینہ کو ہر غم سے بے نیاز کر دیا تھا، جن کی مالی امداد نے اسلام کو کفر سے مزاحمت کی استعداد بہم پہنچائی، جن کا عظیم کارنامہ جمعِ قرآن ہے۔ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ ثالث ہیں۔ اپنے مکان میں بلوائیوں کی یلغار سے بچنے کے لیے محصور ہیں، بے شمار ننگی تلواریں ان کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں، جو اُن کے خون کی پیاسی ہیں، کچھ مخلصین بڑی مشکل سے اُن تک رسائی حاصل کرتے ہیں، اور خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں: حضور حکم فرمائیں تاکہ اسلام کے بہترین مجاہد جن کی تلواروں نے بدر وحنین وخیبر میں کافروں کو شکستِ فاش دی تھی، ان بلوائیوں کو ان کے اعمالِ بد اور اقدامِ بے محل کی سزا دیں۔ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ارشاد فرمایا: میرے رفیق! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ عثمان اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کی گردنیں کٹوائے؟ اور پھر بلوائیوں نے ان کو اس حالت میں شہید کیا کہ وہ قرآنِ عظیم کی تلاوت کر رہے تھے...... حالاں کہ ان کی عظمت کے حضور میں اگر مسلمانوں کی گردنیں بطورِ نذر پیش کی جاتیں تو وہ اس کے حق دار تھے، مگر انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ صرف رضائے الٰہی کے لیے، مسلمانوں کا تعاون حاصل کر کے اپنے اعمالِ حسنہ کا صلہ اس دُنیا میں نہیں لینا چاہتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ جو خلیفۂ چہارم ہیں اور جنہوں نے سب سے پہلے رسولِ گرامی وقار صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت ونصرت کا اعلان فرمایا، حالاں کہ اس وقت وہ کم عمر

تھے۔ جن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بے پناہ محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جو بابِ مدینۃ العلم ہیں، جو مرکزِ اولیائے عالم ہیں۔ ان کو لوگوں نے ایک بار اس حالت میں دیکھا کہ وہ اپنی مقدس داڑھی پکڑے ہوئے رو رہے ہیں اور فوزِ غم واندوہ میں ڈوب کر ارشاد فرما رہے ہیں: "اے دُنیا تو مجھے دھوکا نہ دے، تیرا مقصد حقیر ہے۔"

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو اسلام کے اُن عظیم سپہ سالاروں میں سے ایک ہیں جن پر تاریخ ناز کرتی ہے اور مسلمانانِ عالم قیامت تک ناز کرتے رہیں گے۔ جنہوں نے مصر جیسے عظیم ملک کو فتح کر کے پورے برّاعظم افریقہ کی فتوحات کے لیے دروازہ کھول دیا۔ بسترِ مرض پر لیٹے ہوئے ہیں، ان کے صاحب زادے تصویرِ غم بنے ہوئے باپ کے اضطراب کو دیکھ رہے ہیں اور جب موت کا یقین ہو جاتا ہے تو دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے ہیں اور پھر حضرت عمرو بن العاص کی فتوحات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اسلام پر آپ کے احسانات ہیں، خدا آپ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے گا۔ یہ سن کر حضرت ابن العاص ارشاد فرماتے ہیں "بیٹے! میری فتوحات کا تذکرہ نہ کرو، مجھے صرف اللہ کے فضل سے نجات کی اُمید ہے۔"

حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کو اسلام کی راہ میں اِس قدر تکلیفیں دی گئیں کہ آپ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جاتا اور آپ کی پشتِ اطہر سے اس قدر چربی پگھلتی کہ آگ کبھی کبھی سرد پڑ جاتی اور ظالم دوبارہ آتش کدۂ نمرود دہکاتے اور اس پر حضرت خباب کو لٹاتے تاکہ وہ اپنے اسلام سے باز آ جائیں اور کفر کی زندگی میں لوٹ آئیں۔ معاذ اللہ۔ مگر جس نے ایمان کی لذت چکھ لی ہے وہ کفر کی دُنیا کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔

زندگی بھر حضرت خباب اپنے جسمِ سوختہ کے داغوں کو اپنی زندگی کا سرمایہ تصور کرتے رہے۔ عمر کے آخری حصے میں ان کو تھوڑا سا آرام ملا تو ایک روز بہ حسرت تمام ارشاد فرمانے لگے: خدانخواستہ آخرت کی تمام نعمتیں مجھے دُنیا ہی میں تو نہیں مل رہی ہیں، اور اس طرح میں آخرت میں خالی ہاتھ اُٹھایا جاؤں۔ یہ فرمایا اور تمام لذتوں سے دامن کش ہو گئے

اور اپنے خدا سے اِس صورت میں ملے کہ ان کے کفن کے نیچے وہ جسمِ سوختہ تھا جس کو اللہ کی راہ میں اذیتیں پہنچائی گئی تھیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کو عمرِ ثانی کہا جاتا ہے، جن کا دور خلافتِ راشدہ ہی کی منہاج پر تھا اور ایک بار پھر وہ امن و امان لَوٹ آیا تھا جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں تھا۔ آپ کی وسعتِ سلطنت کا یہ عالَم کہ بہ یک وقت روم، فارس، شام، مصر، یمن، حجاز، عراق جیسی عظیم حکومتیں زیرِ اقتدار تھیں، مگر اپنی پوری زندگی فقر و فاقہ میں گذاری، جسم پر پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے رہے۔ بیت المال کو قوم و ملت کا سرمایہ تصور کرتے تھے۔ ایک پیسہ بھی اپنی ذات پر خرچ کرنا گناہِ عظیم خیال فرماتے۔ عید کے دن بچے اچھے کپڑوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ شریکِ زندگی بیت المال سے قرض لینے کے لیے کہتی ہے مگر حضرت عمر ابن عبدالعزیز ارشاد فرماتے ہیں:

"نیک بخت! کل خدا جانے میں قرض دینے کے لیے زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔ بچوں کو پرانے کپڑوں میں عیدگاہ بھیج دو۔"

اور جب ان کا انتقال ہوا تو لوگوں نے ان کی شریکِ حیات سے کفن کے لیے کہا۔ انہوں نے جواب دیا: اللہ! ابن عبدالعزیز پر رحم فرمائے ان کے گھر میں اُن کپڑوں کے علاوہ کوئی اور کپڑا نہیں جو اُن کے جسم پر ہے۔

سیّد السالکین حضرت احنف بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ چراغ کی مدّھم روشنی میں قرآنِ عظیم کی تلاوت کر رہے ہیں۔ ایک جگہ جب جہنم کے عذاب اور اس کے دہکتے ہوئے شعلوں کا ذکر آتا ہے تو اپنی انگلی چراغ کی لَو تک لے جاتے ہیں اور یہ سوچ کر زار و قطار رونے لگتے ہیں کہ جب چراغ کی معمولی سی لَو ناقابلِ برداشت ہے تو جہنم کے شعلوں کا کیا حال ہوگا۔ اور پھر پوری شب گریہ وزاری میں گذار دیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ اُن لوگوں میں سے تھے، جنہوں نے عرفان کی راہیں کشادہ کیں اور لوگوں کو زندگی بھر صراطِ مستقیم کی طرف بلاتے رہے اور بے شمار افراد کو انہوں نے جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں سے کھینچا۔ لیکن

اپنے اعمال پر غرور نہیں بلکہ خدا کے فضل پر بھروسہ اور اُس کے عذاب سے خوف، اُمید و بیم کی زندگی گذارنے پر مجبور کرتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ میں ایک نوجوان صحابی ایک جنگ کے موقع پر میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے خدا کے حضور میں سربسجود ہیں اور ایک عجیب طرح کی دُعا مانگ رہے ہیں:

"اے اللہ جب میرا مقابلہ کسی دُشمن سے ہو تو مجھے شکست دیدے اور میرے ہاتھ پاؤں اور ناک کان کاٹ لے، میری آنکھیں نکال لے، اور جب میں اس طرح تیرے حضور میں اُٹھایا جاؤں اور تُو مجھ سے پوچھے کہ عبداللہ تیرا یہ حال کیوں کر ہوا تو میں جواب دوں، میرا یہ حال تیرے لیے اور حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوا ہے۔"

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالَم سے خفا میرے لیے ہے

صحابۂ کرام کے اخلاص و ایثار کے عظیم واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے تھے صرف رضائے الٰہی کے لیے کرتے تھے۔ اُن کا جہاد، اُن کی زندگی، اُن کی موت، اُن کے اعمالِ حسنہ سب کے پیشِ نظر صرف ایک مقصد تھا۔ اللہ کی رضا اور بس۔

اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔

[الانعام: آیت ۱۶۲]

میری نماز، میری قربانیاں، میری زندگی اور میری موت صرف اللہ کے لیے ہے۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

☆☆☆

عورت اور پردہ

اسلام ایک نظامِ عدل ہے۔ وہ انسانیت کا احترام سکھاتا ہے اور زندگی کے کسی شعبے میں بھی انسانیت کی تحقیر و توہین پسند نہیں فرماتا، بلکہ اُن تمام رُجحانات کا شدت کے ساتھ قلع قمع کرتا ہے جن سے انسانیت کی توہین ہوتی ہے۔ اسلام نے عورت کو پردے کا حکم بھی اسی لیے دیا ہے کہ اس کی انسانی قدروں کا احترام ممکن ہو سکے۔ آپ اگر ازمنۂ قدیمہ میں عورت کی حیثیت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آج صرف انداز بدل گیا ہے، ورنہ اسلام سے قبل عرب، ہند، روم و یونان میں عورت کو جو حیثیت حاصل تھی اور جس ذلت کی زندگی پر اسے مجبور کیا گیا تھا، غیر اسلامی معاشرے میں آج بھی وہی حیثیت برقرار ہے، صرف برتاؤ کا انداز بدل گیا ہے، تخاطب کا لب ولہجہ بدل گیا ہے، شرابِ کہن کو نئے جام میں انڈیل دیا گیا ہے۔

جس زمانے میں پوری دُنیا میں عورت کو کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں تھا، یونان میں یہ بحث چل رہی تھی کہ عورت کے اندر احساس ہے یا نہیں۔ یورپ نے اسے خبیثہ، مکارہ اور شجرِ ممنوعہ کی طرف لے جانے والی برائی قرار دیا تھا۔ عرب و ہند میں عورت کو بازار کی جنسِ ارزاں سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں تھی، کہیں بچیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا اور کہیں مرد کی چِتا پر عورتوں کو زبردستی جلنا پڑتا تھا۔ اسی دور میں پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار دُنیا کو عورتوں کی عزت و احترام کا احساس دلایا اور اپنی تعلیمات میں یہ بات واضح کر دی کہ عورت نصف انسانیت ہے اور مرد ہی کی طرح لائقِ احترام ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: عورتیں نازک شیشے ہیں، ان کا خیال رکھو۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا کہ: عورتوں کو ان کے حقوق دو اور ان پر ظلم نہ کرو۔ اپنے آخری خطبے میں حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا کہ: عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرتے رہو۔ اپنی مقدس تعلیمات کے ذریعے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا صالح معاشرہ تشکیل فرمایا کہ جس میں دُنیا کے اس مظلوم ترین طبقہ نے عزت و وقار کی آنکھ کھولی اور زندگی کے تمام میدانوں میں خواہ وہ معاشرتی

ہوں یا تعلیمی؛ سرگرم حصہ لے کر دین و دُنیا کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے برعکس یورپ میں عورت سترھویں صدی عیسوی تک مظلوم تر رہی اور جب یہاں کے لوگوں نے کلیسائی جبر و تشدد کا قلادہ اپنی گردن سے اُتار پھینکا تو عورت بھی ایک دَم آزاد ہوگئی۔ مگر اس کی آزادی بالکل ایسی ہی تھی جیسے کہ کسی قیدی کو ایک صحرا میں لے جا کر آزاد کر دیا جائے، جہاں اس کو اپنی منزل کا قطعی پتا نہ ہو۔ حتیٰ کہ اسے سمتوں کا تعین کرنا بھی مشکل ہو۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں جو بھی کارواں اس طرف سے گذرے گا وہ اُس کے ساتھ ہو جائے گا، خواہ وہ کاروانِ حیات ہو یا قافلۂ موت، رہ زَنوں کا گروہ ہو یا رہ بَروں کی جماعت۔

یہی وجہ ہے کہ گذشتہ تین صدیوں سے یورپ میں عورت اپنے حقوق کے تعین، اپنی انفرادی حیثیت کی بقا اور تحفظ کے سلسلے میں جن مراحل سے گذری ہے اور جس قدر متضاد طرزِ زندگی پر مجبور کی گئی ہے، دُنیا کی تاریخ میں اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ اگر عدالتوں میں اس کے حقوق کا جائزہ لیا جائے تو اوسطاً ہر پچیس سال کے بعد قوانین کو تبدیل کر کے بھی آج اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا رہا ہے، اور اگر معاشرے میں اس کے مقام اور کردار کے متعلق غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ آج سے زیادہ رُسوائی اور بے عزتی کا دور عورت کے اوپر کبھی نہیں آیا تھا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ مرد اپنے ذوقِ جمال کو تسکین دینے کے لیے اور اپنی شہوانی آگ کو مزید شعلۂ جوالہ بنانے کے لیے آج ہر مقام پر عورت کو عریاں اور آزاد کر چکا ہے۔ بازاروں میں، مکانوں میں، ہوٹلوں میں، ناچ گھروں میں، کلبوں میں، دکانوں پر جہاں کہیں آپ جائیں، عورت مرد کی آسودگیِ نظر کا سامان نظر آئے گی۔ گویا خود عورت کا اپنا وجود نہیں ہے، مرد عورت کو جس انداز میں دیکھنا چاہتا ہے وہ عریاں ہوتی جا رہی ہے۔ سب سے پہلے جب مرد نے اپنی پیاسی نگاہوں کی تسکین کے لیے عورت سے لباس کی قید سے قدرے آزاد ہونے کا مطالبہ کیا تو بنتِ حوّا نے قبائے مریم اُتار پھینکی، لیکن انسان کی نظر - ہل من مزید - کی قائل ہے۔ چنانچہ جب اس نے مزید تسکینِ نظر چاہی تو دست و بازو کھول دیے، پھر سینہ و ساق عریاں ہوگئے اور بالآخر جسم پر جو برائے نام لباس رہ گیا تھا آج اُس کو

بھی اُتار پھینکنے کا مطالبہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

کیا یہ صورتِ حال عورت کو یہ احساس نہیں دلاتی کہ وہ محض مرد کی نگاہوں اور جنسی تقاضوں کی تسکین کا سامان ہے اور بس، اس کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک دکان دار اپنی دکان میں، ایک ہوٹل کا منتظم اپنے ہوٹل میں، کلبوں اور رقص گاہوں کے مالکان اپنے کلبوں اور ڈانس گھروں میں، فضائی پروازوں کی کمپنیاں اپنی پروازوں میں محض اس لیے خوب صورت عورتوں کو ملازم رکھتے ہیں کہ ان کا کاروبار چمکے اور گاہک زیادہ سے زیادہ آئیں۔ تو عورت کی ''اَنا'' اور اس کا ضمیر کیوں نہیں محسوس کرتا کہ وہ پہلے سامانِ تجارت تھی اور اب سامانِ تجارت کے ساتھ بِک رہی ہے۔ مگر صدیوں کی اس تذلیل نے عورتوں کا احساسِ خودی چھین لیا ہے اور اب وہ اپنی ان ذلتوں پر مطمئن ہوگئی ہے۔

اسلام نے عورتوں کے حدودِ عمل کی تعیین اور پردے کا حکم اس لیے نہیں دیا تھا کہ عورت کو مجبورِ محض بنا کر گھر کی چار دیواریوں میں محصور کر دیا جائے بلکہ اسلام ان پابندیوں سے عورت کی عظمت اور معاشرے میں اس کے لیے مناسب کردار کا تحفظ چاہتا ہے۔

اگر آپ اسلام کے ماضی کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانیت کی فلاح و بہبود اور ترقی و کمال میں عورت نے مرد ہی کی طرح اپنے حصے کا کارنامہ انجام دیا ہے اور کسی بھی مقام پر اپنے کو ان قیودِ عزت سے آزاد کرنے کی کوشش نہیں کی جن میں اس کا اپنا وقارِ نسوانی محفوظ تھا۔

اسلام نے عورت اور مرد کی فطری صلاحیتوں کے مطابق تقسیمِ کار کے بہترین اُصول وضع فرمائے۔ مرد اگر باہر کی دُنیا کا مہتمم ہے تو عورت گھر کے مسائل کی نگرانِ اعلیٰ۔ مرد اگر شمعِ انجمن ہے تو عورت چراغِ خانہ، مرد اگر خالد و طارق و محمود اور صلاح الدین بننے کے لیے پیدا ہوا ہے تو عورت اس لیے ہے کہ وہ گھر کو ایک ایسی تربیت گاہ بنا دے اور اس میں ایسے اسباب مہیا کرے جو مرد کو خالد و طارق اور محمود و صلاح الدین کے امثال بننے میں مدد

دے۔

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

نکہتِ گل جب تک دامنِ گل میں پوشیدہ رہتی ہے باعزت و باوقار رہتی ہے، لیکن جب دامنِ گل سے نکل کر آوارہ ہو جاتی ہے تو مٹ جاتی ہے۔ گل جب تک شاخِ گل سے وابستہ رہتا ہے تر و تازہ رہتا ہے اور جب شاخِ گل سے توڑ لیا جائے تو ممکن ہے کسی کے گلے کا ہار بن جائے، یا کسی کے دستار کی زینت بنے، یا کسی کے دامنِ حیات کو چند لمحوں کے لیے مہکا دے لیکن پھر وہ قدموں تلے روند دیا جاتا ہے۔

نہیں ہے شانِ خود داری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

کیا یہ آج کے بے پردہ ماحول کا خوف ناک انجام نہیں ہے کہ ایک انسان کا دل جب اپنی شریکِ زندگی سے بھر جاتا ہے، یا ایک عورت کا دل جب اپنے شریکِ حیات سے آسودہ ہو جاتا ہے تو اُس کی نگہِ انتخاب دوسری طرف اُٹھتی ہے، اور دونوں کی نگاہ میں ماضی کی رفاقت کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی؟ صنفِ نازک کی عریانیت معاشرے میں عفت و پاک دامنی کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ کیا یہ ایک ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے کہ یورپ جیسے علاقے میں عصمت ایک جنسِ نایاب ہے جو کہیں نہیں پائی جاتی؟

یورپ میں ایک طرف تو مرد عورت کو زِنا کے بعد مطالبۂ طلاق کا حق دیا گیا ہے اور دوسری طرف زِنا کے اسباب و محرکات اس قدر عام کر دیے گئے ہیں کہ وہ قدم قدم پر دعوتِ گناہ دیتے ہیں۔

اسلام کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ قانون عطا فرمانے سے پہلے ایک ایسا ماحول تیار کرتا ہے جس میں اُس قانون کا نفاذ بخوبی کیا جا سکے۔ وہ راستے کے موانعات کو ختم

فرماتا ہے، پھر راستہ چلنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ عفت و پاک دامنی کا مطالبہ کرتا ہے تو پہلے زِنا کو حرام قرار دیتا ہے اور معاشرے میں ایسی فضا پیدا کرتا ہے جہاں باعفت اور پاک دامن رہنا آسان اور ارتکابِ گناہ دُشوار تر ہو جائے۔

پردے کا حکم بھی اسی لیے دیا گیا ہے کہ معاشرے کو جنسی جنون کی دست برد سے بچایا جا سکے اور معاشرے میں ایسے افراد پیدا کیے جا سکیں جن کا دامن جنسی آلودگیوں سے پاک ہو۔ اسلام ہر گھر کو عبادت گاہ تو نہیں بنانا چاہتا مگر عبادت گاہوں کا تقدس ضرور بخشتا ہے۔ آج اسلام کی کسی بیٹی کو مریم وعذرا ہونے کا دعویٰ تو نہیں ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج بھی صرف مسلم معاشرے ہی میں ایسی بے شمار خواتین موجود ہیں جن کو مریم پاک کے مقدس آنچل کے صدقے میں عفت وعصمت کا لباسِ تقدس میسّر ہے۔

☆☆☆

سکریٹری رپورٹ

اس رپورٹ کو علامہ قمر الزماں اعظمی جوائنٹ سکریٹری جنرل دی ورلڈ اسلامک مشن نے ۷؍اگست ۱۹۷۷ء کی دوسری عالمی تعلیمی کانفرنس میں پڑھ کر سنایا۔

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم.

صدرِ باوقار! علمائے اسلام! اور معزز سامعین!

آج ہم بے پناہ مسرور ہیں کہ پروردگارِ عالم نے ہم کو اسلام کے مقدس نام پر جمع ہونے اور اُن مسائل پر غور کرنے کا موقع دیا جو ملتِ اسلامیہ کو تمام عالَم میں بالعموم اور مغربی ممالک میں بالخصوص درپیش ہیں، اور آج کی کانفرنس میں شرکا کا یہ عظیم الشان اجتماع اس بات کا واضح اعلامیہ ہے کہ عصرِ جدید میں ہر مسلمان اپنی دینی زندگی اور اخلاقی اقدار کے تحفظ کے لیے بے چین ہے، اور وہ دانش ورانِ ملت کے حضور میں معروضہ پیش کر رہا ہے کہ وہ غور وفکر کے بعد مسلمانوں کے لیے ایسا لائحۂ عمل مرتب کریں جس پر عمل کرنے کے بعد مسلمان اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں اور باطل کی طوفانی یلغاروں سے خود کو اور اپنے مقدس مذہب کو محفوظ رکھ سکیں۔

اِس سے قبل کہ ہم اپنے معروضات کو آپ کے سامنے رکھیں، ہم اُن تمام علما اور مشاہیرِ اسلام کے حضور میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں جو دور دراز لمبے لمبے سفر کرنے کے بعد یہاں تشریف لائے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہم برطانیہ، ہالینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے وفود کے مشکور ہیں جنھوں نے ورلڈ اسلامک مشن کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے یہاں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرما کر اس کانفرنس کو بامقصد اور پُر وقار بنانے میں حصہ لیا۔

حضرات! آج جب کہ ہم ورلڈ اسلامک مشن کی دوسری کانفرنس کا آغاز کر رہے

ہیں، ہم میں سے بیش تر لوگوں کے پردۂ ذہن پر پہلی کانفرنس منعقدہ ۲۱/اپریل ۱۹۷۴ء کی تصویر اُبھر رہی ہوگی اور ایک ایک کر کے وہ تمام مسائل سامنے آ رہے ہوں گے جن پر اس کانفرنس میں غور وفکر کیا گیا تھا اور کچھ واضح خطوطِ عمل متعین کیے گیے تھے۔ اس لیے زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اُن تجاویز کا اجمالی خاکہ پیش کر دیا جائے جو اُس کانفرنس میں اتفاقِ رائے سے منظور ہوئی تھیں، اور اس کے بعد اُن کاموں کا اجمالی جائزہ لیا جائے جو اس تین سال کی مدت میں ورلڈ اسلامک مشن نے انجام دیے۔

تنظیمی کانفرنس منعقدہ ۲۱/اپریل ۱۹۷۴ء میں مندرجۂ ذیل بنیادی اُمور طے پائے تھے:

[۱] اسلامی درس گاہوں سے فارغ شدہ علما کو مختلف زبانوں میں تبلیغی تربیت، اور یورپین مسلم نو جوانوں کو علومِ اسلامیہ کی تعلیم کے لیے اسلامک مشنری کالج کا قیام۔

[۲] دُنیا کی مشہور زبانوں میں صالح اور مؤثر اسلامی لٹریچر کی اشاعت کے لیے وِم پبلی کیشن [ورلڈ اسلامک مشن پبلی کیشن] کا قیام۔

[۳] مسلم بچیوں کو مغربی درس گاہوں کی بے راہ روی سے بچانے کے لیے علاحدہ مسلم گرلز اسکول کا قیام۔

[۴] دُنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے مسائل کا شرعی جواب دینے کے لیے ''عالمی دارالافتاء'' کا قیام۔

[۵] مندرجہ بالا جملہ اُمور کی انجام دہی کے لیے عمارت کی خریداری۔

ورلڈ اسلامک مشن کے لیے عمارت کی خریداری: مندرجہ بالا تمام طے شدہ تجاویز میں سب سے اہم اور مقدم تجویز ورلڈ اسلامک مشن کے تمام شعبوں کو بروے کار لانے کے لیے وسیع وعریض عمارت کا حصول تھا۔ اس سلسلے میں اراکین ورفقاے ادارہ نے بریڈفورڈ کے تمام علاقوں میں جگہ کی تلاش شروع کی۔ For Sale کی تختیوں سے مزین عمارتیں دیکھی جاتی رہیں، اور ورلڈ اسلامک مشن کے لیے ناقابلِ استعمال تصور کر کے مسترد ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ بعض مخلصین کے ذریعے معلوم ہوا کہ شیر برج روڈ

بریڈفورڈ ۷ میں ایک عظیم الشان چرچ قابلِ فروخت ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی ورلڈ اسلامک مشن کا ایک وفد عمارت دیکھنے کے لیے گیا، اور یہ دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی کہ فی الحال یہ چرچ مشن کی تمام ضروریات کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کہ اس میں ۱۷ چھوٹے بڑے کمرے ہیں اور دو طویل وعریض ہال ہیں۔ ان کمروں کو بطورِ آفس بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور اسلامک مشنری کالج کی کلاسوں کا اِجرا بھی ہو سکتا ہے۔ نیز مسلمانانِ بریڈفورڈ کے لیے ایک مسجد بھی بنائی جا سکتی ہے۔ عمارت کے جنوبی سمت میں ایک قابلِ استعمال اُفتادہ زمین بھی موجود ہے جو چرچ ہی کی ملکیت ہے، اُس پر حسبِ ضرورت مزید عمارت بھی تعمیر کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ مشن کے تمام ارکان کے متفقہ فیصلے کے مطابق مئی ۱۹۷۴ء میں ۴۰/ہزار پونڈ میں اِس عظیم الشان عمارت کا سودا کر لیا گیا۔ اور ۳۰/جولائی ۱۹۷۴ء کو اس عمارت کا قبضہ مل گیا۔ عمارت کی خریداری کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اس ۴۰/ہزار پونڈ کی خطیر رقم کی ادائیگی کا تھا، جسے ورلڈ اسلامک مشن کے رفقا اور ہم دردوں نے فوری طور پر بطورِ قرض مشن کو عطا کر دیا تھا۔ اراکینِ مشن نے اس سلسلے میں جان توڑ کوشش کی، اب آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ مشن کا قرض تقریباً ادا ہو چکا ہے، جو تھوڑی بہت رقم رہ گئی ہے وہ بھی جلد ہی ادا ہو جائے گی۔ ان شاءاللہ!

اسلامک مشنری کالج کا قیام: تنظیمی کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۷۴ء کی دوسری تجویز کا متن حسبِ ذیل تھا:

''ایک ایسے ادارے کا قیام جس میں مدارسِ عربیہ کے فاضل علما کو انگریزی، فرنچ، ڈچ، سواحلی، جرمن اور دیگر عالمی زبانوں میں تربیت دے کر اس قابل بنانا کہ وہ دُنیا کے مختلف علاقوں میں کام کر سکیں۔''

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسلامک مشنری کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ چنانچہ ۴/اگست ۱۹۷۴ء کو کالج کی عمارت کا افتتاح مسٹر سلیمان غیزی اتاشی کویت ایمبیسی

اور مسٹر محمد علی ایجوکیشن اتاشی ملیشیا ایمبیسی کے ہاتھوں عمل میں لایا گیا۔ اِسی اثنا میں فرینڈلی سوسائٹی سے درخواست کی گئی کہ وہ کالج کو ایک تعلیمی ادارے کی حیثیت سے رجسٹرڈ کرلے۔ چنانچہ رسم افتتاح کے ٹھیک ایک سال پانچ ماہ آٹھ دن بعد کالج رجسٹرڈ کرلیا گیا۔

کالج کی گورننگ باڈی: کالج کے انتظام وانصرام کے لیے مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل ایک گورننگ باڈی تشکیل کی گئی۔

چیئرمین: ڈاکٹر حنیف اختر فاطمی، پی ایچ ڈی؛ ڈی آئی سی؛ بیرسٹر؛ ایم آئی ای؛ ای ایف انسٹ؛ پی سی انگ؛ پی ای؛ وزیٹنگ پروفیسر کویت یونی ورسٹی

وائس چیئرمین: مولانا الحاج پیر معروف حسین نوشاہی، فاضلِ اسلامیات

پرنسپل: علامہ ارشد القادری، فاضل درسِ نظامیہ

سکریٹری: الحاج راجہ محمد عارف صاحب

ٹریزرر: الحاج غلام السیدین صاحب، ایم اے؛ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ لندن

گورنر: قمر الزماں اعظمی، فاضل علوم مشرقیہ

گورنر: ڈاکٹر عونی الطائی بغدادی، ڈی ارک لندن

گورنر: علامہ ابوالمحمود نشتر، ایم اے؛ فاضل عربی

اسلامک مشنری کالج کا اکیڈمک بورڈ: اسلامک مشنری کالج کے نصابِ تعلیم کی تیاری، منظوری اور اِجرا نیز درپیش تعلیمی مشکلات کے حل کے لیے ایک اکیڈمک بورڈ تشکیل دیا گیا، جس میں دُنیا کے مختلف علاقوں کے ایک سو علما اور دانش ور شامل ہیں، جن کی تفصیل اس مختصر رپورٹ میں ناممکن ہے۔

نصابِ تعلیم: اسلامک مشنری کالج کی گورننگ باڈی اور اکیڈمک بورڈ کی ایک میٹنگ میں باتفاق رائے یہ طے پایا کہ اسلامک مشنری کالج میں دوطرح کا نصاب پڑھایا جائے گا۔

پہلا نصابِ تعلیم: برطانیہ میں رہنے والے مسلمان بچوں کے لیے ہوگا، جہاں پانچ سال سے لے کر سولہ سال کی عمر تک جبری تعلیم کا قانون نافذ ہے۔ یہ یومیہ دو گھنٹے کا پارٹ

ٹائم کورس ہوگا جو مختلف مراحل سے گذرتا ہوا دس سال میں مکمل ہوگا۔

دوسرا نصابِ تعلیم: ۱۶؍سال کی عمر سے اوپر کے اُن طلبہ کے لیے ہوگا جو یہاں کی ضروری تعلیم حاصل کرچکے ہیں۔ ان کو عربی، تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، کلام، تاریخ وغیرہ کی تعلیم دی جائے گی اور فراغت کے بعد عالمیت کی ڈگری دی جائے گی۔ یہ نصابِ تعلیم ۵؍سال کا ہوگا اور اس کورس میں یورپ کے تمام ممالک کے طلبہ شریک ہوسکیں گے۔

تیسرا نصابِ تعلیم: جسے کالج لیول کا نصاب کہا جائے گا جو اُن علما کے لیے ہوگا جو کسی مستند عربی دارالعلوم سے درجۂ فضیلت پاس کرچکے ہوں۔ اور اس کو مرحلۂ تحقیق [ڈاکٹر آف فلاسفی] کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ یہ کورس مندرجہ ذیل زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں تین سال میں مکمل کیا جائے گا:

[الف] جدید عربی [ب] انگریزی [ج] فرنچ [د] سواحلی [ہ] ڈچ

کالج کے رجسٹریشن سے قبل درپیش قانونی موانع اور مشکلات کے سبب ہم فل ٹائم کلاسوں کا اِجرا نہ کرسکے۔ البتہ پارٹ ٹائم کلاسوں کا اِجرا افتتاح کے چند ماہ بعد ہوگیا تھا اور اِس وقت اُس میں دوسو بچے زیرِ تعلیم ہیں۔ اب اگر آپ نے بھرپور تعاون کیا تو۔ ان شاء اللہ۔ آئندہ دوماہ کے اندر اندر فل ٹائم کلاسوں کا اِجرا بھی عمل میں لایا جائے گا۔

وِم پبلی کیشن کا قیام: کالج کے قیام کے اقدامات کے ساتھ ساتھ اس بات کی کوشش کی گئی کہ ورلڈ اسلامک مشن کے سلسلے میں جس اشاعتی ادارے کا تذکرہ دستور میں کیا گیا ہے اور جس کا نام ۱۹۷۴ء کی کانفرنس میں ''وِم پبلی کیشن'' [ورلڈ اسلامک مشن پبلی کیشن] تجویز کیا گیا تھا، اس کا آغاز بھی کردیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر فاطمی صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ جدید ترین انگلش میں قرآنِ عظیم کا ایسا ترجمہ کریں جو اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ترجمے سے مستفاد ہو۔ چنانچہ انہوں نے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمے کو سامنے رکھ کر سلیس انگلش میں ترجمۂ قرآن مکمل فرمالیا ہے، جو جلد ہی مذہبی دُنیا کے سامنے پیش کردیا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔ اس کے علاوہ کانفرنس کی تجویز کے مطابق

''الدعوة الاسلامیہ'' اردو ماہ نامے کا اِجرا عمل میں لایا گیا، جس کے چھ شمارے مسلسل شائع ہوئے، لیکن بعد میں چند در چند وجوہ کی بنا پر اس کو بند کرنا پڑا۔ ان شاء اللہ! جلد ہی اس کا دوبارہ اِجرا ہوگا۔ اِس سلسلے میں مستقبل کا پروگرام یہ ہے کہ علما و محققین پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا جائے گا، جن کے ذمے یہ خدمت سپرد ہوگی کہ وہ مختلف زبانوں میں عصرِ جدید کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے کتابیں تحریر کریں، جن کو مشن کی جانب سے شائع کیا جائے گا۔ مشن کا یہ ذیلی ادارہ دُنیا کی لائبریریوں میں مذہبی لٹریچر کا قابلِ قدر اضافہ کرے گا- ان شاء اللہ

عالمی دارالافتاء کا قیام: ورلڈ اسلامک مشن کے قیام کے بعد ہی اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی تھی کہ ایک ایسا شرعی ادارہ قائم کیا جائے جو قرآن وسنت کی روشنی میں اُن مسائل کے جوابات دے سکے؛ جو دُنیا کے مختلف خطوں بالخصوص یورپ کے مختلف ملکوں سے مشن کے مرکزی آفس میں آتے رہتے ہیں، اور جن کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان میں زیادہ تعداد ایسے مسائل کی ہوتی ہے جو صرف مغربی ممالک میں بسنے والے مسلمانوں ہی کو پیش آسکتے ہیں، یا اُن مسلمانوں کو پیش آسکتے ہیں جو کسی بھی غیر اسلامی ماحول میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور اپنے اسلامی تشخص کو باقی رکھنے کے لیے رفتارِ زمانہ سے جنگ کر رہے ہیں، یا غیر اسلامی ماحول میں اسلامی معاشرے کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ اتنا بڑا کام ہے جس کے لیے علما اور محققین نیز اجتہادی شان رکھنے والے مفتیانِ کرام کی ایک جماعت کی خدمات درکار ہیں، لیکن اس وقت کا انتظار کہ ہم کو علما اور اربابِ تحقیق کا اتنا بڑا گروہ مل جائے تب ہم اس کام کا آغاز کریں؛ تقریباً ناممکن ہو رہا تھا۔ چنانچہ مشن نے تین علما پر مشتمل ایک بورڈ کی تشکیل کر دی اور اُن کو افتا کی ذمے داریاں سپرد کر دی گئیں۔ یہ دراصل عالمی دارالافتاء کے قیام کی طرف صرف ایک پیش قدمی ہے۔ ان شاء اللہ! وہ وقت جلد آئے گا کہ اس ادارے کے تحت علما اور مفتیانِ دین کی ایک جماعت عصرِ جدید میں پیش آنے والے مسائل کے حل میں مصروف

ہوگی اور اس طرح یہ ادارہ بذاتِ خود اسلامیانِ مغرب کے لیے مینارۂ نور ثابت ہوگا۔

تبلیغی دَوروں کا اہتمام: اسلام اُن تمام انسانوں سے جو اس کو بہ حیثیت نظامِ زندگی تسلیم کرتے ہیں یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ رنگ و نسل، وطن و زبان کے تمام امتیازات کو مٹا کر متحد ہو جائیں، اور ان تمام مادی رشتوں سے قطع تعلق کر کے صرف اسلام کے مقدس رشتے سے خود کو وابستہ رکھیں۔ حضور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت رنگ و نسل، وطن و زبان کی طرف نہ تھی بلکہ ایک ایسے دستورِ حیات کی طرف تھی جس کے سائے میں تمام انسان یکساں سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی گذار سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے وحدتِ کلمہ کی بنیاد پر اخوت کے مضبوط ترین رشتے سے منسلک فرمایا تھا، وہ لوگ خون اور دودھ کے رشتے سے زیادہ اس مقدس رشتے کا احترام کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے لوگ اسلام سے دور ہوتے گئے وطن و زبان، رنگ و نسل کی بنیاد پر منقسم ہوتے چلے گئے۔ وسائلِ سفر کے اعتبار سے دُنیا مختصر ہوتی گئی مگر دِلوں کے فاصلے بڑھتے گئے۔ نتیجتاً مسلمان اخوتِ اسلامیہ کو بالائے طاق رکھ کر وطن و زبان، رنگ و نسل اور جغرافیائی حد بندیوں کی بنیاد پر ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے۔ انجامِ کار ہماری ہوا اُکھڑ گئی اور ذلیل و رُسوا ہو گئے۔ ہمارے اسلاف جو مفتوحہ علاقے ہم کو ورثتہً عطا کر گئے ہم نے ان میں ایک انچ کا بھی اضافہ نہیں کیا، بلکہ اپنے اندرونی اختلاف کی وجہ سے بہت سے قابلِ قدر حصے گنوا بیٹھے۔ اسلام نے ہمارے سروں پر خیرِ اُمّت کا تاجِ کرامت رکھا تھا، تاکہ ہم -اُمّتِ دعوت- کو -اُمّتِ اجابت- کے دائرے میں شامل کریں، اور ساری دُنیا کو اخوتِ اسلامیہ کے مقدس رشتے میں منسلک کر دیں اور دُنیا اس بات کا اعتراف کرے کہ ؂

تقسیمِ ملل ملتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط وحدتِ آدم

ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلام کی بنیاد پر دُنیا کے تمام مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا جائے اور یہ رابطہ اس قدر مضبوط و مستحکم ہو کہ دلوں کے قرب کی بنیاد پر زمینوں کے فاصلے

مٹ جائیں، اور تمام دُنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہوسکیں، ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کا تعاون کرسکیں۔ اس اہم ضرورت کے پیش نظر ورلڈ اسلامک مشن کے دستور میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ہمیشہ تبلیغی دَوروں کا اہتمام کرے گا اور دُنیا کے مختلف علاقوں میں ایسے تبلیغی وفود روانہ کرے گا جو اسلام کا نظامِ رحمت دُنیا کے غیر مسلموں تک اور اس کا نظامِ محبت واخوت مسلمانوں تک پہنچا سکیں۔ اس سلسلے میں پہلا دورہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی، حضرت علامہ عبدالستار خان نیازی، پروفیسر شاہ فریدالحق اور علامہ ارشدالقادری نے کیا۔ جنوری ۱۹۷۰ء کے حجِ پاک کے موقع پر یہ علماے کبار اور قائدین ملت مدینہ منورہ میں جمع ہوئے اور پہلا اجلاس مدینۂ پاک ہی میں منعقد ہوا، جس میں حجازِ مقدس کے مختلف شہروں کے علاوہ عراق، شام، ترکی، مصر، بیروت، کینیا، تنزانیہ اور امریکہ کے مشاہیر علما و مشائخ نے شرکت کی۔ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی نے ورلڈ اسلامک مشن کی غرض وغایت پر تقریر فرمائی۔ مشن کے دائرۂ کار کو وسیع کرنے کے لیے تمام ملکوں کے نمائندوں سے تعاون کی اپیل کی۔ گنبدِ خضرا کے سائے میں دل سے نکلی ہوئی یہ صداے درد مقبول ہوئی اور تمام ملکوں کے نمائندوں نے یقین دلایا کہ مشن کے ساتھ ہم ہر طرح کا تعاون کریں گے۔

ارکانِ وفد نے اسلام کے نظامِ رحمت ومحبت کو مشن کے اغراض ومقاصد کی روح قرار دیا۔ علامہ شاہ احمد نورانی نے عربی میں خطاب فرماتے ہوئے حاضرینِ اجلاس کو بتایا کہ عالَمِ اسلام کی نجات مسلمانوں کے عالم گیر اتحاد میں پوشیدہ ہے۔ اجلاس کے بعد ہر آنکھ تر اور ہر دل محبت واخوت کے جذبے سے سرشار تھا۔ حاضرین نے مشن کی کامیابی کے لیے پُرخلوص دُعاؤں کی نذریں پیش کیں۔ ۱۴؍جنوری ۱۹۷۴ء کو ورلڈ اسلامک مشن کے وفد نے علامہ شاہ احمد نورانی کی قیادت میں رابطۂ عالَمِ اسلامی کے سکریٹری جنرل شیخ صالح قزاز سے ملاقات کی اور اُنھیں مشن کے اغراض ومقاصد سے باخبر کیا۔ موصوف حالات سن کر بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے ورلڈ اسلامک مشن کے ساتھ پُرخلوص تعاون کا وعدہ فرمایا۔

شیخ صالح سے ملاقات کے بعد یہ وفد اسی شام کو نیروبی کے لیے روانہ ہوگیا۔ نیروبی ائیرپورٹ پر شہر کے عمائدین ومعززین نے وفد کا شان دار استقبال کیا۔ ۱۵؍جنوری سے ۱۹؍جنوری تک نیروبی میں لگاتار اجلاس منعقد ہوئے، جس میں اراکین نے مختلف زبانوں میں مشن کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی اور ایسٹ افریقہ میں مشن کے تبلیغی اور تنظیمی منصوبے کو تفصیل سے لوگوں کے سامنے رکھا۔ کئی اجتماعات خالص افریقی مسلمانوں کے منعقد ہوئے، جن میں ترجمان کی مدد سے خطاب کیا گیا۔ کینیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے بھی مشن کا پیغام پورے ایسٹ افریقہ میں نشر کیا گیا۔ ۲۰؍جنوری کو یہ وفد ممباسا پہنچا، جہاں اراکینِ وفد نے مسجد نور میں عرب مسلمانوں سے خطاب کیا۔ ۲۲؍اور ۲۳؍جنوری کو وفد نے جزائر کے عوام سے خطاب کیا۔ کینیا میں مشن کی شاخ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان علاقوں کے علاوہ وفد کے ارکان نیروبی منڈی، کمنن روڈ، درگاہ باغ علی شاہ، ممباسا، تلورو گیڈی، لمنڈی کا بھی دورہ کیا۔ وہاں سے ۲۵؍جنوری کو ماریشس، مڈغاسکر اور ری یونین کے دورے پر روانہ ہوگئے۔ پورے ایک ماہ میں افریقہ کا دورہ مکمل کرنے کے بعد مشن کا یہ تبلیغی وفد برطانیہ پہنچا، یہاں ایک ماہ میں کم وبیش ۴۵؍اجلاس منعقد ہوئے۔ جس زمانے میں مشن کے ارکان برطانیہ کا دورہ کررہے تھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ برطانیہ میں اسلام کا موسمِ بہار آگیا ہے۔ ہر شہر نعرۂ تکبیر ورسالت کی آواز سے گونج رہا تھا۔ انگریز بھی کثیر تعداد میں مشن کے جلسوں میں شریک ہوئے۔ مشن کے جھنڈے تلے مسلمانوں کا عظیم اجتماع دیکھ کر یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ اس قوم کو ایک صالح قیادت میسر آگئی ہے۔ اگر یہ لوگ انھیں خطوط پر چلتے رہے جو مشن نے پیش کیے ہیں تو یورپ میں ایک صالح اسلامی انقلاب برپا ہوگا اور یہاں کا مسلمان ایک مضبوط بین الاقوامی دینی طاقت بن کر اُبھرے گا۔

برطانیہ کا دورہ مکمل کرنے کے بعد ورلڈ اسلامک مشن کے قائدین کا یہ نورانی وفد اسکاٹ لینڈ، ہالینڈ، فرانس، جرمنی، ڈنمارک اور اٹلی کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہ لمحات بڑے دل گداز تھے جب برطانیہ کی مسلم عوام قائدینِ وفد کو رُخصت کررہی تھی۔ بے شمار آنکھیں غم

ناک تھیں اور بے شمار نگاہیں قائدین کی پُر اعتماد اور منور پیشانیوں پر اسلام کی عظمت اور برتری کے نقوش پڑھ رہی تھیں۔ ایک ماہ تک انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک کا دورہ کرنے کے بعد ورلڈ اسلامک مشن کا تبلیغی وفد ۱۶؍ مارچ کو لندن ائیر پورٹ سے امریکہ کے لیے روانہ ہوا اور نیویارک ہوتے ہوئے جزیرۂ کراساؤ پہنچا، جہاں ۲۸؍ مارچ سے عالمی سطح کی ایک اسلامی کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ ۲۴؍ گھنٹے وہاں قیام کرکے اور کانفرنس کے انتظامی امور کا جائزہ لینے کے بعد ۱۸؍ مارچ کی شب میں سرینام پہنچا، جہاں ایئر پورٹ پر ایک عظیم ہجوم نے وفد کا خیر مقدم کیا۔ ۱۹؍ مارچ سے پیراماری میں جو سرینام کا دارالحکومت ہے، مشن نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ وفد کے ارکان نے کئی جلسۂ عام کرنے کے علاوہ وہاں کے مسلم عمائدین کے ساتھ ایک ایسے فارمولے پر تبادلۂ خیال کیا جو وہاں کے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کا تحفظ کر سکے۔ ارکانِ وفد نے وہاں کے مسلمانوں کی الگ الگ تنظیموں کو ایک مضبوط فیڈریشن کی صورت میں متحد کر دیا۔ ۲۳؍ مارچ کو شہر کے سارے مسلم عمائدین اور تمام تنظیموں کی ایک نمائندہ میٹنگ طلب کی گئی، جس میں ورلڈ اسلامک مشن کی سرینام میں شاخ کے قیام اور دیگر مقامی مسائل کا فیصلہ کیا گیا۔ ۲۸؍ مارچ جزیرۂ کراساؤ جو بحر اوقیانوس کے بیچ میں واقع ہے، وہاں کربین اور جنوبی افریقہ کی دسویں اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں لیبیا، عراق، مصر، فلسطین، لبنان، سعودی عرب، ہندوستان، پاکستان، یوکے، ہالینڈ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے وفود کے علاوہ رابطۂ عالمِ اسلامی، ورلڈ اسلامک مشن، ورلڈ مسلم لیگ اور جنوبی امریکہ کے مسلم تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔

کانفرنس میں شریک ہونے والے مندوبین نے انگریزی، عربی اور ڈچ زبانوں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ علامہ شاہ احمد نورانی، علامہ نیازی اور پروفیسر فرید الحق صاحب کی انگریزی تقاریر کو کانفرنس کا حاصل قرار دیا گیا۔ اس کانفرنس سے علامہ ارشد القادری سکریٹری جنرل ورلڈ اسلامک مشن نے عربی میں خطاب کیا۔ جنوبی امریکہ کے

دورے کے بعد ورلڈ اسلامک مشن کا وفد یکم اپریل کو نیویارک پہنچا، جہاں مسلمانوں کی آبادی کم وبیش پانچ لاکھ ہے۔ روس کے قدیم مسلم باشندے، ترک، البانیہ، چیکوسلواکیہ، یمن اور افریقی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ ماضی قریب میں ہندوستانی و پاکستانی مسلمان بھی خاصی تعداد میں پہنچ گئے ہیں۔ مذہبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز اسلامک سینٹر کے نام سے ریورسائڈ ڈرائیو میں واقع ہے، جس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سلیمان دنیا ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر وفد کے قائد حضرت علامہ شاہ احمد نورانی نے وہاں نمازِ جمعہ پڑھائی۔ شہر کے ممتاز مسلمانوں کے علاوہ مختلف تنظیموں کے نمائندوں کے سامنے انہوں نے وفد کے عالمی دورے کے تاثرات اور غیر مسلم دُنیا میں اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے ورلڈ اسلامک مشن کے تبلیغی اور تربیتی منصوبوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔ ورلڈ اسلامک مشن کے قائدین نے اس دورے کے ذریعے دُنیا کے بہت بڑے حصے میں مشن کا پیغام پہنچایا، اور خدا ارکانِ وفد کو جزائے خیر دے کہ اس طویل دورے کے سارے اخراجات انہوں نے اپنی جیب سے برداشت کیے، **فجزاھم اللّٰہ خیر الجزاء**۔ مستقبل میں بھی مشن اس طرح کے دَوروں کے اہتمام کا ارادہ رکھتا ہے، تاکہ اسلامی دُنیا سے اور مسلمانانِ عالَم سے مشن کا رشتہ استوار رہے۔

دینی تربیتی کیمپ: گرمیوں کی تعطیلِ کلاں کے موقع پر اسلامک مشنری کالج میں چالیس روزہ دینی تربیتی کیمپ لگایا جاتا ہے، جس میں برطانیہ اور ہالینڈ کے مختلف شہروں کے سیکڑوں طلبہ جو کالجوں اور اسکولوں میں زیرِ تعلیم ہیں شریک ہوتے ہیں، اور چالیس روز میں دین کے بارے میں جملہ ضروری علم حاصل کرکے واپس جاتے ہیں۔ اس سال کانفرنس کی تیاریوں کی وجہ سے اس کیمپ کا پروگرام ۱۵؍ روزہ کر دیا گیا، جو کانفرنس کے فوراً بعد ہی شروع ہوجائے گا۔ ان شاءاللہ

اس مختصر سی رپورٹ کے بعد حاضرین کانفرنس نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ورلڈ اسلامک

مشن نے اپنی مختصر سی عمر میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جو دوسری تنظیموں سے دس سال کی مدت میں بھی بہ مشکل انجام پذیر ہوسکتے ہیں۔ یہ تو تین سال قبل کے مقرر کردہ خطوط تھے، جن پر چل کر ہم نے اپنی بساط بھر کام کیا ہے۔اب اس کانفرنس میں شرکاے کانفرنس سے درخواست ہے کہ آپ ہمارے لیے نئے خطوط متعین فرمائیں، جن پر چل کر مشن حقیقی معنوں میں ایک عالم گیر تحریک بن جائے اور اس کے تمام شعبے اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرسکیں۔

ورلڈ اسلامک مشن کی سہ سالہ کارکردگی کے اجمالی تذکرے کے بعد ایک بار پھر اس کانفرنس میں شریک جلیل القدر علما، عظیم المرتبت مفکرینِ اسلام اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے اس قدر زحمت گوارا فرمائی۔ آپ کا حوصلہ افزا تعاون ہمیں منزل سے قریب تر کردے گا۔ ان شاء اللہ

☆☆☆

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

شہرِ یارِ اِرم تاج دارِ حرم
نوبہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام

شب اسریٰ کے دولھا پہ دائم درود
نوشہِ بزمِ جنت پہ لاکھوں سلام

ہم غریبوں کے آقا پہ بے حد درود
ہم فقیروں کی ثروت پہ لاکھوں سلام

دور و نزدیک کے سننے والے وہ کان
کانِ لعل کرامت پہ لاکھوں سلام

جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اُس جبینِ سَعادت پہ لاکھوں سلام

جن کے سجدے کو محرابِ کعبہ جھکی
ان بھوؤں کی لطافت پہ لاکھوں سلام

جس طرف اُٹھ گئی دَم میں دَم آ گیا
اُس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

پتلی پتلی گلِ قدس کی پتیاں
اُن لبوں کی نزاکت پہ لاکھوں سلام

جس کی تسکیں سے روتے ہوئے ہنس پڑیں
اُس تبسم کی عادت پہ لاکھوں سلام

ہاتھ جس سمت اُٹھا غنی کر دیا
موجِ بحرِ سماحت پہ لاکھوں سلام

نور کے چشمے لہرائیں دریا بہیں
اُنگلیوں کی کرامت پہ لاکھوں سلام

کُل جہاں ملک اور جو کی روٹی غذا
اُس شکم کی قناعت پہ لاکھوں سلام

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
اُس دل افروز ساعت پہ لاکھوں سلام

وہ دسوں جن کو جنت کا مُژدہ ملا
اُس مبارک جماعت پہ لاکھوں سلام

غوثِ اعظم امامُ التقیٰ والنقیٰ
جلوۂ شانِ قدرت پہ لاکھوں سلام

نورِ جاں عِطر مجموعہ آلِ رسول
میرے آقاے نعمت پہ لاکھوں سلام

ایک میرا ہی رحمت میں دعویٰ نہیں
شاہ کی ساری اُمّت پہ لاکھوں سلام

کاش محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور
بھیجیں سب اُن کی شوکت پہ لاکھوں سلام

مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضاؔ
مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

ڈال دی قلب میں عظمتِ مصطفیٰ
سیّدی اعلیٰ حضرت پہ لاکھوں سلام